تنویر ادب

یعنی

تاریخ زبان و ادب اُردو

از

صغیر احمد جان، ایم۔ اے

کتاب ملنے کا پتہ

رام نرائن لعل، بینی مادھو

۲۔ کٹرہ روڈ۔ الہ آباد

۱۹۶۷ء

قیمت

دو روپے پچھتر پیسے

بار اوّل سنہ ۱۹۴۰ء
بار دوم سنہ ۱۹۴۷ء
بار سوم سنہ ۱۹۵۵ء
بار چہارم سنہ ۱۹۵۹ء
بار پنجم سنہ ۱۹۶۷ء

مطبوعہ: نیشنل پریس الہ آباد

(نیشنل آرٹ پرنٹرس سرائے گڈھا الہ آباد میں چھپا)

عرض حال

منظور ہے گذارشِ احوالِ واقعی

تاریخ زبان و ادب اردو کی ضرورت جس قدر مجھے زمانۂ طالب علمی میں محسوس ہوتی تھی، اس سے زیادہ زمانۂ معلمی میں محسوس ہوئی۔ بحیثیت ایسی تاریخ کی جستجو رہی جو مختصر بھی ہو اور مکمل بھی۔ جس میں بقدر ضرورت تاریخی معلومات بھی پہنچائی گئی ہوں اور تنقید بھی مذاق و معیار حال کے مطابق ہو۔

اس وقت اردو میں متعدد تاریخیں موجود ہیں اور بعض ان میں سے اپنی گوناگوں ادبی دلچسپیوں کے باعث حیات ابدی حاصل کر چکی ہیں مگر طلبہ کے نقطۂ نظر سے اُن میں کسی نہ کسی بات کی کمی ضرور ہے۔ وہ یا تو ضرورت سے زیادہ ضخیم ہیں یا ان کی معلومات زمانۂ حال کی تحقیق کا ساتھ نہیں دیتیں اور یہ نقص تو عام ہے کہ تنقید زیادہ تر لفظی ہوتی ہے۔ مختلف شعرا اور مختلف ادوار کی شاعری کا اساسی فرق اچھی طرح ذہن نشین نہیں ہوتا اور اردو زبان اور اس کی شاعری و نثر نگاری کی تدریجی ترقی کے متعلق عام رائے قائم کرنے میں مدد نہیں ملتی۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ ادب کے مطالعہ کا حق ادا نہیں ہوتا۔

مدت سے تمنا تھی کہ کوئی صاحب ایک مختصر لیکن با اصول مکمل لیکن رطب و یابس سے پاک اور مذاق حال کے مطابق تاریخ زبان و ادب اردو تالیف کر کے طلبہ کی سہولت اور دلچسپی کا سامان مہیا کریں۔ آخر سوچا کہ یہ کام خود میں کیوں نہ کروں۔ خیال آیا اور خیال کے ساتھ ہی ہمت شروع ہونے کی دیر تھی کہ چند ماہ کی

کاوش ہے جو ہو سکا ہدیۂ ناظرین ہے۔

شرم آید از بضاعت بے قیمتم و لیک   در شہر آبگینہ فروش است جوہری

تو یر ادب کو ضروتاً حصہ نظم و حصہ نثر میں تقسیم کیا ہے اور دونوں حصوں میں علٰحدہ علٰحدہ دور قائم کئے ہیں۔ اگرچہ ادوار کا خیال مستعار ہے لیکن ادوار میں ایک حد تک جدت کے ساتھ سہولت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔

چنانچہ اس تعین میں زمان و مکان سے زیادہ زبان کی نوعیت، طرز شاعری، اور خیالات کے عام رجحان کو مدِ نظر رکھا ہے۔ اور حصہ نثر میں موضوع اور اسالیب بیان کو ہر دور کے اختتام پر مجموعی نقد و تبصرہ درج کیا ہے تاکہ کتاب کے مطالعہ کے ساتھ ساتھ ادبی ترقی کا خاکہ بھی ذہن نشین ہوتا جائے۔

ہر شاعر اور انشا پرداز پر انفرادی حیثیت سے بھی تنقید کی ہے اور یہ کوشش کی ہے کہ مصنفین کی خصوصیات کو اس طرح نمایاں کیا جائے کہ ان میں سے ہر ایک کے لئے بزم ادب میں الگ الگ نمایاں اور ممتاز جگہ متعین ہو سکے۔

ادوار پر مجموعی اور شعراء پر انفرادی تنقید کی ذمہ داری مجھ ناچیز ہی پر عائد ہوتی ہے۔ البتہ مصنفین کے حالات زندگی کے لئے اردو فارسی تذکرے۔ ادبی تاریخیں اور ادبی مضامین پیش نظر رہے ہیں۔ ان کتب کے مصنفوں اور مولفوں میں بعض بفضلہٖ تعالیٰ حیات ہیں۔ ناچیز ان کے گرد برد زانوئے ادب تلمذ تہ کرتا ہے۔ بعض اس دنیا میں اب نہیں ہیں۔ چنانچہ ان کے مزاروں پر تشکر و امتنان کے پھول چڑھاتا ہے۔

خاکسار۔ صغیر احمد جان

فہرست مضامین

باب اوّل

اُردو کی ابتدا اور اُس کی ترقی

اردو کے اجزائے ترکیبی زبان اردو کی کسی عبارت کو محض سرسری طور پر مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں متعدد زبانوں کے الفاظ کی آمیزش ہے۔ اس میں اسماء زیادہ تر فارسی، عربی یا سنسکرت کے ملیں گے۔ روابط زیادہ تر پراکرت کے اور افعال زیادہ تر ہندی اور کچھ فارسی یا فارسی اور ہندی سے مرکب۔ ان زبانوں کے علاوہ ترکی پرتگالی۔ انگریزی وغیرہ زبانوں کے الفاظ بھی کافی تعداد میں ملتے ہیں۔ اس آمیزش اور الفاظ کی رنگا رنگی سے پتہ چلتا ہے کہ زبان اردو ایک مخلوط زبان ہے۔

مخلوط زبان کی پیدائش ایسی مخلوط زبان کیونکر ظہور میں آتی ہے؟ ظاہر ہے کہ جب ایک قوم دوسری قوم کے یہاں مہمان آتی ہے تو رسمی آؤ بھگت میں بڑا تکلف ہوتا ہے۔ نہ میزبان مہمان کی زبان سمجھتا ہے نہ مہمان میزبان کی۔ صاحب سلامت تو خیر اشاروں اشاروں میں ادا ہو جاتی ہے۔ لیکن ادھر ادھر کی باتوں کے لئے یہ تدبیر کی جاتی ہے۔ مہمان میزبان کی زبان کے کچھ الفاظ مستعار لے کر اپنی زبان میں ملاتا

ملاتا ہے اور کچھ ہاتھوں کے اشاروں سے کچھ آنکھوں کی حرکت سے اور
کچھ ابرو کی لچک سے اپنا مطلب ظاہر کردیتا ہے۔ اسی طرح میزبان
بھی اپنی اور نو وارد کی زبان کو خلط ملط کرکے جواب دیتا ہے۔
یہ دقتیں کچھ مدت تک حائل رہتی ہیں مگر جلد ہی مہمان اور میزبان
کو ایک دوسرے کی زبان سے تھوڑی بہت واقفیت ہو جاتی ہے
اور دونوں اپنے اپنے اظہار مطالب کے لئے ایک دوسرے کی زبانوں
کو ملا جلا کر بہ آسانی بولنے لگتے ہیں۔ اب اگر یہ مہمان مہمان کی حد سے
گذر کر میزبان کے پڑوس ہی میں سکونت اختیار کرلے تو اظہار مطالب
کا یہ سلسلہ طول کھینچ لیتا ہے۔ مہمانی اور میزبانی کی میٹھی میٹھی باتوں اور
مزے مزے کی حکایتوں سے گذر کر کاروباری باتیں صنعتی باتیں ہونے لگتی ہیں۔
یہاں تک کہ وہی کم مایہ اور کم حیثیت مخلوط زبان ایک مستقل زبان کی
حیثیت اختیار کرلیتی ہے۔ یا اگر اسی مخلوط زبان کی خوش قسمتی سے کہیں
کسی خوش مذاق شاعر نے اشعار موزوں کردئے اور کسی نے نثر میں بھی
کچھ تصنیف کر ڈالا تو لیجئے ایک زبان تیار ہوگئی۔ جو چاہے نام رکھ لیجئے۔
یہ ہے وہ طریقہ جس سے ایک مخلوط زبان عالم وجود میں آتی ہے، نشو و نما
پاتی ہے اور جوان ہوکر پرانی اور بوڑھی زبانوں کو اپنی شوخی اور رعنائی
سے انگلیوں پر نچاتی ہے۔

زبان اُردو

زبان اُردو کو بھی موجودہ حالات تک پہنچنے میں بعینہ
ان ہی حالات و مراحل سے گذرنا پڑتا ہے۔ قدیم اسلامی

فتوحات کے زمانے میں فارسی اور ہندی زبانوں کے باہم تصادم اور میل جول سے ایک نئی زبان ظہور میں آئی جو رفتہ رفتہ ترقی کرتی رہی اور آج اردو ہو گئی۔

یہ تو ظاہر ہے کہ اردو کی ابتدا مسلمانوں اور ہندوؤں کے باہم میل جول اور کاروباری تعلق سے ہوئی لیکن قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مسلمان ہندوستان میں کب آئے اور کہاں کہاں اقامت گزیں ہوئے۔ اور کس علاقے میں اردو کی پیدائش ہوئی اور کس کس زبان کی گود میں پرورش پائی اور کس فضا میں عالم شباب کو پہنچی۔

ساتویں صدی عیسوی میں کچھ عرب تجارت کی غرض سے ساحل مالابار پر وارد ہوئے اور رفتہ رفتہ تمام دکن میں پھیل گئے۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ ان ہی عرب تجار اور دکھنیوں کے باہم اجتماع اور اختلاط سے ایک نئی زبان کی بنیاد پڑی جس نے ترقی کرتے کرتے موجودہ اردو کی شکل اختیار کر لی۔ لیکن یہ قیاس صحیح نہیں کیونکہ اردو کا تعلق دکھن کی ڈریوڈین بولیوں سے نہیں ہے اور نہ اسے کچھ عربی ہی سے مناسبت ہے بلکہ اس کے اجزائے ترکیبی خاص ایرین ہیں۔ یعنی سنسکرت اور فارسی۔

جنوبی ہند کے علاوہ عرب سندھ میں بھی وارد ہوئے۔ یہاں یہ لوگ محض تجارت کی غرض سے نہیں بلکہ فتوحات بڑھانے کی غرض سے آئے اور ۷۱۲ء میں سندھ پر مسلّط ہو گئے اور تقریباً چار سو برس تک اس علاقے پر قابض رہے۔

گمان ہوتا ہے کہ اس طویل مدت میں عربوں اور سندھیوں کے باہم میل جول سے کسی زبان کی ابتدا ہوئی ہو جو دراصل زبان اُردو کی ابتدائی شکل ہو لیکن یہ قیاس بھی مندرجہ بالا لسانی تحقیقات کی رو سے رد ہو جاتا ہے۔ عربوں اور سندھیوں کے میل جول سے ایک نئی زبان ظہور میں تو آئی لیکن وہ اُردو نہیں تھی بلکہ موجودہ سندھی زبان کی ابتدائی شکل تھی۔

فتوحات سندھ کے بعد دسویں صدی میں محمود غزنوی نے ہندوستان پہ سترہ حملے کئے اور گوالیار اور دریائے گنگ تک کے علاقے فتح کر ڈالے۔ لاہور کو دارالحکومت قرار دے کر وہاں ایک سپہ سالار مع افواج کے چھوڑا۔ اور خود غزنی واپس چلا گیا۔ اس کی وفات کے بعد اس کے جانشینوں نے پنجاب کی حکومت کو استحکام دیا اور ۱۱۹۳ء تک پنجاب میں خود مختار اسلامی سلطنت قائم رہی اور لاہور اس کا دارالخلافہ رہا۔ یہاں تک کہ ۱۱۹۳ء میں محمد غوری نے ہندوستان فتح کر کے دہلی کو اپنا دارالحکومت قرار دیا اور پنجاب کو بھی دہلی ہی کی حکومت میں شامل کر لیا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ اردو کی ابتدا ۱۱۹۳ء سے ہوئی۔ لیکن یہ خیال بھی صحیح نہیں۔ کیونکہ محمد غوری سے قبل مدت سے پنجاب میں مسلمانوں کی حکومت تھی۔ اس طویل مدت میں فارسی اور مقامی زبان کے باہم ارتباط و اختلاط سے کسی دوسری زبان کی ابتدا نہ ہونا قرین قیاس نہیں۔ امر واقعہ یہ ہے کہ زبان اُردو کی داغ بیل فتح دہلی سے بہت قبل پڑ چکی تھی مگر زبان کی حیثیت البتہ فتح دہلی کے بعد ہی اختیار کی۔

۱۰۰۰ء کے لگ بھگ موجودہ شمالی سرحدی صوبہ اور الہ آباد کے درمیانی علاقوں میں جو پراکرت بولی جاتی تھی اُسے سوراسینی پراکرت کہتے تھے۔ اور یہی

بہ اکرت زبان اُردو کی ماں ہے۔

اُردو، پنجابی اور برج بھاشا ماں جائی بہنیں ہیں

اُردو - پنجابی
ت نکلی ہے

نہ کھڑی بولی یا برج بھاشا سے بلکہ اس زبان سے نکلی ہے جو ان دونوں زبانوں کی ماں ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اُردو پنجابی سے ملتی جلتی ہے اور کھڑی بولی سے بھی۔

اُردو دکن پہنچتی ہے

زبان اُردو نے شمالی ہند میں جنم لے کر تقریباً تین سو برس تک ترقی کے منازل طے کئے اور آخر اس قابل ہو گئی کہ کاروباری معاملات میں عام طور پر استعمال ہونے لگی۔ عوام اس مخلوط زبان کو پراکرت اور فارسی پر ترجیح دینے لگے۔ اور روزانہ زندگی میں اسی کو اختیار کیا۔

۱۳۲۷ء میں محمد تغلق نے احکام جاری کئے کہ دہلی اور گردونواح کے باشندے فوراً نقل سکونت کر کے دولت آباد (دکن) کو آباد کریں۔ چنانچہ ان احکام پر مستعدی کے ساتھ عمل کیا گیا۔ اور تمام باشندے مرد۔ عورتیں۔ بچے۔ جوان۔ بوڑھے سب اپنے آبائی وطن کو چھوڑ کر دولت آباد چلے گئے۔ چند سال بعد بادشاہ نے پھر حکم جاری کیا کہ جو لوگ دہلی واپس جانا چاہیں وہ جا سکتے ہیں۔ اس حکم کے بعد چند صاحب استطاعت لوگ تو دہلی چلے آئے لیکن بڑی تعداد دولت آباد ہی میں مقیم رہی۔ اس طرح ان کی زبان اُردو نے بھی دکن میں جڑ پکڑ لی۔

اُردو ترقی کی منزلیں کیونکر طے کرتی ہے

جب شمالی ہند کی مقامی زبان فارسی سے ملی تو اُس نے ارادہ

یا بلا ارادہ فارسی الفاظ قبول کرنے شروع کر دئے۔ ہندی شعرا مثلاً سورداس،
کبیر وغیرہ کے کلام میں اس اختلاط کی مثالیں ملتی ہیں۔ اُسے زبان اُردو کی
ترقی کی پہلی منزل سمجھئے۔

مسلمان بہت سی روزانہ استعمال کی چیزیں اپنے ہمراہ لائے۔ ان کے نام یا تو فارسی
تھے یا عربی۔ چنانچہ وہ نام بجنسہ یا کسی قدر ردّوبدل کے ساتھ ہندی میں داخل ہوگئے۔
مسلمان صرف عربی یا فارسی رسم الخط سے واقف تھے۔ چنانچہ انھوں نے
خط وکتابت وغیرہ مقاصد کے لئے اس رسم الخط کو دیوناگری رسم الخط پر ترجیح دی۔
یہ ترقی زبان کی دوسری اہم منزل تھی۔ فارسی رسم الخط نے زبان اُردو کو
رائج الوقت زبان سے قطعی ممیز کر دیا۔

صوفیائے کرام نے اشاعت اسلام کے لئے زبان اُردو ہی کو اختیار کیا
کیونکہ یہی عوام کی زبان تھی۔ اور اسی زبان میں نظم و نثر کی کتابیں تصنیف کیں جن کا
شمار اُردو کی قدیم ترین تصانیف میں ہوتا ہے۔ اسے ترقی کی تیسری منزل کہئے۔

جوں جوں زمانہ گزرتا گیا زبان اُردو میں گوناگوں خصوصیات ترقی
کرتی گئیں۔ شعروشاعری کی عمارت فارسی بنیادوں پر قائم ہوئی۔ جملہ
اصناف سخن، قصیدہ، غزل، رباعی وغیرہ حتیٰ کہ اسلوب بیان فارسی سے لیا
گیا۔ صرف و نحو بھی فارسی صرف و نحو کے نمونوں پر مرتب کی گئی اور رفتہ رفتہ
اُردو اس منزل پر پہنچی جس پر اب موجود ہے۔

ابتدائی اُردو کے نمونے

مولوی عبدالحق صاحب نے ایک کتاب
مرتب کی ہے جس کا نام ہے اُردو کی ابتدائی

نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام" اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرات صوفیہ کبھی کبھی اردو پر بھی نظر التفات کیا کرتے تھے۔ اور اپنے ملفوظات میں ایک آدھ جملے کی شکل میں اسے دے دیا کرتے تھے۔ چنانچہ سب سے پہلا جملہ جو ہماری نظر سے گذرتا ہے وہ خواجہ فرید شکر گنج کا ہے۔ آپ ۵۸۴ھ (۱۱۷۳ء) میں پیدا ہوئے اور ۶۶۰ھ (۱۲۷۱ء) میں آپ کا وصال ہوا۔ آپ کا جملہ یہ ہے۔

"پونوں کا چاند بالا ہوتا ہے"

اس قسم کے بہت سے جملے ملفوظات میں ملتے ہیں۔ لیکن اس زمانے میں حضرت امیر خسروؒ (متوفی ۱۳۲۵ء) نے فارسی اور ہندی کی لطیف آمیزش سے جو اشعار وغیرہ لکھے ہیں وہ اردو شاعری کے قدیم ترین نمونے سمجھے جا سکتے ہیں۔ مثلاً

رفتم بہ تماشا بہ کنارِ جوئے — دیدم بہ لبِ آب زن ہندوئے
گفتم صنما بیست بہائے مویت — فریاد برآورد کہ دُر دُر موئے
زرگر پسرے چوں ماہ پارا — کچھ گھڑیئے سنواریئے پکارا
نقد دل من گرفت و بشکست — پھر کچھ گھڑا نہ کچھ سنوارا

ان ہی کے ساتھ ساتھ پہیلیاں۔ مکرنیاں۔ دوہے۔ انمل اور طرح طرح کے گیت لکھے۔ "خالق باری" جو ایک منظوم لغت ہے امیر خسرو ہی کی طرف منسوب کی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ آپ نے غزلیں بھی لکھیں۔ چنانچہ ملاحظہ ہو۔

زحالِ مسکیں مکن تغافل ورائے نیناں بنائے بتیاں
کہ تاب ہجراں ندارم اے جاں نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں
شبانِ ہجراں دراز چوں زلف و روزِ وصلت چو عمر کوتاہ
سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں

تنویر ص۱۲

یکا یک از دل دو چشم جادو بصد فریبم ببرد تسکیں
کسے پڑی ہے جو جا سناوے پیارے پی کو ہماری بتیاں
چو شمع سوزاں چو ذرہ حیراں ز مہر آں مہ بگشتم آخر
نہ نیند نیناں نہ انگ چیناں نہ آپ آویں نہ بھیجیں پتیاں
بحق روزِ وصال دلبر کہ داد ما را فریب خسرو
سپیت منکے درائے راکھوں جو جائے پاؤں پیا کے کھتیاں

یہ تھا پہلا قدم جو اردو ادب نے عالم وجود میں رکھا۔ امیر خسرو نے جو کچھ بھی لکھا وہ محض ایک خوش طبعی تھی اور زورِ طبع کی ایجاد۔ انھیں کیا خبر تھی کہ یہی رنگ کسی قدر ترمیم کے بعد آگے چل کر ایک مستقل ادب کی حیثیت اختیار کرے گا۔ اس تفریحی منزل میں چند باتیں ایسی ملتی ہیں جو آگے چل کر ہمارے ادب کی خصوصیات قرار پائیں۔ (ا) مضامین عاشقانہ یعنی غزل کی بنیاد پڑ گئی۔ ب۔ فارسی عروض اختیار کیا گیا۔ ج۔ قافیہ اور ردیف کی پابندی کی گئی۔

زبان اردو اس زمانے میں محض ضرورتاً بول جاتی تھی۔ خط و کتابت فارسی میں ہوتی تھی یا مقامی ہندی زبان میں اور اگر کاروباری چٹھیاں اس زبان میں لکھی بھی جاتی ہوں گی تو انھیں جمع کون کرتا ہوگا کہ ہم تک بطور نمونہ پہنچتیں۔

شمالی ہند میں امیر خسرو کے انتقال کے بعد سناٹا ہو گیا۔ تقریباً چار سو برس تک کسی نے اس مخلوط زبان کی طرف توجہ نہیں کی۔ اور اگر کسی نے کچھ لکھا پڑھا بھی ہوگا تو وہ دستبرد زمانہ کے ہاتھوں فنا ہو گیا ہوگا۔ ہاں

عہد جہانگیری میں ایک بزرگ تھے۔ غواصی نامی۔ انھوں نے طوطی نامہ نخشبی کا ترجمہ نظم میں اس التزام کے ساتھ کیا تھا کہ ہر شعر میں ایک مصرع فارسی کا ہے اور دوسرا اردو کا۔ دکن میں البتہ اردو نے بڑی ترقی کی۔

زبان اردو کا نام

قبل اس کے کہ باب اوّل ختم کیا جائے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ زبان اردو کے نام کے متعلق بھی تذکرہ کر دیا جائے۔ واضح ہو کہ فارسی اور ہندی کے اختلاط اور ارتباط سے جو زبان عالم وجود میں آئی اور جو آئندہ چل کر اردو کہلائی اپنے ابتدائی عہد میں "ہندی" ہی کہلاتی تھی۔ بعض قدیم تذکرہ نویسوں نے اس زبان کو اسی نام سے موسوم کیا ہے۔ جہاں تک کتابوں سے پتہ چلتا ہے شاہ جہاں کے عہد تک زبان ہندی ہی کے نام سے موسوم رہی۔

شاہ جہاں نے دہلی کا لال قلعہ جامع مسجد اور شہر پناہ وغیرہ عمارتیں تعمیر کرائیں اور دہلی کا نام شاہ جہاں آباد رکھا اور وہاں کے بازار کو اردوئے معلی کا خطاب دیا۔ اردو کے لغوی معنی ہیں۔ امرا و سلاطین کی فرودگاہ یا کیمپ۔ چونکہ وہ مخلوط زبان جو ہندی کہلاتی تھی عوام کی زبان تھی، بازاروں میں لین دین کے کام آتی تھی اور شاہی کیمپ میں بولی جاتی تھی۔ اس مناسبت سے یہ زبان بھی اردو کہلانے لگی۔ اور اسی نام سے اب تک مشہور چلی آتی ہے۔

ریختہ

لفظ ریختن فارسی زبان میں متعدد معنوں میں آتا ہے اور معنوں سے قطع نظر (۱) بنانے، ایجاد کرنے (۲) کسی چیز کو قالب میں ڈھالنے، نئی چیز بنانے اور (۳) موزوں کرنے کے معنی میں بھی آتا ہے[1]۔ چنانچہ لفظ "ریختہ"

---

[1] تاریخ ادب اردو صفحہ ۳۰۔

کے معنی ہوئے ایجاد کیا ہوا۔ موزوں کیا ہوا وغیرہ۔ حضرت امیر خسرو نے لفظ ریختہ کو اصطلاحاً استعمال کیا تھا۔ اور اس سے وہ کلام موزوں مراد لیا تھا جس میں فارسی اور ہندی زبانوں کے سُر دو ایک تال اور ایک راگ میں بندھے ہوں۔ رفتہ رفتہ اس کا اطلاق اس تمام کلام موزوں پر ہونے لگا جس میں فارسی اور ہندی الفاظ ملے جلے ہیں۔ چنانچہ یہ لفظ زبان اردو کے لئے عام ہو گیا۔ کہیں زبان اردو خود۔ یہ لفظ غالب کے کلام میں بھی ملتا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

ریختہ کے تم ہی استاد نہیں ہو غالبؔ — کہتے ہیں اگلے زمانہ میں کوئی میرؔ بھی تھا

لیکن غالبؔ کے بعد اس لفظ کا پتہ نہیں چلتا اور اب اس کا استعمال زبانِ اردو یا اس کے کلام موزوں کے معنی میں متروک ہو چکا ہے۔

باب ۲

ابتدائی دور۔ دکن میں

تمہید گذشتہ باب میں بیان ہو چکا ہے کہ زبان اردو اپنی نہایت ابتدائی شکل میں محمد تغلق کی افواج اور دہلی اور گرد و نواح کے باشندوں کے ہمراہ دکن پہنچی اور وہاں رائج ہو گئی۔

محمد تغلق کے بعد ۱۳۴۷ء میں حسن گنگو نے بہمنی خاندان کی بنیاد ڈالی۔ یہ خاندان تقریباً دو سو سال تک دکن میں حکومت کرتا رہا اور ۱۵۲۶ء میں ختم ہوا

بہمنی خاندان کے بعد دکن میں پانچ سلطنتیں قائم ہوئیں۔(۱) عماد شاہی (۲) نظام شاہی (۳) برید شاہی (۴) عادل شاہی (۵) قطب شاہی۔ آخری دو سلطنتیں یعنی عادل شاہی اور قطب شاہی اردو کی ترقی میں خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ اگرچہ عادل شاہوں سے قبل بھی زبان اردو اشاعت اسلام، لین دین اور روز مرہ گفتگو میں استعمال ہوتی تھی لیکن عادل شاہوں نے اس زبان کو بہت ترقی دی۔ ابراہیم عادل شاہ متوفی ۱۵۵۸ء کے زمانہ میں اردو نے شاہی دفاتر پر قبضہ کر لیا ظاہر ہے کہ جو زبان حکومت کی ہو اس کی قدر رعایا کے دل میں کس قدر ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ اسی عہد سے اس زبان میں باقاعدہ تصنیف و تالیف شروع ہوگئی۔

اردو کا اولین شاعر — مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی اپنی تصنیف "دکن میں اردو" میں فرماتے ہیں کہ وجیہ الدین وجدی اردو کے پہلے شاعر ہیں۔ وجدی قلی قطب شاہ کے عہد میں گزرے ہیں ۱۵۸۰ء میں پیدا ہوئے اور ۱۶۱۱ء میں انتقال کیا لیکن مزید تحقیقات جستجو کرتی ہوئی اس سے بھی قدیم عہد میں پہنچتی ہے۔ اور یوسف عادل شاہ کے عہد حکومت میں (۱۴۹۰ء۔ ۱۵۱۰ء) شاہ میرانجی کو قدیم ترین شاعر پاتی ہے۔

۱۔ شاہ میرانجی۔ شمس العشاق

آپ یوسف عادل شاہ کے عہد میں گزرے ہیں بیجاپور کے رہنے والے بڑے صوفی اور اہل حال قال بزرگ تھے۔ آپ نے مقامی علماء سے علوم اولہ حاصل کئے اور فارغ التحصیل ہو کر حج کعبۃ اللہ کے لئے تشریف لے گئے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ آپ مدینہ منورہ میں بارہ سال مقیم رہے اور ہر سال فریضہ حج بجالائے۔ حجاز سے واپس آکر آپ نے بیجاپور کے قلعہ کے باہر قیام کیا۔

شاہ میراں جی چشتیہ خاندان میں خواجہ کمال الدین بیابانی سے بیعت تھے۔ آپ نے ۲۵ شوال ۹۰۲ھ (۱۴۹۶ء) میں اس جہان فانی سے کوچ فرمایا اور بیرون قلعہ بیجاپور مقام شاہ پور مدفون ہوئے جہاں ہر سال ۲۵ شوال کو آپ کا عرس ہوتا ہے۔

شاہ میراں جی نے نظم و نثر کی پانچ تصانیف یادگار چھوڑی ہیں۔

(۱) شرح مرغوب القلوب (۲) سب رس۔ یہ دونوں کتابیں نثر میں ہیں۔

(۳) خوش نامہ۔ یہ ایک سو ستر اشعار کی مختصر مثنوی ہے جس میں ایک دوشیزہ کا قصہ بیان ہوا ہے جسے اپنے مرشد سے کمال عقیدت تھی جو سترہ سال کی عمر میں راہی ملک بقا ہوئی۔

(۴) شہادت الحقیقت۔ اس نظم میں ۵۶۳ بند ہیں۔ ہندی بحر میں لکھی گئی ہے اور تصوف سے متعلق ہے۔ اسلوب بیان سادہ اور سلیس ہے۔

(۵) خوش نغز۔ یہ بھی ایک مختصر سی مثنوی ہے۔ ایک لڑکی میراں جی سے تصوف کے متعلق چند سوال کرتی ہے۔ آپ اس کا جواب دیتے ہیں۔ اس مکالمے کو نظم کا جامہ پہنایا گیا ہے۔

۲. شاہ برہان الدین جانم

آپ شاہ میراںجی کے بیٹے اور خلیفہ تھے اور اپنے وقت کے باکمال بزرگ اور شاعر۔ لوگوں کو آپ کے ارشادات سے بے انتہا فیض پہنچا۔ آپ کی آخری تصنیف ارشاد نامہ ہے۔ یہ مثنوی ۹۹۰ھ (۱۵۸۲ء) میں پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ گویا آپ ۹۹۹ھ تک حیات تھے۔

مولانا عبدالحق اور ڈاکٹر محمد حفیظ سید (الٰہ آباد یونیورسٹی) کے پاس شاہ برہان الدین جانم کی تصانیف کا اچھا خاصا ذخیرہ موجود ہے۔ آپ کی تصانیف حسب ذیل ہیں:

(۱) وصیت الہادی ۔ یہ رسالہ ذکر کی تعلیمات پر مشتمل ہے۔ روح پر ایک مختصر سی بحث بھی اس میں شامل ہے۔

(۲) نکتۂ واحد۔ ۱۲ اشعار کی مختصر نظم ہے جس میں مسئلہ توحید کی بحث ہے۔

(۳) نسیم الکلام۔ ۲۵ اشعار کی نظم ہے۔ اس میں قرآن شریف کی متعدد آیتوں کے ترجمے کو نظم کا جامہ پہنایا گیا ہے۔

(۴) رموز الواصلین۔ یہ مثنوی بھی صوفیانہ مضامین پر مشتمل ہے۔

(۵) بشارت الذکر۔ مختصر نظم ہے جس میں ذکر بالجنان اور ذکر باللسان کے طریقے بیان ہوئے ہیں۔

(۶) حجت البقا۔ اس میں توحید اور صفات باری تعالیٰ کی ... ہے۔

(۷) ارشاد نامہ - یہ شاہ صاحب کی طویل ترین مثنوی ہے۔ اس میں کل ۲۵۰۰ اشعار ہیں۔ اس کا موضوع بھی تصوف ہی ہے۔

(۸) منفعت الایمان - اس میں ملاحدہ اور کفار کے اعتقادات سے بحث ہے۔ اور آخر میں توحید کا بیان ہے۔

(۹) سکھ سہیلا - یہ بھی صوفیانہ نظم ہے۔ اس میں ہندو فقرا، سادھوؤں اور یوگیوں کے طریقے، نفس کشی پر تنقید کی ہے اور آخر میں یہ بتایا ہے کہ صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنی چاہیئے۔ بغیر اس کے روحانیت حاصل نہیں ہو سکتی۔

ان تصانیف کے علاوہ بہانم کے متفرق دوہرے اور خیال بھی تصنیف کئے ہیں۔ آپ کی تصانیف مقامی اور مذہبی تعصبات سے مبرا ہیں۔ زبان اور طرز بیان نہایت صاف اور سادہ ہے۔ ہندی الفاظ اور ہندی طرز ادا زبان پر مسلط ہیں۔ بحریں بھی زیادہ تر ہندی ہی ہیں۔ عربی اور فارسی الفاظ کو اس طرح نظم کیا ہے جس طرح وہ عوام کی زبان پر چڑھے ہوئے تھے مثلاً فہم کو فہام، علٰحدہ کو الادی۔ سر کو سیر وغیرہ۔

۳ - وجیہ الدین وجدی

مشہور بزرگ تھے۔ انھوں نے ایک مثنوی "تحفۂ عاشقاں" ۱۰۱۵ھ (۱۶۰۶ء) میں تصنیف کی جو حضرت شیخ فرید الدین عطار کے خسرو نامے کا ترجمہ ہے۔ ایک اور مثنوی پنچھی نامہ جو منطق الطیر کا ترجمہ ہے۔ وجدی ہی کے

نام سے منسوب ہے۔

تحفۂ عاشقاں ایک ضخیم مثنوی ہے۔ نمونہ حسب ذیل ہے:-

کروں پاک دل رہو زباں پاک سوں
ثنا پاک اس عاشقِ پاک کو

کہ جس سے ہوا ہے وہ گم عشق کا
اجوں لگ اُبلتا ہے خم عشق

پڑیا عکس اس نور کا جس ٹرخن
جھلکنے لگا آرسی سے کرن

سو اسن آرسی میں کیا جیوں نظر
ہوا عاشق آپنا آپس دیکھ کر

اُپس کچھ پر تو کون معشوق جاں
لیا مبتلا ہو کے عاشق کی تن

نکل کنج مخفی سے خلوت کے بہار
کیا جلوہ کر کثرتِ بے شمار

سلطان محمد قلی قطب شاہ (۱۵۸۰ء - ۱۶۱۱ء)

سلطان محمد قلی قطب شاہ علم و فن کے قدرداں اور صاحب علم و فضل بادشاہ ہی نہیں تھا۔ بلکہ ملک سخن کی عنان حکومت بھی اپنے ہاتھ میں رکھتا تھا۔ ایک ضخیم کلیات یادگار رہے جس میں مثنویاں قصیدے۔ ترجیع بند مراثی اور رباعیات شامل ہیں۔ قطب شاہ پہلے شاعر ہیں جن کا کلام بہ ترتیب حروف تہجی جمع ہوا ہے۔ یہ کلیات ۱۰۲۵ھ (۱۶۱۶ء) میں قطب شاہ کے بھتیجے اور جانشین محمد قطب شاہ نے مرتب کیا تھا۔

ان کے کلام میں سادگی، اصلیت اور جدت پائی جاتی ہے۔ مقامی رسموں اور دیسی روایتوں کو نہایت لطف سے نظم کیا ہے۔ اگرچہ استعارات و تشبیہات کی ندرت اور تخیل کی بلند پروازی ان کے کلام میں نہیں، تاہم عامی خیالات کی سادگی وہ مزا دیتی ہے کہ ہزار تکلفات نثار۔ ہندی الفاظ

کہ نہایت خوبی سے استعمال کیا ہے۔ تمام کلام ہندی رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔ وہی ہندی ترکیبیں، وہی ہندی استعارے اور تشبیہیں۔ ہندو فارسی الفاظ ہندو سورماؤں اور جانبازوں کی روایات کے حوالے۔ یہاں تک کہ اظہار عشق بھی جنس لطیف ہی کی طرف ہوتا ہے۔ اور یہ خاص ہندی شاعری کا رنگ ہے۔ اور عجیب مزہ دیتا ہے۔ کلام کا نمونہ یہ ہے:-

دُکھ ایک ہے بڑہیک کدھن لاکھ چمن ہے — لکھ جوت ہے ہر ٹھار ولے ٹیک رتن ہے

کس ٹھار میں دستا نہیں سب ٹھار سے بھر پور — دیکھن کو سکت کون اُسے ہر ٹیک نین ہے

سمد ور ہے اک پور ندیاں ہیں سو ہزاراں — پاتاں ہو کر وڑاں ہیں ولے ٹیک رسن ہے

کنج عشق گری آگ کا ایک چنگی ہے سورج — اس آگ کے شعلے کا دھواں سات گگن ہے

پیا باج پیالہ پیا جائے نا — پیا باج یک تل جیا جائے نا

نہیں عشق جس وہ بڑا کور ہے — کدھیں اس سے مل بیسا جائے نا

قطب [illegible] منج دوانے کو [illegible]

دوانے کو کچ پند دیا جائے نا

سلطان محمد قطب شاہ

(۱۶۱۱ء - ۱۶۲۵ء) فارسی اور اُردو میں آپ کے دو دیوان موجود ہیں۔ فارسی میں ظل اللہ اور اُردو میں قطب شاہ تخلص کرتے تھے۔ کلام میں شیرینی۔ صفائی اور لطافت پائی جاتی ہے۔ نمونہ کلام یہ ہے۔

رہن باسکی نہ پیا باج دیکھی — ہوئے ترنگ کوں سکھ جب ملے پیو ماں

مرا دل ہے ترا الفت کا کار خانہ — نہیں [illegible] ادا کا حاجت

سو لگ میری پریم کی کہانی   کہ پیلا سے رنگ عاشقی کی نشانی

سلطان عبداللہ قطب شاہ (۱۶۲۵ء - ۱۶۷۲ء) آپ کا تخلص عبداللہ تھا۔ نمونۂ کلام یہ ہے :-

در حق کی طرف ہو کر حق آرام دے گا   سعادت کا تری بات سرانجام دیگا

روپ ہیرے لال کا آتا نہ تحریر میں   چاند عطارد اگر ہوئیں قلم ہور دوات

قطب شاہی عہد کے دیگر شعراء

دربار گولکنڈہ دبستان ہے۔ اس عہد میں شعراء کا ملجا و ماوی تھا۔ ہر طرف شعر و شاعری کا چرچا تھا اور ہر سر میں ذوق نغمہ سرائی کا سودا۔ تذکروں سے متعدد شعراء کے ناموں کا تو علم ہوتا ہے لیکن افسوس کہ ان کی زندگی کے حالات دستیاب نہیں ہوتے۔

ابن نشاطی سلطان عبداللہ قطب شاہ کے عہد کے نامور شاعر ہیں۔ انہوں نے ۱۰۶۷ھ مطابق ۱۶۵۵ء میں مثنوی پھول بن تصنیف کی۔ یہ مثنوی کئی لحاظ سے قابل قدر ادبی کوشش ہے۔ سلاست اور روانی اس کی خصوصیات ہیں۔ صنائع لفظی و بدائع معنوی کا استعمال نہایت سلیقہ سے ہوا ہے۔ اس کے علاوہ معاشرتی اخلاقی اور تاریخی حیثیت سے بھی یہ مثنوی بہت اہم ہے۔ اس کے مطالعہ سے اس زمانے کے رسم و رواج کے متعلق کافی واقفیت حاصل ہوتی ہے۔ نمونۂ کلام یہ ہے :-

اول میں رحم رب العالمیں کا   دل و جاں ہور کہوں جاں آفریں کا

خداوندا تجھے سے جسم خدائی ہمیشہ تجکو ساجی کبریائی

ازل سوں نیں صبح تیرا ہدایت ایہ کوں فہم نیں تیرا نہایت

غواصی قطب شاہی عہد کے نامور شاعر ہیں۔ دو مثنویاں ان کی یادگار ہیں۔

(۱) قصۂ سیف الملوک و بدیع الجمال۔ تاریخ تصنیف ۱۰۲۷ھ (۱۶۱۷ء)

برس ایک ہزار ہور سادیس میں کیا ختم یہ نظم دن تیس ۳۰ میں

(۲) طوطی نامہ۔ یہ مثنوی ۱۰۴۹ھ (۱۶۳۹ء) میں تصنیف ہوئی۔

نمونۂ کلام یہ ہے:-

الٰہی جگت کا الٰہی سو توں کرنہار رحم بادشاہی سو توں

ترے حکم تل نو کر آسماں کے رعیت ملک تیرے فرمان کے

پھریا نس گھراں بیچ تارے حشم کرے نوبتاں سوں الگ دمبدم

مُلا قطبی آپ نے ۱۰۴۶ھ (۱۶۳۶ء) میں تحفۃ النصائح کا ترجمہ زبان فارسی سے اردو میں کیا۔ ملاحظہ ہو:-

بولوں صفت میں بے گنت اُس خالقِ جن و بشر

نردھار کر آسماں رکھیا سورج ستارے ہور چند

جوں بزرگی دی عرش کوں پنکھے اُڑے یکہ پانیسی

جوں بیچ برساں چار سو انپڑے براں پائے دگر

مرزا آپ ابوالقاسم تاناشاہ کے مصاحب تھے نمونہ کلام یہ ہے:-

عارض نہیں چندر کا ترے گال سوں اچھا سمجھی ہمن خلق کو نہ تجھ خال سوں اچھا

مرزا دو نونہال کدھر مٹ گئے چمن ۔ لگتا تھا جن کے ہاتھ پہ گل ڈال سوں اچھا

بحری قاضی محمود بحری صاحب حال و قال صوفی اور مشہور شاعر تھے۔ آپ کے والد کا نام بحرالدین تھا۔ اسی رعایت سے آپ نے بحری تخلص اختیار کیا۔
آپ اپنی زندگی میں بہ حیثیت شاعر زیادہ مشہور نہیں تھے۔ آپ زیادہ تر مذہبی اور صوفیانہ مضامین نظم کیا کرتے تھے اور اس قسم کے مضامین عام پسند نہیں تھے۔ تاہم سلسلۂ تصنیف برابر جاری رہا۔ اورنگ زیب کی فتوحات دکن کے دوران میں آپ حیدرآباد پہنچے۔ راستہ میں قزاقوں نے آپ کا مال و اسباب لوٹ لیا اور ساتھ ہی آپ کا سرمایہ سخن بھی لٹ گیا۔
آپ کی "مثنوی" من لگن" کے مطالعہ سے آپ کی زندگی کے حالات پر کچھ روشنی پڑتی ہے۔ یہ مثنوی ۱۱۱۲ھ (۱۷۰۰ء) میں تکمیل کو پہنچی۔ لکھا ہے کہ میں نے کسی اُستاد کے سامنے زانو تلمذ تہ نہیں کیا۔ نہ کسی شاعر کی صحبت سے فیضیاب ہوا۔
بحری نے تین تصنیفیں یادگار چھوڑیں

(۱) **مثنوی من لگن** - یہ مثنوی بہت ضخیم ہے۔ تعداد اشعار ۲۷۹۰ سے اوپر ہے۔ تصوف اس مثنوی کا موضوع کلام ہے۔

(۲) **دیوان** - اس میں کُل ایک سو گیارہ غزلیات بہ ترتیب حروف تہجی درج ہیں۔

(۳) **مثنوی بنگاب نامہ** - اس مثنوی میں بارہ "جام" یعنی بند ہیں اور ہر بند میں متعدد اشعار۔ نمونہ کلام یہ ہے :-

اے روپ نرا رتی رتی ہے ۔ پربت پربت رتی رتی ہے

اوٹھ اے قلم اس گھڑی نہ گھر جائیں ... ٹک نعت نگر کی سیر کر آئیں
بے ناؤ احد نشان احمدؐ ... سرخی سو احد ہے پان احمدؐ
مولا کے محب نبیؐ کے نائب ... مانس نہیں مظہر العجائب
ساگر ہیں سپور معرفت کے ... بل عین ہیں نور معرفت کے

عالمگیر اورنگ زیب کی تعریف میں کہا ہے۔

دیندار و دلیر بہور دانا ... یک علم نہ سب منے سیانا

شیخ شجاع الدین نوری شمالی ہند میں بابر کے عہد حکومت میں مجالس عزا اور مرثیہ گوئی کا دستور نہ تھا۔ لیکن دکن میں ان کا رواج ہو چکا تھا۔ سلاطین عادل شاہی نے مجالس عزا کی ابتدا کی لیکن بند فارسی مرثیہ گو شعرا خصوصاً محتشم کاشی کے بند پڑھے جاتے تھے۔ اردو میں کوئی مرثیہ گو موجود نہیں تھا۔ لیکن جب مجالس عزا کا خوب چرچا ہوا اور اردو زبان میں بھی کچھ صلاحیت پیدا ہوئی تو دکن میں ایک گروہ مرثیہ گو شعراء کا پیدا ہوا اور شیخ شجاع الدین نوری مرثیہ گوئی کے باوا آدم قرار پائے۔

نوری بیجا پور کے رہنے والے تھے۔ صاحب علم و فن اور شعر و سخن کے دلدادہ تھے۔ اکبر کے عہد حکومت میں آگرہ کا سفر کیا اور ایک مدت تک ابوالفضل اور فیضی کی صحبت میں رہے۔

نوری اپنی مرثیہ گوئی کی ابتدا کے متعلق فرماتے ہیں۔

کوئی نظم اس میں تو کرتا نہ تھا ... دلے سب تعصب دیا ہم مٹا

نہ کچھ خوف کھایا نہ جھجکا ذرا ۔۔۔ وہم مرثیہ کا سہل کر دیا

میں جب اس کو لوگوں کے آگے پڑھا ۔۔۔ عجب حال آشور خانہ میں تھا

جن دانش سب کرتے تھے واہ واہ ۔۔۔ کہ دکھنی میں لکھا ہے کیا مرثیہ

زباں دکنی میں کس نے ایسا کہا ۔۔۔ کبھی اس سے پہلے سنا نا پڑھا

اماماں سے اس کا ملے گا صلہ ۔۔۔ کہ ہے نورتن ہی موجد اس طرز کا

ہاشم علی برہان پوری

یہ صنف مرثیہ نگاری کی نورتن کے بعد ہاشم علی برہان پوری کے حصہ میں آئی۔ نمونہ کلام یہ ہے:-

ختم ہے جو امتحان دیو بلا ۔۔۔ ختم ہے جو حق حسین پیغام کا

تھا برا دلا و شفیع نہیں ۔۔۔ ظلم بے حد در جہاں اقسام کا

زخم لاگا مرتضیٰ کے سر پہ ۔۔۔ گر پڑا جوں آفتاب اس بام کا

زہر دے مارے حسینؑ کو کر سبب ۔۔۔ سبز تھا وہ چہرۂ گلفام کا

کربلا میں تھا حسینؑ ابن علیؑ ۔۔۔ آج غم ہے گا انہیں ایام کا

ولی اورنگ آبادی

مولانا محمد حسین آزاد نے "آب حیات" میں ولیؔ کو اردو شاعری کا باوا آدم قرار دیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ آپ اردو زبان و ادب کے دور اوّل کے خاتم الشعراءؑ تھے اور دور دوم کے مقدم الشعراء۔

آپ کے نام کے متعلق اختلافات ہیں۔ کسی نے آپ کا نام شمس الدین بتایا ہے اور کسی نے شمس الحق۔ کوئی ولی الدین نام لکھتا ہے اور کوئی حاجی ولی لیکن تخلص کے بارے میں سب متفق الرائے ہیں اور سب کے

نزدیک آپ کا تخلص ولی ہے۔

ولی ۱۶۶۸ء میں بمقام اورنگ آباد پیدا ہوئے اور بیس سال کی عمر تک وہیں تعلیم و تربیت پائی۔ اور اس کے بعد احمد آباد کا سفر کیا۔ وہیں آپ شاہ نورالدین گجراتی کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے۔

آپ کو سیر و سیاحت کا بڑا شوق تھا۔ چنانچہ آپ نے دو مرتبہ دہلی کا سفر کیا۔ پہلی مرتبہ ۱۷۰۰ء یعنی اورنگ زیب کے عہد میں۔ دوسری مرتبہ ۱۷۲۲ء یعنی محمد شاہ کے زمانے میں پہلی مرتبہ آپ کا قیام دہلی مختصر تھا۔ اُس قیام کے حالات میں قابل ذکر صرف یہ امر ہے کہ آپ نے دہلی کے مشہور بزرگ اور فارسی شاعر شاہ سعید اللہ گلشن سے فیض صحبت حاصل۔ دوسری مرتبہ آپ کا دیوان غزلیات بھی آپ کا رفیق سفر تھا۔ جس نے دہلی میں خاص و عام سے خراج تحسین حاصل کیا۔ غزلیات کا اس قدر چرچا ہوا کہ گلی گلی کوچے کوچے میں جس کی زبان سے سنو ولی کی غزل کانوں میں پڑتی تھی۔ قوال اور ارباب نشاط ولی کی غزلیات سے محفلوں کو گرماتے تھے۔ دہلی کے فارسی گو شعراء نے بھی محسوس کیا کہ زبان اردو میں بھی شعر و شاعری کی صلاحیت موجود ہے۔ چنانچہ انھوں نے بھی کبھی کبھی اس زبان میں سخن سنجی کی ہے۔

کئی سال قیام کرکے ولی نے دہلی کو خیرباد کہا اور احمد آباد ہوتے ہوئے اورنگ آباد پہنچے۔ وہاں آپ نے ۱۷۳۰ء میں دہ مجلس منظوم تصنیف کی۔

ولی کا انتقال ۱۷۴۴ء میں بمقام احمد آباد ہوا۔

ولی کے کلیات میں غزل۔ قصیدہ۔ رباعی۔ قطعہ۔ ترجیع بند۔ مثنوی

مستزاد وغیرہ اصنافِ سخن آپ کی قادر الکلامی اور مشق سخن سخن سنجی کو مسلم کرتی ہیں۔ اگرچہ باتیں سیدھی سادی ہیں تکلف اور آورد کی گرد ان کے آئینۂ سخن پر نہیں۔ تاہم آپ کے عاشقانہ اشعار میں تاثیر کے نشتر بھرے ہیں اور اخلاقی مضامین میں گہرائی پائی جاتی ہے۔ کلام سے تصوف کی چاشنی ٹپکتی ہے اور کیوں نہ ٹپکے کہ خود زبردست صوفی اور بزرگوں سے عقیدت مند تھے۔ رموز حقائق کو تغزل کے رنگ میں اس طرح کہہ جاتے ہیں کہ تاثیر کے نشتر دل میں کھٹکتے ہیں۔

آپ نے قصیدے بھی خوب کہے ہیں۔ زبان اگرچہ ابتدائی منازل طے کر رہی تھی۔ تاہم آپ کے قصیدوں میں زور کلام۔ شوکت الفاظ اور روانی کی کیفیت نظر آتی ہے۔

ولی کی زبان وہی ہے جو دیگر دکنی شعراء کی ہے۔ لیکن منجھتے منجھتے اس قابل ضرور ہو گئی ہے کہ چند مخصوص دکنی الفاظ کو چھوڑ کر میر و سودا کی زبان سے زیادہ قدیم معلوم نہیں ہوئی۔ بعض بعض اشعار تو ایسے بھی ملتے ہیں کہ اگر آج بھی کوئی شاعر طبع آزمائی کرے تو اس سے بہتر زبان لکھنے پر قادر نہ ہو سکے۔ ولی کی زبان کا اصلی جوہر ہمواری اور سلاست ہے جو ہر رنگ میں جلوہ گر ہے۔ کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو:-

تجھ لب کی صفت لعل بدخشاں سے کہوں گا — جادو ہے ترے نین غزالاں سے کہوں گا
بے صبر نہ ہو اے ولی اس درد سے ہر گاہ — جلدی سے ترے درد کے درماں سے کہوں گا

یاد کرنا ہر گھڑی تجھ یار کا — ہے وظیفہ مجھ دلِ بیمار کا

آرزوئے چشمۂ کوثر نہیں | تشنہ لب ہوں شربتِ دیدار کا
اے ولی ہونا سرِ جن پر نثار | مدعا ہے چشم گوہر بار کا
بیوفائی نہ کر خدا سوں ڈر | جگ ہنسائی نہ کر خدا سوں ڈر
آرسی دیکھ کر نہ ہو مغرور | خود نمائی نہ کر خدا سوں ڈر
اے ولی غیرِ آستانۂ یار | جبہہ سائی نہ کر خدا سوں ڈر
جس وقت لے سرِ جن تو بے حجاب ہوگا | ہر ذرہ تجھ جھلک سوں جوں آفتاب ہوگا
تا حشر رہے بوئے گلاب اس کے عرق سے | جس بر منے یکبار وہ گل پیرہن آوے
کھینچیں اپس انکھیاں سنے جوں کحل جواہر | عشاق کے گر ہاتھ وہ خاک چرن آوے

تبصرہ

زبان اس دور کے شعراء کے کلام کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو واضح ہوگا کہ ولی تک پہنچتے پہنچتے زبان میں کافی صفائی اور سلاست آگئی ہے۔ تاہم ولی کے کلام میں کافی تعداد ایسے الفاظ اور روابط کی موجود ہے جو دکنی اردو کے لئے مخصوص ہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ایک مختصر سی فہرست اُن الفاظ کی درج کر دی جائے۔

سوں، سیتی، سیتی (بجائے سے)، "کون" (کو)، ہمن کو (ہم کو) نمن (طرح) موہن، سرِ جن، پی، پیتم، معشوق جگ منے۔ (دنیا میں) برمنے۔ (بر میں یعنی گود میں) مجھ دل (میرا دل)، تجھ لب (تیرا لب)، بچن (کلام) نت۔ (ہمیشہ)

کچھ (منو) بھیتر (اندر) بھواں (بھویں) پلکاں (پلکیں) یو (یہ) (یگانہ۔ دیوانہ) تسبی (تسبیح) صہی (صحیح) یں کہا (میں نے کہا) نیں (نہیں)

ان قدیم الفاظ کے باوجود گذشتہ دیگر شعراء کے کلام میں عموماً اور ولی کے کلام میں خصوصاً ایسے اشعار پائے جاتے ہیں کہ اگر ایک آدھ لفظ کو اُن میں سے بدل دیا جائے تو موجودہ زمانے کی زبان سے ان کی زبان کچھ زیادہ قدیم نہ معلوم ہو۔ بلکہ بعض اشعار تو ایسے صاف ہیں کہ آج کل کی زبان بھی اُن سے زیادہ صاف شعر نہیں لکھ سکتی۔ مثلاً

غزالوں کی طرح سرگرم رم تھا — بیاباں اُس کو گلزارِ ارم تھا
وہاں کی یاد تھی شوریدہ سر پر — وہاں کی کنکری تھی مثلِ اخگر

مثنوی لعل و گوہر (عاجز)

آرزوئے چشمۂ کوثر نہیں — تشنہ لب ہوں شربتِ دیدار کا
مسندِ گل منزلِ شبنم ہوئی — دیکھ رتبہ دیدۂ بیدار کا
اے ولی ہونا سریجن پر نثار — مدعا ہے چشم گوہر بار کا
دلِ عشاق کیوں نہ ہو روشن — جب خیالِ صنم چراغ ہوا
اے ولی گل بدن کو باغ میں دیکھ — دلِ صد برگ باغ باغ ہوا

اصنافِ سخن اس دور کے شعراء نے جملہ اصنافِ سخن، غزل، قصیدہ، مثنوی، رباعی وغیرہ پر طبع آزمائی کی۔ اس دور میں مرثیہ بھی ایجاد ہوا۔ اور نوحہ بھی لکھا گیا۔ یہاں تک کہ وہ ریختی جس کو رنگین کی طبع رنگین کی ایجاد سمجھا جاتا ہے۔ دراصل اسی عہد میں پیدا ہوئی۔ مگر یوں کہیے

کہ لکھنؤ کا سا زمانہ میں تھا۔ اس لئے اس نے فروغ نہیں پایا۔

غزل سلطان محمد قلی قطب شاہ نے غزل کی ابتدا کی اور ولی نے اسے معراج کمال پر پہنچایا۔ غزلوں میں جو انداز بیان اختیار کیا گیا ہے۔ اس کی خصوصیات ہیں۔ صفائی اور سادگی شاعر جو کچھ دیکھتا دکھتا یا محسوس کرتا ہے اُسے اسی طرح لفظوں کا جامہ پہناتا ہے۔ گزرگاہ خیال میں جو مضمون ملتا ہے اُسے اُسی طرح زبان سے ادا کردیتا ہے اپنی طرف سے کچھ نون مرچ نہیں لگاتا۔ یعنی دور دور کی تشبیہوں اور نازک استعاروں سے تکلف اور تصنع پیدا نہیں کرتا۔ البتہ کہیں کہیں فارسی سے تشبیہیں اور استعارات و تلمیحات مستعار لیتا ہے اور انھیں تکلف سے نہیں بلکہ سلیقے سے سجاتا ہے۔

قصیدہ قصیدے کی جو جو خوبیاں ہیں یعنی زور کلام شکوہ، الفاظ، روانی وغیرہ ماسوا نازک خیالی کے اس دور کے قصیدوں میں ملتی ہیں۔

مثنوی اس دور کو اگر مثنوی کا دَور کہا جائے تو مناسب ہے۔ مذہبی۔ فلسفیانہ صوفیانہ۔ عاشقانہ۔ رزمیہ۔ بزمیہ۔ بیانیہ۔ غرض ہر طرح کی مثنوی اس عہد میں لکھی گئی اور حق یہ ہے کہ خوب لکھی گئی۔ اگر اس عہد کی سیاسی، معاشرتی، تمدنی و رسمی زندگی کا مطالعہ کرنا ہو تو اس دَور کی مثنویوں سے بہتر اور کوئی ذریعہ واقفیت نہیں ہو سکتا۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ کی متفرق مثنویوں اور نصرتی کی مثنوی "علی نامہ" سے اس عہد کے متعلق جو

واقفیت حاصل ہوتی ہے وہ کوئی بہتر سے بہتر تاریخ بھی مہیا نہیں کرسکتی۔
اس لحاظ سے نیز ادبی لحاظ سے اس دور کی مثنویاں بہت گراں قدر ہیں۔

مرثیہ سلاطین عادل شاہی نے مجالس عزا کی ابتدا کی لیکن ان میں فارسی کے مرثیے پڑھے جاتے تھے۔ سب سے اول شیخ شجاع الدین نوری نے اردو مرثیہ لکھا۔ ان کے بعد مرثیہ گو شعرا کی کافی تعداد پیدا ہوگئی۔ گویا مرثیہ کی ایجاد کا فخر بھی اسی دور کو حاصل ہے۔ زبان کی صفائی اور روانی کے علاوہ جن جن خصوصیات کے لحاظ سے انیس اور دبیر خاتم مرثیہ سمجھے گئے وہ خصوصیات اپنی جملہ نظر فریبیوں اور دلچسپیوں کے ساتھ اس دور میں جلوہ فرما ہیں لیکن اپنی ابتدائی حالت میں جن خصوصیات نے انیس کو انیس اور دبیر کو دبیر بنایا وہ یہ ہیں۔ جذبات نگاری۔ سیرت نگاری۔ مکالمہ کی ندرت۔ محاکات کی لطافت وغیرہ۔ ان کے علاوہ روایات کا نظم کرنا بھی ایک خاص جدت سمجھی جاتی ہے۔ دکنی شعرا کے کلام کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو یہ سب خصوصیات نظر سے گزرتی ہیں۔ اور لطف یہ ہے کہ سیرت نگاری میں جو مرقعے تیار ہوئے ہیں۔ ان میں دیسی رنگ بھی اسی میں بھرا گیا ہے۔ متاخرین کے متعلق کہا جاتا ہے کہ انھوں نے عربی کردار کو ہندوستانی بنادیا۔ ہندوستانی پوشاک اسے پہنائی۔ ہندوستانی طرز گفتگو، غرض ہر حیثیت سے عربی خاکوں میں ہندی رنگ بھرا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ متقدمین ہی اس روش کو صاف کرگئے تھے۔ متاخرین تو محض مقلد ہوئے۔
غرض یہ کہ یہ ابتدائی دور ہر لحاظ سے ادوار مابعد کا مقدم اور پیش رو

ہے۔ یہی نہیں بلکہ متوسطین اور متاخرین نے اسی دور کی قائم کردہ بنیادوں
پر اپنی فلک بوس عمارتیں کھڑی کیں۔

باب ۳

ابتدائی دور۔ شمالی ہند میں

تمہید شہنشاہ اورنگ زیب کے بعد خاندان مغلیہ کا شیرازہ منتشر سا ہو گیا۔
بہادر شاہ نے تقریباً پانچ برس اور فرخ سیر نے چھ برس حکومت
کی۔ لیکن اس گیارہ بارہ سال کے عرصے میں ملک کو چین نصیب نہ ہو سکا محمد شاہ
کے زمانے میں سادات کی قوت ٹوٹ گئی تو کچھ عافیت میسر آئی۔ اس عافیت کو
اہل کمال نے غنیمت سمجھا اور چاروں طرف سے آکر پایۂ تخت دہلی میں جمع ہو گئے۔
ہمیں یہاں صرف شعر و شاعری سے سروکار ہے لہٰذا اُن ہی لوگوں کے نام
درج کیے جا سکتے ہیں جنھیں شعر و شاعری کا ذوق تھا۔ ان میں قزلباش
خاں اُمید، سلیمان قلی خاں وداد۔ علی قلی خاں ندیم۔ شیخ سعد اللہ گلشن۔ مرتضیٰ
قلی خاں فراق۔ میر شمس الدین فقیر۔ مرزا عبد القادر بیدل۔ سراج الدین علی خاں
آرزو۔ ایسی صاحب فضل و کمال ہستیاں تھیں جن کی فارسی شاعری پر اگر
وہ عہد ناز کرے تو بیجا نہیں۔

جیسا بیان ہوا یہ ارباب فن فارسی سے اپنی تیغ زبان کو جلا دیتے تھے

زبان اُردو کی طرف ان لوگوں نے توجہ نہیں کی کیونکہ اس عہد میں اس زبان کو کچھ فروغ نہیں تھا حکومت کی زبان فارسی تھی۔ اور فارسی دانی ہی علم و ہنر کی سند تھی۔ اگرچہ چند دکنی شعرار مثلاً فراقی، فرحی، آرزو وغیرہ دہلی آئے۔ مگر زمانے نے مساعدت نہیں کی اور انھیں واپس جانا پڑا۔ البتہ ولی اورنگ آبادی ۱۱۲۲ء میں دہلی آئے اور کچھ عرصہ قیام کرکے لوگوں میں اردو شاعری کا ذوق پیدا کیا۔ اُن کے اُردو کلام کی بڑی قدر ہوئی۔ قوالوں اور ارباب نشاط نے ان کی غزلیات سے محفلوں کو گرما دیا۔ ظاہر ہے کہ جس چیز کی اتنی قدر ہو۔ لوگوں کے دلوں میں خود بخود اس کا شوق پیدا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ دہلی میں اُردو مذاق عام ہوگیا۔ بڑے بڑے مشاق فارسی گو شعرار نے بھی اس میں طبع آزمائی کی۔ مگر ان میں سے کسی نے اپنی شاعرانہ جد و جہد کو تنہا اُردو ہی کے لئے وقف نہیں کیا اور یہی وجہ ہے کہ ہم انھیں اُردو شعرار کی صف میں کوئی جگہ نہیں دے سکتے تاہم ولی اورنگ آبادی کے کلام کا اثر ظاہر کرنے کے لئے اگر اُن فارسی گو شعرار کے ایک ایک دو دو شعر لکھ دئے جائیں تو نامناسب نہ ہوگا۔

قزلباش خاں اُمید کے دو شعر تذکروں میں ملتے ہیں۔

در و دیوار سے اب صحبت ہے — یارب گھر میں عجب صحبت ہے
تری آنکھوں کو دیکھ ڈرتا ہوں — الحفیظ الحفیظ کہتا ہوں

مرزا عبدالقادر بیدل کے دو شعر نکات الشعرار میں درج ہیں۔

مت پوچھ دل کی باتیں وہ دل کہاں ہے ہم میں
اب تخم بے نشاں کا حاصل کہاں ہے ہم میں
جب دل کے آستاں پر عشق آن کر پکارا
پردے سے یار بولا بیدل کہاں ہے ہم میں

مرزا قلی خاں ندیم کے دو شعر ملاحظہ ہوں ۔

جدائی میں تیری ہم کیا کہیں کس طرح جلتے ہیں
بجائے مو بدن سے آگ کے شعلے نکلتے ہیں

بے قرارِ عشق کو ہے زندگی نقصِ کمال
مرچکے بیمار تب کہتے ہیں یہ اکسیر ہے

سراج الدین علی خان آرزو فارسی کے مسلم الثبوت استاد ہیں۔ مولانا محمد حسین آزاد نے آب حیات میں انھیں بزم اُردو کے صدر کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ اور شعرار کی صفِ اوّلین میں نہایت ممتاز مقام پر انھیں بٹھایا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ انھیں اُردو شعر و شاعری سے کوئی خاص تعلق نہیں۔ جس طرح دیگر فارسی شعراء نے رفتار زمانہ کے ساتھ دو چار قدم چلنے کا ثبوت دیا ہے۔ اسی طرح آرزو نے بھی چند اُردو اشعار کہہ کر اپنی خوش مذاقی اور اُردو کی ہر دلعزیزی کو مسلم کیا ہے۔ چنانچہ چند اشعار آپ کے یہ ہیں :-

ہر صبح آو تا ہے تیری برابری کو ‏ ‏ کیا دن لگے ہیں دیکھو خورشید خاوری کو
رکھے سیپارہ دل کھول آگے عندلیبوں کے ‏ ‏ چمن میں آج گویا پھول ہیں تیرے شہیدوں کے

جان تجھ پر کچھ اعتماد نہیں   زندگانی کا کیا بھروسہ ہے
تجھ زلف میں ٹک نہ رہے دل تو کیا کرے   بیکار ہے اٹک نہ رہے دل تو کیا کرے
مے خانے آج جاکر شیشے تمام توڑے   زاہد نے آج اپنے دل کے پھپھولے تو

یہاں تک جو کچھ بیان ہوا وہ محض تمہید تھی۔ تاکہ اس عہد کے عام حالات اور فضا سے واقفیت ہو جائے۔ تمہید اگرچہ طویل ہو گئی لیکن کم از کم اتنا تو معلوم ہو گیا کہ اُردو نے فارسی شعراء کے دلوں پر بھی قبضہ کر لیا تھا اور کلام ولی نے اس ذوق و شوق میں اور جوش و خروش پیدا کر دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ دہلی میں ایک گروہ ایسے شعراء کا پیدا ہو گیا جنھوں نے اُردو شعر و شاعری کو طرۂ امتیاز بنایا۔ شمال میں شعر و ادب کا دبستان کھول دیا اور خود اس دبستان کے معلم بنے ان میں سے چند قابل ذکر ہستیوں کے حالات زندگی مستند اور نمونۂ کلام ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

شاہ مبارک آبرو

آپ کا نام نامی نجم الدین عرف شاہ مبارک اور آبرو تخلص تھا۔ تاریخ ولادت ہنوز پردۂ راز میں ہے۔ البتہ یہ معلوم ہے کہ آپ کی ولادت گوالیار میں ہوئی۔ آپ کے دادا شاہ محمد غوث گوالیار کے مانے ہوئے بزرگ تھے۔ لڑکپن میں آبرو دہلی پہنچے اور فن شاعری کا اکتساب کیا۔ اگرچہ خان آرزو سے عمر میں بڑے تھے۔ مگر اپنا کلام انھیں دکھا لیتے تھے۔ آرزو سے کچھ رشتہ داری تھی۔ آپ کچھ مدت نارنول میں بھی مقیم رہے۔ ایک آنکھ سے آپ معذور بھی تھے۔ ۱۷۵۰ء میں اس جہان فانی سے کوچ کیا۔

آبرو کی علمی قابلیت فن شعر کے لئے کافی تھی۔ آپ نے ایک دیوان

غزلیات کا مرتب کیا تھا۔ لیکن وہ اب نایاب ہے۔ کلام میں سادگی اور بے تکلفی پائی جاتی ہے۔ غزلیات میں زیادہ تر ردیف کی قید نہیں ہوتی۔ قافیہ میں بھی آزادی برتتے ہیں اور یہی اس عہد کا رنگ ہے۔ آبرو کو ایہام اور ذو معنین الفاظ کا بہت شوق ہے۔ اور کلام کی بنیاد زیادہ تر اسی صنعت پر ہوتی ہے۔
نمونہ کلام ملاحظہ ہو:۔

نین سیں جب ملائے گیا — دل کے اندر مرے سمائے گیا
تیرے چلنے کی سن خبر عاشق — یہی کہتا ہوا کہ ہائے گیا
آبرو ہجر بیچ مرتا تھا — مکھ دکھا کر اسے جلائے گیا

ستم اُس مرد کی کھاتے ہیں قسم زوروں کی
تاب لاوے جو کوئی عشق کے جھک جھوروں کی

گانٹھ کاٹی ہے مری دل کی تری انکھیاں نے
دو پلک نین یہ کترنی ہے مگر چوروں کی

آبرو کو نہیں کم ظرف کی صحبت کا دماغ
کس کو برداشت ہے ہر وقت کے نکتوروں کی

یہ رسم ظالمی کی دستور ہے کہاں کا — دل چھین کر ہمارا دشمن ہوا ہے جاں کا
تجھ راہ میں ہوا ہے اب تو رقیب کتا — جو پائے کر ہماری آبا تو دھتا ہے ناں کا
سب عاشقوں میں ہم کوں مژدہ ہے آبرو کا — ہے قصد گر تمھارے دل بیچ امتحاں کا

محمد شاکر ناجی | شاہ مبارک آبرو نے ناجی کی شیریں زبان کی تعریف کی ہے۔

سخن سنجان میں ہے گا آبرو آج
نہیں شیریں زباں شاکر سری کا

آپ محمد شاہ بادشاہ کے وزیر عمدۃ الملک امیر خاں کے داروغہ تھے۔ سن ولادت و وفات معلوم نہیں لیکن آبرو کے ہمعصر تھے، وہ نادر شاہی حملہ کے وقت یعنی ۱۷۳۹ء میں نہ صرف زندہ تھے بلکہ محمد شاہی لشکر میں شامل تھے اور دہلی دربار اور لشکر کی کیفیت ایک مخمس میں نظم کی ہے جس کا ایک بند ملاحظہ ہو۔

لڑے ہیں نے تو برس بیس ان کو بیتے تھے | دنا کے زور سے دائی دوا کے جیتے تھے
شہر میں گھر کی نکالی مزے سے پیتے تھے | نگار و نقش میں ظاہر گویا کہ جیتے تھے
گلے میں ہنسلیاں بازو اُپر طلا کے نال

آپ کے کلام میں سادگی اور صفائی کے علاوہ ظرافت کی چاشنی اور شوخی ملاحت عجب مزا دیتی ہے۔ آپ کی طبیعت کا میلان ہزل گوئی کی طرف تھا۔ آبرو کی طرح ایہام وذو معنیین الفاظ کا بھی شوق تھا اور اسی صنعت پر کلام کی بنیاد تھی۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو۔

اے صبا کہہ بہار کی باتیں | اُس بتِ گلعذار کی باتیں
کس پہ چھوڑے نگاہ کی شہباز | کیا کرے ہے شکار کی باتیں
چھوڑتے کب ہیں نقد دل کو صنم | جب یہ کرتے ہیں پیار کی باتیں
دیکھ موہن تری کمر کی طرف | پھر گیا مانی اپنے گھر کی طرف
جن نے دیکھے ترے لبِ شیریں | نظر اُن کی نہیں شکر کی طرف

ہے محال ان کا دام میں آنا دل ہے اُن آہوان کا ذرکی طرف
حشر میں پاکباز سے ناجی بدعمل جائیں گے سقر کی طرف

شیخ شرف الدین مضمون شیخ شرف الدین نام مضمون تخلص تھا۔ شیخ فرید الدین شکر گنج کی اولاد میں تھے۔ آگرہ کے قریب موضع جاجمؤ میں پیدا ہوئے۔ اور آغاز شباب میں دہلی چلے آئے۔ اور پھر اُسی کو اپنا وطن بنایا اور زینت المساجد میں درویشانہ زندگی بسر کی۔ خان آرزو سے مشورہ سخن کیا کرتے تھے۔ ۱۷۴۵ء میں راہی ملک بقا ہوئے۔ مضمون اس دور کے مسلم الثبوت اُستاد شمار ہوتے ہیں۔ سودا اپنے ایک شعر میں فرماتے ہیں۔

بنا ئیں اُٹھ گئیں یاروغزل کے خوب کہنے کی
گیا مضمون دنیا سے رہا سودا سو مستانہ

آپ کا کلام آپ کی اُستادی اور مشاقی کو مسلم کرتا ہے۔ آپ کے کلام میں استعارے کی چاشنی موجود ہے۔ لیکن زمانے کے اصلی رنگ یعنی ایہام اور مراعاۃ النظیر سے بھی کام لیا ہے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو۔

کرے ہے وار کو کامل بھی سرتاج ہوا منصور سے نکتہ یہ حل آج
ہم نے کیا کیا نہ ترے عشق میں محبوب کیا صبر ایوبؑ کیا گریۂ یعقوبؑ کیا
کریں کیوں نہ شکر لبوں کو فرید کہ دادا ہمارا ہے بابا فرید
یہ مژگاں برستے ہیں مجھ پر آپ پیکاں کا اس طرف ہے ڈھال
کہا مجھ بلبل نے باندھا ہے چمن میں آشیاں ایک تو گل بیوفا اور تس پہ حور باغباں

ہیرا پیغام وصل اے قاصد محبوب سے اُسے جُدا کر کے
پلا کشتی میں آگے سے جو وہ محبوب جاتا ہے
کبھی آنکھیں بھر آتی ہیں کبھی جی ڈوب جاتا ہے

محمد احسن احسن | محمد احسن نام۔ احسن تخلص۔ اسی ابتدائی دور کے مشہور شاعر تھے۔ ان کا کلام ایہام کے رنگ میں

دبا ہوا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

جا کہیو گر جاوے ہے تو اس شوخ دلبر سوں   کر کر کر قول پرسوں کا گیا برسوں ہوئے پرسوں
نستعلیق کا ہے اس بت خوشخط کی زلف   ہم تو کافر ہوں اگر بندہ نہ ہوں اسلام کے
رک بدن پہ اپنے کرتے ہو تم جو غسترہ   موسیٰ کمر نے تجھ کو فرعون سا بنایا

غلام مصطفیٰ خاں یک رنگ | غلام مصطفیٰ خاں نام یک رنگ تخلص۔ کہن سال اور کہنہ مشق شاعر تھے۔ حضرت مرزا

مظہر جان جاناںؒ سے مشورہ سخن کرتے تھے۔ اپنے وقت کے خوش فکر، باکمال اور مشاق شاعر مانے جاتے تھے اور محمد شاہی امرا میں مصاحب حیثیت تھے۔ نمونہ کلام یہ ہے :۔

یاں شکوہ سے مہندی کا ہر بات   کہ خوباں نے لگائے ہیں مجھے ہات
یک رنگ نے تلاش کیا ہے بہت دلے   مظہر سا اس جہاں میں کوئی بیرا نہیں
جدائی سے تری اے صندلی رنگ   مجھے یہ زندگانی دردِ سر ہے
اس قدر کیا ہے حمایت غیر کی   ہم بھی تو تم سے کبھی تھے آشنا
منتا نہیں ہے بات کسی کی تو لے سجن   تجھ کو ترا غرور نہ جانوں کرے گا کیا
سچ کہے جو کوئی تو مارا جائے   راستی ہے گی دار کی صورت

شاہ ظہور الدین حاتم

ظہور الدین نام اور حاتم تخلص تھا۔ سنہ ۱۱۱۱ھ مطابق سنہ ۱۶۹۹ء میں پیدا ہوئے۔ عمدۃ الملک نواب امیر خاں کی سرکار میں ملازم تھے۔ سپاہی زادہ اور سپاہی پیشہ تھے لیکن دلّی میں قدم شریف کے قریب میر بادل علی شاہ کے تکیے میں اُٹھنے بیٹھنے سے طبیعت میں فقیری اور آزادہ منشی پیدا ہوگئی تھی۔ شعر و شاعری کا شوق ابتدائے عمر ہی سے تھا۔ پہلے رمز تخلص کرتے تھے۔ پھر حاتم تخلص کرنے لگے۔ کلیات ان کا بہت بڑا ہے۔ جو غزلیات قصائد۔ رباعیات مثنوی وغیرہ پر مشتمل ہے لیکن آپ نے خود اس کلیات کا انتخاب کیا اور اس کا نام "دیوان زادہ" رکھا۔ یہ بھی کافی ضخیم کتاب ہے۔ "دیوان زادہ" پر جو آپ نے دیباچہ لکھا ہے، اس سے آپ کے متعلق کافی واقفیت پہنچتی ہے۔ دیباچہ کی عبارت فارسی ہے۔ یہاں اس کا خلاصہ درج کیا جاتا ہے۔

میں نے سنہ ۱۱۲۹ھ سے سنہ ۱۱۶۹ھ تک یعنی چالیس سال تک سرزمین شاعری کی سیاحت کی ہے۔ فارسی میں پیرو صائب ہوں اور اردو میں ولی کو اُستاد سمجھتا ہوں۔ دیوان قدیم نادر شاہی حملے سے قبل ہند میں مشہور تھا۔ لیکن سنہ ۳ھ جلوس عالمگیر ثانی میں اس دیوان کا خلاصہ کیا اور "دیوان زادہ" اس کا نام رکھا۔

میرے معاصر شاہ مبارک آبرو۔ شرف الدین مضمون۔ مرزا جان جاناں مظہر۔ شیخ احسن اللہ احسن۔ میر شاکر ناجی۔ غلام مصطفےٰ یک رنگ ہیں۔

میں نے لفظ "در"، "بر"، "از" اور اسی قسم کے دیگر الفاظ و افعال ترک کر دیئے۔ اور روزمرہ دہلی کو روا رکھا۔ مخصوص ہندی اور بھاشا الفاظ کو بھی متروک قرار دیا۔ لیکن روزمرہ اور عام فہم اور پسندیدہ الفاظ کو برقرار رکھا۔ تسبی بجائے تسبیح

اور صحی بجائے صحیح، بگانہ بجائے بیگانہ اور دوانہ بجائے دیوانہ وغیرہ الفاظ کا استعمال ناجائز ٹھہرایا۔ اسی طرح ساکن کو متحرک اور متحرک کو ساکن باندھنا ترک کیا وغیرہ وغیرہ ۔

اس دیباچہ کے آخر میں اپنے شاگردوں کی فہرست بھی درج کی ہے جن کی تعداد ۴۵ ہے۔ ان ہی شاگردوں میں مرزا محمد رفیع سودا کا نام بھی ہے۔

حاتم ۱۱۹۱ھ میں بمقام دہلی راہی ملک بقا ہوئے۔

حاتم کا مرتبہ بہ حیثیت استاد کے مسلم ہے اور آپ کی خدمت زبان وقیع ہے۔ سودا جیسے شاعر آپ کے دامن فیض میں تربیت پاکر اپنے وقت کے مسلم الثبوت استاد ہوئے۔ حاتم نے اپنے کلام میں فصاحت اور زبان کی صفائی کو بہت اہمیت دی۔ لیکن افسوس یہ کہ ان کی اصلاحات پر ان کے عزیز ترین شاگرد یعنی سودا نے بھی عمل نہ کیا۔ میر اور سودا کے یہاں کثرت سے وہی الفاظ پائے جاتے ہیں جن کو حاتم نے ترک کر دیا تھا۔ البتہ ان اصلاحات سے آگے چل کر ناسخ نے فائدہ اٹھایا۔ اور زبان اردو کو اکثر ناہمواریوں سے پاک کرنے میں کامیاب ہوئے۔

حاتم کے کلام میں ایہام بہت کم پایا جاتا ہے لیکن اس سے یہ مطلب نہیں کہ آپ نے اس تکلف کے خلاف علم جہاد بلند کیا ہو۔ اس جہاد کا فخر مرزا مظہر کو حاصل ہے تاہم حاتم کے کلام کا اصلی جوہر سادگی، بے تکلفی اور بے ساختہ پن ہے۔ جو کچھ دل پر گذرتا ہے بے تکلف کہہ دیتے ہیں۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو :-

رکا مجھ کو اس سبب ڈر ہے — شوخ ظالم ہے اور ستمگر ہے
یکھ سروِ چمن ترے قد کو — خجل ہے پا بہ گل ہے بے بر ہے
حق میں عاشق کے تجھ لباں کا بچن — قند ہے نیشکر ہے شکّر ہے
کیوں نہ سب سے تجھے چھپا رکھوں — جان ہے دل ہے دل کا اثر ہے
مارنے کو رقیب کے حاتم — شیر ہے ببر ہے، دھن تر ہے

آبِ حیات جا کے کسوں نے پیا تو کیا — مانند خضر جگ میں اکیلا جیا تو کیا
ناسور کی صفت ہے نہ ہوگا کبھی وہ بند — جرّاح زخمِ عشق کا آکر سیا تو کیا

ہجر کی زندگی سے موت بھلی — کہ جہاں سب کہیں وصال ہوا

جب سے تری نظر پڑی ہے جھلک — تب سے لگتی نہیں پلک سے پلک
پیری میں حاتم اب نہ جوانی کو یاد کر — سوکھے درخت بھی کہیں ہوتے ہیں پھر ہرے

اشرف علی خاں فغاں

اشرف علی خاں المتخلص بہ فغاں احمد شاہ بادشاہ کے کوکا اور علی قلی خاں ندیم کے شاگرد تھے۔ میر تقی میر نے انھیں قزلباش خاں اُمید کا شاگرد لکھا ہے۔ ممکن ہے کہ پہلے اُمید کے شاگرد ہوں اور پھر ندیم سے فیض اُٹھایا ہو۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

دشتِ جنوں میں کیوں نہ بھیروں میں پریشاں — اب تو فغاں ندیم مرا رہنما ہوا

"اب تو" کے ٹکڑے سے قیاس ہوتا ہے کہ پہلے ان کا "رہنما" کوئی اور تھا۔ اور غالباً وہ "رہنما" اُمید تھے۔

فغاں بذلہ سنجی اور لطیفہ گوئی میں یگانۂ روزگار تھے۔ چنانچہ احمد شاہ نے ان کی طبیعت کی مناسبت سے ظریف الملک کا خطاب عطا کیا تھا۔

احمد شاہ درّانی کے حملوں سے دہلی میں ابتری پھیل رہی تھی ۔ فغاں اس غیر مستقل حالت سے گھبرا کر اپنے چچا ایرج خاں کے پاس مرشدآباد پہنچے ۔ چندے وہاں قیام رہا پھر فیض آباد کا قصد کیا۔ نواب شجاع الدولہ نے انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا اور اعزاز و اکرام سے سرفراز کیا ۔ پریشان حالی نے تو ساتھ چھوڑ دیا مگر نازک مزاجی یہاں بھی جان و دل کے ساتھ تھی ۔ ایک روز نواب صاحب نے جوشِ اختلاط میں بقول مصحفی گرم پیسے سے ان کا ہاتھ جلا دیا ۔ آگ بگولہ ہوگئے اور طیش میں آکر عظیم آباد چلے گئے ۔ وہاں راجہ شتاب رائے نے ان کی قدر و منزلت کی ۔ آپ وہیں مقیم ہوئے ۔ اور آخر وقت تک وہیں رہے اور وہیں ۱۱۸۶ھ میں پیوند خاک ہوئے ۔

مولانا محمد حسین آزاد آب حیات میں فرماتے ہیں کہ آخر وقت میں فغاں سے اور راجہ صاحب سے بھی شکر رنجی ہوگئی اور انھوں نے حکام فرنگ تک رسائی پیدا کرکے باقی عمر فارغ البالی اور خوش حالی میں گزاری ۔

فغاں کی زبان وہی ہے جو اس عہد کے دیگر شعرا کی ہے مگر کلام میں صفائی زیادہ ہے ۔ ایہام بھی بہت کم بلکہ نہ ہونے کے برابر ہے ۔ باتیں سیدھی سادی ہیں ۔ لیکن بے ساختہ پن سے تاثیر میں ڈوبی ہوئی ۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو :

خط ذبحیو چھپا کے سے وہ اگر کہیں	لینا نہ میرے نام کو اے نامہ بر کہیں
بادِ صبا تو عقدہ کشا اس کی ہو جیو	مجھ سا گرفتہ دل اگر آوے نظر کہیں
اتنا وفور خوش نہیں آتا ہے اشک کا	عالم کو مت ڈبوئیو اے چشم تر کہیں
میری طرف سے خاطرِ صیاد جمع ہے	کیا اڑ سکے گا طائر بے بال و پر کہیں
تیری گلی میں خاک بھی چھانی کہ دل ملے	ایسا ہی گم ہوا کہ نہ آیا نظر کہیں

رونا جہاں تک تمھاری جان روچکا ... مطلق نہیں ہے چشم میں نم کا اثر کہیں
باور اگر تجھے نہیں آتا تو دیکھ لے ... آنسو کہیں ڈھلک گئے لخت جگر کہیں
ایذا فغاں کے حق میں یہاں تک روا نہیں
ظالم یہ کیا ستم ہے خدا سے بھی ڈر نہیں

تبصرہ

زبان بہت سے قدیم دکنی الفاظ جو بحری اور ولی کے کلام میں کثرت سے ملتے ہیں وہ شمالی ہند کے ابتدائی دور میں نہیں ملتے۔ اور یہ قدرتی بات ہے۔ دکن میں اردو نے زیادہ تر ہندی، دکنی، مرہٹی وغیرہ زبانوں سے بنایا گیا اور ان کے الفاظ قبول کئے۔ شمالی ہند میں برج بھاشا اور فارسی کے دامن میں پلی۔ اس دور کی تمہید میں جو فارسی شعراء کے اردو اشعار درج ہوئے ہیں ان سے صاف ظاہر ہے کہ اردو پر فارسی رنگ کس قدر غالب تھا۔ اس دور کے جتنے شاعر استاد ہوئے۔ وہ سب یا تو خود فارسی داں تھے یا فارسی داں استادوں کے شاگرد، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے کلام پر فارسی رنگ چھایا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

حاتم نے زبان کو پاک وصاف کرنے کی کوشش کی۔ لیکن انھوں نے جو طریقہ اختیار کیا وہ کچھ زیادہ مفید ثابت نہیں ہوا۔ یعنی انھوں نے اپنے کلیات کے انتخاب میں ایسے اشعار نکال ڈالے جن میں ثقیل خلاف روزمرہ اور ٹھیٹ ہندی الفاظ تھے۔ یا قافیہ کا کوئی سقم تھا۔ یا کوئی فارسی لفظ غلط مستعمل تھا۔

ں نے ان متروکات پر کسی سے عمل نہیں کرایا۔ اور یہی وجہ ہے کہ ان کے فخر
د شاگرد کے کلام میں بھی ان کے متروکات کافی تعداد میں ملتے ہیں۔

اف سخن | یوں تو اس دور میں قصیدہ بھی لکھا گیا۔ اور مثنوی بھی۔ مگر اصلی کارنامہ اس دور کا غزل ہے۔

عری | سطور گذشتہ میں بیان ہوا کہ زبان اور طرز بیان پر فارسیت غالب ہے۔ لیکن عجیب اتفاق ہے کہ ہندی دوہروں کی ایک خصوصیت
س دور کی غزلوں پر اپنا سکہ جما یا۔ یعنی ایہام و ذو معنیین الفاظ کا استعمال
ہوا۔ اگر اعتدال سے اس صنعت کو برتا جائے تو حسن ہے لیکن اس دور
ی کی بنیاد زیادہ تر اسی پر رکھی گئی۔ اور اس صنعت کی خاطر تکلف اور
سے کام لیا گیا۔ اگر اس دور کو ایہامی دور کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔
کلف سے قطع نظر خیالات میں سادگی ہے۔ صاف و سادہ باتیں ہیں اور
گہ نری باتیں ہی باتیں ہیں۔ ولی کے خاص رنگ یعنی بھاشا شاعری
ربات نے اس دور میں فروغ نہیں پایا۔ شعراء نے ولی کی تقلید نہیں کی۔
رسی کی تقلید کر کے دیسی چیز کو پردیسی بنا دیا۔

نہ | دکن کے ابتدائی دور سے شمالی ہند کے ابتدائی دور کا پلہ ہر حیثیت سے ہلکا ہے۔ کیا بلحاظ اصناف سخن کیا بلحاظ نفس شاعری ہر لحاظ
کنی کو فوقیت حاصل ہے۔ البتہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ زبان نے نسبتاً ترقی
حاتم کی کوششیں گو اس دور میں بار آور نہ ہوئیں تاہم ایک راہ نکل گئی۔
نسل کے لوگ اسی راہ پر چل کر مصلح زبان کہلائیں گے۔

آخر میں اس امر کا اعتراف ضروری ہے کہ اس دور کے شعراء کے کلام میں
پُر تاثیر اور مؤثر اشعار جا بجا ملتے ہیں اور اس قسم کے اشعار دکنی دور کے بہترین
اشعار کے مقابلہ ہی پر نہیں بلکہ ہر آئندہ دور کے عمدہ اشعار کے مقابلے پر
پیش کیے جا سکتے ہیں۔ اگرچہ بلند خیالی نہیں تاہم فطری انداز بیان کی بدولت
ان اشعار میں بے پناہ تاثیر پیدا ہو گئی ہے۔

باب ۴

اُردو شعر و شاعری کا دوسرا دَور

عہدِ زرّیں

حضرت مرزا مظہر جان جاناںؒ

زبدۃ العارفین قدوۃ الواصلین حضرت مرزا
مظہر جان جاناںؒ ۱۶۹۹ء میں بمقام
کالا باغ (مالوہ) کتم عدم سے عالم وجود میں تشریف لائے۔ آپ کے والد مرزا جان
اورنگ زیب کے دربار میں منصب دار تھے۔ شہنشاہ ان دنوں دکن میں فوج کی
کمان کر رہا تھا۔ مرزا جان اس کے ہمراہ تھے۔ جب مرزا مظہر کی ولادت کا حال
معلوم ہوا تو اورنگ زیب نے فرمایا "پسر جان پدر می باشد" اس لئے ہم نے اس
نام جان جاں رکھا۔ کثرتِ استعمال سے جانِ جاناں ہو گیا۔

حضرت مظہر کا سلسلۂ نسب باپ کی طرف سے محمد بن حنفیہ سے ملتا ہے
ماں بیجاپور کے شریف گھرانے سے تھیں۔ دادا بھی شاہی دربار میں منصب دار

ے۔ دادی اسد خاں وزیر کی خالہ زاد بہن تھیں۔ پردادا سے اکبر شاہ کی بیٹی
سوب ہوئی تھیں۔ ان رشتوں کے لحاظ سے تیموری خاندان کے نواسے تھے۔

مرزا مظہر کے رشتۂ حیات میں ابھی کل اٹھارہ ہی گرہیں لگی تھیں کہ باپ نے
ات پائی اور آپ سایۂ پدری سے محروم ہو گئے۔ ان کا منصب حاصل کرنے کا
ال پیدا ہوا۔ لیکن بخت کی سعادت مندی نے دنیا سے جی اُچاٹ کر دیا۔ مدرسوں
رخانقاہوں کی جادہ پیمائی شروع کی۔ شیخ محمد افضل سیالکوٹی سے جو اس
مانے میں شیخ المحدثین تھے، باقاعدہ حدیث پڑھی اور تیس برس تک مشائخ
نش بندی سے کسب کمال کیا۔ اور صاحب حال و قال بزرگ ہوئے۔

آپ کی طبیعت میں سنجیدگی اور متانت بدرجۂ اتم پائی جاتی تھی۔ خوش تقریر
س بلا کے تھے کہ بات کرتے منہ سے پھول جھڑتے تھے۔ مزاج میں لطافت اور
بع میں سلامتی تھی۔ میر تقی اُن سے ملے تھے۔ "نکات الشعراء" میں لکھا ہے کہ
یندہ بخدمت او رفتہ سعادت اندوز گشتہ است، خوش تقریر بمرتبہ است
ہ در تحریر نمی گنجد"۔ انشاء اللہ خاں انشا نے بھی "دریائے لطافت" میں آپ کی
صاحت و بلاغت کا ذکر کیا ہے۔ استغناء اور قناعت طبیعت میں اس درجہ
تھی کہ عمر بھر کسی بادشاہ یا وزیر کے سامنے سر نیاز خم نہیں کیا۔ بادشاہوں
ور امیروں نے اکثر پیشکش اور نذر و نیاز کے لئے دست داد و دہش
ڑھایا۔ مگر ان کے استغناء کا ہاتھ ہمیشہ بر دامن ہی رہا۔ نہایت
سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ زندگی بھر کہیں مکان نہیں بنایا۔ کسی
دوست کے گھر یا کرائے کے مکان میں عمر بسر کر دی۔ ایک جوڑے سے

زیادہ کپڑا نہ رکھتے تھے ۔ جب بھوک لگتی بازار سے منگواتے اور کھلاتے ۔ عام دعوتوں کو قبول نہ فرماتے تھے ۔ نہ عرس کرتے تھے نہ فاتحہ ۔ روپئے پیسے کی ضرورت تو کیونکر ۔

ساتویں محرم کی تھی ۔ کہ رات کے وقت ایک شخص آیا ۔ دروازہ بند تھا اس نے آواز دی ۔ باہر نکلے تو ایک قرابین ماری ۔ وہ تو بھاگ گیا مگر حضرت کو زخم کاری لگ چکا تھا ۔ تین دن زندہ رہے ۔ دس محرم ۱۱۹۵ھ مطابق ۱۷۸۱ء کو اس جہان فانی سے کوچ کیا اور شہدائے کربلا کی خدمت میں جا حاضر ہوئے ۔ سودا نے جب شہادت کی خبر سنی تو تاریخ کہی ۔

مرزا کا ہوا جو قاتل ایک مرتد شوم	اور ان کی ہوئی خبر شہادت کی عموم
تاریخ آرزوے درد برس کے کہی	سودا نے کہ ہائے جان جاناں مظلوم

۱۱۹۵ھ

آپ کا ایک مختصر فارسی دیوان موجود ہے ۔ اردو دیوان بھی مرتب کیا مگر نایاب ہے ۔ اردو شعر و ادب کے ارتقا میں آپ کا مرتبہ بہت بلند ہے ۔ تمام تذکرہ نویس مثلاً قدرت اللہ صدیقی، مصحفی وغیرہم متفق الرائے ہیں کہ مظہر نے اردو شاعری کے دامن کو ایہام کے بدنما داغ سے پاک کیا ۔ سید انشار آپ کی فصاحت و بلاغت کی داد دیتے ہیں ۔ آپ کا کلام درد اور کیف کی جیتی جاگتی تصویر ہے ۔ زبان نہایت شستہ اور روزمرہ دہلی کا اعلیٰ نمونہ ہے ۔ تصوف کی چاشنی نے جذبات کو بلند اور موثر کیا ہے ۔ مرزا مظہر کا فیض شاعری بھی کچھ کم نہیں ۔ بہت سے خوش مذاق

موزوں طبع آپ کے دامن تربیت میں پرورش پاکر صاحب دیوان اور استاد ہوئے۔ ان میں انعام اللہ خاں یقیں۔ میر محمد باقر حزیں۔ خواجہ احسن اللہ خاں بیاں۔ مصطفیٰ خاں یکرنگ (دور اول کے شاعر) ساون لال بیدار۔ بیبت قلی خاں حسرت۔ محمد فقیہ دردمند کے نام دنیائے شاعری میں مہ و ماہ کی طرح چمکتے ہیں۔

اب مرزا صاحب کے کلام سے لطف اٹھایئے۔

چلے اب گل کے ہاتھوں سے لٹا کر کارواں اپنا ۔ نہ چھوڑا ہائے بلبل نے چمن میں کچھ نشاں اپنا
یہ حسرت رہ گئی کس کس مزے سے زندگی کٹتی ۔ اگر ہوتا چمن اپنا گل اپنا باغباں اپنا
الم سے یاں تلک، روئیں کہ آخر ہو گئیں رسوا ۔ ڈبویا ہائے آنکھوں نے مژہ کا خانداں اپنا
رقیباں کی نہ کچھ تقصیر ثابت ہے نہ خوباں کی ۔ مجھے ناحق ستاتا ہے یہ عشق بدگماں اپنا
مرا جی جلتا ہے اس بلبل بیکس کی غربت پر ۔ کہ جس نے آسرے پر گل کے چھوڑا آشیاں اپنا
جو تو نے کی سو دشمن بھی نہیں دشمن سے کرتا ہے ۔ غلط تھا جانتے تھے تجھ کو جو ہم مہرباں اپنا

کوئی آزردہ کرتا ہے سجن اپنے کو بے ظالم
کہ دولت خواہ اپنا مظہر اپنا جان جاں اپنا

ہم نے کی ہے توبہ اور دھومیں مچاتی ہے بہار ۔ ہائے بس چلتا نہیں کیا مفت جاتی ہے بہار
لالہ و گل نے ہماری خاک پہ ڈالا ہے شور ۔ کیا قیامت ہے موؤں کو بھی ستاتی ہے بہار
شاخ گل ہلتی نہیں یہ بلبلوں کو باغ میں ۔ ہاتھ اپنے کے اشارے سے بلاتی ہے بہار
نرگس و گل کی کھلی جاتی ہیں کلیاں دیکھ سب ۔ پھر ان ہی خوابیدہ فتنوں کو جگاتی ہے بہار
ہم گرفتاروں کو اب کیا کام ہے گلشن سے لیک ۔ جی نکل جاتا ہے جب سنتے ہیں آتی ہے بہار

مرزا محمد رفیع سودا

مرزا محمد رفیع نام۔ سودا تخلص۔ مرزایان کابل سے تھے۔ ان کے والد محمد شفیع بغرض تجارت ہندوستان آئے اور یہیں بود و باش اختیار کرلی۔ مرزا رفیع ۱۷۱۳ء میں بمقام دہلی پیدا ہوئے۔ یہیں تربیت و پرورش پائی۔ رسم زمانے کے بموجب پہلے سلطان قلی خاں وداد کے شاگرد ہوئے۔ خان آرزو کے شاگرد نہ تھے۔ لیکن ان کی صحبت سے بہت فیض پایا تھا۔ شاعری کی ابتدا، فارسی سے کی مگر خان آرزو کے کہنے سے اردو میں کہنا شروع کیا۔ اور حاتم شاہ کو اپنا اُستاد بنایا۔ طبیعت کی مناسبت اور مشق کی کثرت سے دلی جیسے شہر میں ان کی استادی مسلم الثبوت ہوئی۔ استاد کی زندگی ہی میں وہ شہرت حاصل ہوئی کہ خاص و عام میں ان کے کلام کا چرچا ہونے لگا۔ شدہ شدہ شاہ عالم اپنا کلام اصلاح کے لئے ان کو دینے لگے۔

مرزا بڑے نازک مزاج اور غیور طبع واقع ہوئے تھے۔ کہتے ہیں شاہ عالم سے کسی بات پر ناراض ہوکر گھر بیٹھ رہے۔ ہر چند بادشاہ نے بلوایا۔ مگر نہ گئے۔ دہلی کے اکثر امرا بڑی قدردانی کرتے تھے اور اس قدردانی کی بدولت فارغ البالی سے بسر ہوتی تھی۔

مرزا کا شہرہ جب لکھنؤ پہنچا تو نواب شجاع الدولہ نے سفر خرچ بھیج کر بکمال اشتیاق لکھنؤ بلایا۔ مرزا سے دہلی نہ چھوڑی گئی۔ جواب میں یہ رباعی بھیج کر معذرت چاہی:-

سودا پئے دنیا تو بہر سو کب تک ۔۔۔ آوارہ ازیں کوچہ بآں کو کب تک
حاصل یہی اس سے نہ کہ دنیا ہووے ۔۔۔ بالفرض ہوا یوں بھی پھر تو کب تک

مرزا سودا

دہلی کی سیاسی حالت ابتر تھی۔ امرا حال سے بے حال ہوتے جاتے تھے۔ آخر جب شاہ عالم کا کھیل بگڑا۔ امراء کے دور دورے ختم ہوگئے اور بسر اوقات کا کوئی ذریعہ نہ رہا تو بادل ناخواستہ وطن کو خیرباد کہا۔ کچھ دنوں فرخ آباد قیام کیا۔ اس کے بعد فیض آباد پہونچے۔ اس وقت ان کا سن ساٹھ برس کا ہو چکا تھا۔ نواب شجاع الدولہ برسرِ حکومت تھے۔ وہ بہت عزت سے پیش آئے اور ان کی تنخواہ مقرر کر دی۔ نواب شجاع الدولہ کے بعد نواب آصف الدولہ مسند نشین ہوئے تو انھوں نے لکھنؤ کو پایۂ تخت بنایا۔ مرزا بھی بھی ان کے ہمراہ لکھنؤ پہنچے اور جب تک جیتے رہے شاہی قدردانی کی بدولت فارغ البالی سے رہے۔ آخر ہیں ۱۱۹۵ھ میں داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ اُن کے استاد شاہ حاتم زندہ تھے۔ سن کر بہت روئے اور کہا کہ ہمارا پہلوان سخن مرگیا۔ مصحفی نے تاریخ کہی۔ ع سودا کجا و آن سخن دلفریب او

سودا اُردو کے مسلم الثبوت استاد ہیں۔ جملہ اصناف سخن پر قدرت کاملہ رکھتے تھے۔ ان کا کلیات ہر جگہ ملتا ہے۔ اس میں غزلوں کے علاوہ قصائد، رباعیات، قطعات، مخمس، ترجیع بند، مستزاد، مثنویات، سلام، مراثی وغیرہ شامل ہیں۔

سودا کو زبان پر حاویانہ قدرت حاصل ہے۔ مضمون کو جس طرح چاہتے ہیں باندھتے ہیں۔ اور پھر الفاظ ایسے انتخاب کرتے ہیں کہ مضمون میں جدت کے ساتھ اثر پیدا ہو جاتا ہے۔ تشبیہ و استعارہ سے بھی کام لیا ہے لیکن خوش مذاقی سے ساتھ عاشقانہ مضامین میں سادگی جذبات اور صفائیٔ بیان سے تاثیر کے نشتر

بھرے ہیں۔ کلام میں متانت ہے۔ سوز و گداز بھی ہے لیکن اس میدان میں میر سے پیچھے ہیں۔

مرزا قصیدے کے بادشاہ ہیں۔ یوں تو ان سے قبل بھی قصیدے لکھے گئے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے اردو قصیدے کو فارسی قصیدے کا ہم پلّہ بنادیا۔ مشکل سے مشکل زمین کو اپنی فصاحت و بلاغت نشست الفاظ اور بندش کی چستی سے دلآویز اور شگفتہ بنادیتے ہیں۔ اور متانت بیان، پختگی کلام، زورِ الفاظ، علو تخیل اور ندرت و جدت سے زمین قصیدہ کو آسمان پر پہنچادیتے ہیں۔

سوداؔ کے کلیات میں متعدد ہجویں بھی شامل ہیں۔ جو مرزا کی نازک مزاجی اور تیزی طبع پر دلالت کرتی ہیں۔ اس کے علاوہ مشاقی اور قادر کلامی بھی ان سے ٹپکی پڑتی ہے۔ واقعات کو اس بے تکلفی اور سادگی سے نظم کرتے ہیں کہ دوسرا شخص شاید نثر میں بھی اس سے بہتر ادا نہ کرسکے۔ جہاں پاکیزہ تمسخر اور شائستہ مذاق ہے۔ وہاں ان کی ہجویں بہت پرلطف ہیں۔ لیکن جہاں کہیں انھوں نے طیش میں آکر اور آنکھیں بند کرکے لکھا ہے وہاں کا نقشہ کچھ اور ہے۔ عامیانہ پن بھی ہے اور ابتذال بھی۔

مرزا نے زبان اردو کو پاک و صاف کرکے اسے ترقی دینے کی بھی کوشش کی ہے۔ چنانچہ انھوں نے اردو میں فارسی محاورات کو اس طرح کھپایا ہے کہ وہ آج تک ہماری زبانوں پر چڑھے ہوئے ہیں۔

نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:۔

مقدور نہیں اس کی تجلّی کے بیاں کا — جوں شمع سراپا ہو اگر صرف زباں کا

پردے کو تعیّن کے درِ دل سے اٹھا دے — کھلتا ہے ابھی پل میں طلسمات جہاں کا

اس گلشنِ ہستی میں عجب دید ہے لیکن — جب آنکھ کھلی گل کی تو موسم تھا خزاں کا

دکھلائیے لیجا کے تجھے مصر کا بازار — لیکن نہیں خواہاں کوئی واں جنسِ گراں کا

سوداؔ کو جو کبھو گوش سے ہمت کے سنے تو — مضموں یہی ہے جرسِ دل کی فغاں کا

ہستی سے عدم تک نفسِ چند کی ہے راہ
دنیا سے گزرنا سفر ایسا ہے کہاں کا

گل پھینکے ہے غیروں کی طرف بلکہ ثمر بھی — اے خانہ برانداز چمن کچھ تو ادھر بھی

دل اس نے لیا مجھ کو ملی دولتِ دیدار — کیا لوٹ کا سامان اُدھر بھی ہے ادھر بھی

کیا ضد ہے مرے ساتھ خدا جانے وگرنہ — کافی ہے تسلّی کو مرے ایک نظر بھی

سوداؔ تری فریاد سے آنکھوں میں کٹی رات
آئی ہے سحر ہونے کو ظالم کہیں مر بھی

جس روز کسی اور پہ بیداد کرو گے — یہ یاد رہے ہم کو بہت یاد کرو گے

میر محمد تقی میرؔ

میر محمد تقی نام میرؔ تخلص تھا۔ ان کے والد میر محمد علی شرفا اکبر آباد سے تھے۔ میر بمقام آگرہ ۱۷۲۴ء میں پیدا ہوئے۔ دس سال کی عمر تھی کہ سایۂ پدری سر سے اٹھ گیا۔ آپ دہلی چلے آئے۔ یہاں ان کی بہن میر محمد حسین کلیم سے بیاہی تھیں۔ وہ اپنے بھائی کو بہت چاہتی تھیں۔ اور ان کے لحاظ سے کلیم کو بھی میرؔ سے محبت تھی۔ ان کے علاوہ خان آرزو بھی میرؔ کے رشتہ میں ماموں ہوتے تھے۔ میرؔ نے نکات الشعراء میں ان کا ذکر بہت

محبت اور ادب سے کیا ہے۔

خواجہ محمد ناصر عندلیب کے یہاں ہر مہینہ کی پندرہویں کو مشاعرہ ہوا کرتا تھا۔ میر بھی اس میں شریک ہوتے تھے۔ اور خواجہ میر درد سے بہت خلوص تھا۔ لیکن انقلابات زمانہ سے مشاعرہ کا یہ سلسلہ خواجہ میر درد کے یہاں درہم برہم ہوگیا اور پھر مشاعرہ ان کے ایما سے میر تقی کے یہاں ہونے لگا۔ خواجہ صاحب بھی اس میں شرکت فرمایا کرتے تھے۔

سلطنت کی تباہی میں میر بھی پریشان حال تھے۔ لیکن ثابت قدمی سے جمے بیٹھے تھے۔ آخر وہ زمانہ بھی آگیا کہ ناچار وطن کو خیرباد کہنا پڑا۔ لکھنؤ میں نواب آصف الدولہ کا دور دورہ تھا۔ میر صاحب نے لکھنؤ پہنچ کر ایک قصیدہ عالیہ لکھا۔ نواب صاحب نے ازراہ قدردانی تین سو روپیہ ماہوار مقرر کر دیا۔ جو مرتے دم تک ان کو ملتا رہا۔

آب حیات میں لکھا ہے کہ جب میر صاحب لکھنؤ پہنچے تو ایک سرائے میں قیام کیا۔ اس دن کہیں مشاعرہ تھا۔ اسی وقت غزل لکھی اور مشاعرہ میں شامل ہوئے۔ ان کی قدیمانہ وضع دیکھ کے لوگ ہنسنے لگے۔ میر بہت دل تنگ ہوئے اور ایک طرف بیٹھ گئے۔ جب شمع ان کے سامنے آئی تو بعض اصحاب نے پوچھا۔ حضور کا وطن کہاں ہے؟ میر صاحب نے یہ قطعہ فی البدیہہ کہہ کر غزل طرحی میں شامل کیا۔

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو
ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے

دلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب
رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے

اس کو فلک نے لوٹ کے ویران کر دیا
ہم رہنے والے ہیں اسی اُجڑے دیار کے

سب کو حال معلوم ہوا بہت معذرت کی اور میر صاحب سے عفو تقصیر چاہی۔ میر صاحب ۱۸۱۰ء میں فوت ہوئے۔ ناسخ نے تاریخ کہی۔ ع

واویلا مرد شہ شاعراں

مولانا محمد حسین آزاد نے آب حیات میں میر صاحب کی بد دماغی اور نازک مزاجی کو بہت بڑھا چڑھا کر بیان کیا ہے لیکن اس کی حقیقت سنے سنائے افسانوں سے زیادہ نہیں ہاں یہ ضرور ہے کہ آپ کے مزاج میں استغنا اور قناعت تھی۔ طبیعت کو درویشی کی لٹک اور تصوف کی چمک نے جلا دی تھی۔ اور یہ انکی ابتدائی تعلیم کا نتیجہ تھا۔ ان کے والد نے انھیں جو باتیں تعلیم کی تھیں وہ نکات الشعرا میں درج ہیں۔ ان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کو دنیا داری سے کچھ سروکار نہ تھا۔ آپ کے مزاج میں انصاف بھی کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ آپ عمدہ اشعار کی دل کھول کر داد دیتے تھے۔ اور صاحب کمال کے اصلی جوہر کو پرکھتے تھے۔ نہایت مہذب، زندہ دل، یار باش اور وضعدار آدمی تھے۔ میانہ قد۔ لاغر اندام۔ گندمی رنگ۔ ہر کام متانت اور آہستگی کے ساتھ کرتے تھے۔ بات کم کرتے تھے۔ اور وہ بھی آہستہ آواز میں۔ نرمی اور ملائمیت کے ساتھ۔ عادات و اطوار نہایت سنجیدہ اور متین۔ ہر وقت محویت کا عالم طاری۔ اپنے خیالات میں ڈوبے رہتے تھے۔

میر صاحب کی تصانیف میں چھٹہ دیوان ہیں۔ اس میں جملہ اصناف سخن مثلاً قصیدے، مثنویات، مراثی وغیرہ شامل ہیں۔ واسوخت آپ نے ایجاد کیا۔ چنانچہ دو واسوخت بھی آپ کے کلام میں شامل ہیں۔ علاوہ بریں ایک

کرہ "نکات الشعراء" فارسی میں لکھا ہے ۔

میر صاحب غزل کے بادشاہ ہیں۔ قصیدے کے مرد میدان نہیں، یہ سودا
حصہ ہے۔ اردو میں میر صاحب کو واسوخت کا موجد تسلیم کیا گیا ہے۔ اردو میں
ں قدر بڑے بڑے شعراء میر کے بعد ہوئے۔ ان سب نے میر کی استادی
ا اعتراف کیا ہے۔ ناسخ فرماتے ہیں۔ ؎

آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں

غالب بھی ناسخ کے ہمزبان ہے۔ ذوق فرماتے ہیں ؎

وا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب   ذوق یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

یہ حقیقت ہے کہ رنگ تغزل کو جس خوبی اور خوش اسلوبی سے میر نے برتا
ں کی مثال اردو باوجود اس ترقی کے اب تک پیش نہ کر سکی۔ سوز و گداز، تیزی
حت، صداقت، جذبات وغیرہ غزل کی خصوصیات ہیں۔ اور یہ خوبیاں کلام
ر میں بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں۔ عشق کی واردات کو اس حسن و صداقت
، بیان کرتے ہیں کہ تاثیر کی رو رگ و ریشہ میں دوڑ جاتی ہے۔ میر کے نشتر
رد و بہتر نشتر موجود ہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اگر الگ الگ اشخاص ان نشتروں
. انتخاب کریں تو بہت کم اشعار ایسے بچیں گے جو نشتر نہ ہوں۔

مثنوی میں میر کا رتبہ خاصا بلند ہے۔ اگرچہ میر حسن نے اس صنف کو
راج کمال پر پہنچایا۔ تاہم میر کی مثنویوں میں بھی سوز و گداز اور واردات
ق کی گرمی کم نہیں۔ البتہ ان سے منظر نگاری نہ نبھ سکی۔ یہ چیز میر حسن کے
ے میں آئی۔ میر کی مثنویاں چھوٹی ہیں اور ان میں ڈرامائی عنصر پایا

ا آتا ہے نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:-

تھا مستعار حسن سے اُس کے جو نور تھا
خورشید میں بھی اُس ہی کا ذرّہ ظہور تھا

ہنگامہ گرم کن جو دلِ ناصبور تھا
پیدا ہر ایک نالے سے شور و نشور تھا

پہنچا جو آپ کو تو میں پہنچا خدا کے تئیں
معلوم اب ہوا کہ بہت میں ہی دور تھا

آتش بلند دل کی نہ تھی ورنہ اے کلیم
اک شعلہ برق خرمنِ صد کوہ طور تھا

مجلس میں رات ایک ترے پرتوے بغیر
کیا شمع کیا پتنگ ہر اک بے حضور تھا

کل پاؤں ایک کاسۂ سر پر جو آ گیا
یکسر وہ استخوان شکستہ سے چور تھا

کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر
میں بھی کبھو کسو کا سر پُر غرور تھا

تھا وہ تو رشکِ حور بہشتی ہم ہی میں میر
سمجھے نہ ہم تو فہم کا اپنے قصور تھا

اُلٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اس بیماری دل نے آخر کام تمام کیا

عہد جوانی رو رو کاٹا پیری میں لیں آنکھیں موند
یعنی رات بہت تھے جاگے صبح ہوئی آرام کیا

حرف نہیں جاں بخشی میں اس کی خوبی اپنی قسمت کی
ہم سے جو پہلے کہہ بھیجا سو مرنے کا پیغام کیا

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
چاہتے ہیں جو آپ کرے ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

سارے رند اوباش جہاں کے تیرے سجود میں رہتے ہیں
بانکے ٹیڑھے ترچھے تیکھے سب کا تجھ کو امام کیا

کس کا کعبہ، کس کا قبلہ، کون حرم ہے کیا احرام
کوچے کے اس کے باشندوں نے سب کو یہیں سے سلام کیا

یاں کے سفید و سیاہ میں ہم کو دخل جو ہے سو اتنا ہے
رات کو رو رو صبح کیا یا دن کو جوں توں شام کیا

میر کے دین و مذہب کو اب پوچھتے کیا ہو اُن نے تو
قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا

خواجہ میر دردؔ علیہ الرحمۃ

سید خواجہ میر نام۔ درد تخلص۔ خواجہ محمد ناصر عندلیب کے خلف الرشید تھے۔

گیارہ واسطوں سے ان کا نسب خواجہ بہاء الدین نقشبندیؒ اور چھبیس واسطوں سے امام حسن عسکری علیہ السلام تک پہنچتا ہے۔ خواجہ میر ۱۷۲۱ء میں بمقام دہلی پیدا ہوئے۔ اور والد کے آغوشِ تربیت میں پرورش پائی۔ والد کی طرف سے شاعری اور استغنا وراثت میں پایا۔ بائیس سال کی عمر میں دنیا سے منہ موڑا اور والد کے سجادہ پر بیٹھ گئے۔

دہلی کا نقشہ بگڑا۔ امرا اور شرفا شہر چھوڑ چھوڑ کر دشت غربت میں گامزن ہوئے۔ اکثر شعراء نے فیض آباد، لکھنؤ کا رُخ کیا۔ مگر دردؔ کے پایۂ استقلال کو جنبش نہ ہوئی۔ اللہ پر توکل تھا اور جو سجادہ بزرگوں نے بچھایا تھا اس پر قناعت کا پہلو جمائے بیٹھے رہے۔

تصوف اور موسیقی میں بڑی مہارت تھی۔ شاعری کا شوق ابتدا سے تھا۔ ہر مہینے کی دوسری اور چوبیسویں تاریخ کو اپنے یہاں محفل سماع منعقد کیا کرتے تھے۔ اُن محفلوں میں علماء و مشائخ کے علاوہ شاہ عالم بادشاہ بھی شامل ہوا کرتے تھے۔ ہر مہینے کی پندرہویں تاریخ کو مشاعرہ بھی کیا کرتے تھے۔ میر تقی میرؔ سے دوستانہ تعلقات تھے۔

خواجہ صاحب نے ۱۱۹۹ھ میں رحلت فرمائی۔ دہلی میں ترکمان دروازہ سے باہر آپ کا مرقد زیارت گاہ خاص و عام ہے۔

خواجہ صاحب کی تصانیف تین ہیں۔ ایک اسرار الصلوٰۃ۔ رسالہ پندرہ برس کے سن میں تمکیل ہوا۔ دوسری تصنیف واردات درد انیس برس کی عمر میں تکمیل کو پہنچی۔ تیسری تصنیف دیوان اردو ہے۔ یہ سب تصانیف چھپ گئی ہیں۔

بحیثیت شاعر خواجہ صاحب کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ آپ کا دیوان مختصر ہے۔ بجز غزلیات و رباعیات اور کچھ نہیں۔ غزلیات بھی مختصر ہیں۔ سات یا نو اشعار سے زیادہ کوئی غزل نہیں۔ لیکن انتخاب۔ میر حسن فرماتے ہیں کہ "دیوانش اگرچہ مختصر است مثل کلام حافظ سراپا انتخاب" آزاد فرماتے ہیں کہ "خواجہ میر درد کی غزل سات شعر یا نو شعر کی ہوتی ہے مگر انتخاب ہوتی ہے۔ خصوصاً چھوٹی چھوٹی بحروں میں جو اکثر غزلیں کہتے ہیں گویا تلواروں کی آبداری نشتر میں بھر دیتے ہیں۔ خیالات اُن کے سنجیدہ اور متین تھے کسی کی ہجو میں زبان آلودہ نہیں ہوئی۔ تصوف جیسا انھوں نے

کہا اُردو میں آج تک کسی سے نہیں ہوا۔

خواجہ صاحب کے کلام کی تنقید اس سے بہتر نہیں ہو سکتی۔ ہم البتہ اس قدر کہنے کی جرأت اور کرتے ہیں کہ جہاں تک غزلیات کا تعلق ہے۔ خواجہ صاحب کا کلام میر و سودا سے کسی طرح کم رُتبہ نہیں بلکہ تصوف اور اخلاق کی چاشنی کے اعتبار سے کلام میر و مرزا سے زیادہ دل آویز ہے۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

مدرسہ یا دیر تھا یا کعبہ یا بتخانہ تھا — ہم سبھی مہماں تھے یاں اِک تو ہی صاحب خانہ تھا
وائے نادانی کہ وقتِ مرگ یہ ثابت ہوا — خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا
حیف کہتے ہیں ہوا گلزار تاراجِ خزاں — آشنا اپنا بھی واں اِک سبزۂ بیگانہ تھا
ہو گیا مہماں سرائے کثرتِ موہوم آہ — وہ دلِ خالی کہ تیرا خاص خلوت خانہ تھا
بھول جا خوش رہ عبث مت سابقے کو یاد کر — درد یہ مذکور کیا ہے آشنا تھا یا نہ تھا

تجھی کو جو یاں جلوہ فرما نہ دیکھا — برابر ہے دنیا کو دیکھا نہ دیکھا
مرا غنچۂ دل ہے وہ دل گرفتہ — کہ جس کو کسو نے کبھو وا نہ دیکھا
یگانہ ہے تو آہ بیگانگی میں — کوئی دوسرا اور ایسا نہ دیکھا
اذیت، مصیبت، ملامت، بلائیں — ترے عشق میں ہم نے کیا کیا نہ دیکھا
کیا مجھ کو داغوں نے سروِ چراغاں — کبھو تو نے آکر تماشا نہ دیکھا
تغافل نے تیرے یہ کچھ دن دکھائے — اِدھر تو نے لیکن نہ دیکھا نہ دیکھا
حجابِ رخِ یار تھے آپ ہی ہم — کھلی آنکھ جب کوئی پردا نہ دیکھا

شب و روز اے درد درپے ہو اُس کے
کسو نے جسے یاں نہ سمجھا نہ دیکھا

میر غلام حسن حسنؔ

میر غلام حسن نام۔ حسنؔ تخلص۔ میر غلام حسین ضاحکؔ کے بیٹے تھے۔ بمقام دہلی ۱۷۳۶ء میں پیدا ہوئے۔ بارہ برس کے سن میں والد کے ہمراہ فیض آباد آ گئے۔ کچھ دنوں بعد لکھنؤ پہنچے۔ اور وہیں رہے۔

پہلے اپنے والد سے اصلاح لیتے تھے۔ لیکن لکھنؤ پہنچ کر میر ضیاء الدین ضیاؔ کے شاگرد ہوئے۔ اُن کا رنگ جب موافق طبع نہ پڑا تو خواجہ دردؔ میر تقی میرؔ اور سوداؔ کا تتبع کیا۔

حسنؔ ۱۷۸۶ء میں اس جہان فانی سے رخصت ہوئے۔ مصحفیؔ نے "شاعر شیریں زبان" سے تاریخ نکالی۔

آپ کی تصانیف میں ایک دیوان۔ متعدد مثنویاں اور ایک تذکرہ شعرائے اردو بزبان فارسی ہے۔

غزل میں حسنؔ کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ دردؔ کے تتبع سے کلام میں تصوف اور روحانیت کی چاشنی پیدا ہو گئی ہے۔ سوز و گداز بھی کم نہیں۔ صفائی اور محاورے کا لطف عام طور پر آپ کے کلام میں پایا جاتا ہے۔ دیوان میں قصائد بھی ہیں۔ لیکن رتبہ میں غزلوں سے بہت کم ہیں۔

حسنؔ نے کُل گیارہ مثنویاں لکھیں۔ جن میں "گلزار ارم" "رموز العارفین" "سحر البیان" زیادہ مشہور ہیں۔ اور ان میں بھی "سحر البیان" کو جو شہرت حاصل ہوئی وہ آج تک کسی مثنوی کو نصیب نہیں ہوئی۔ اس کی شہرت اور مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ وہ حسنؔ کے باقی کلام پر چھا گئی ہے اور اب میر حسنؔ

مصنف سحرالبیان کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ غزل گو کی حیثیت سے اُن کی شہرت نہیں۔

مثنوی سحرالبیان میں بے نظیر اور بدرِ منیر کا قصہ نظم ہوا ہے۔ قصہ بھی شاعر ہی کے حُسنِ تخیل کی ایجاد ہے۔ قصہ کی دلآویزی مثنوی کی شہرت کا باعث نہیں۔ اس کی شہرت کا راز اس کی سحر بیانی ہے۔ سادگی، صفائی اور برجستگی جو ہر عمدہ نظم کے لوازمات ہیں، اس میں بدرجہ اتم پائے جاتے ہیں۔ اوّل تو بحر بہت رواں اختیار کی ہے۔ اس پر بیان اور طرزِ ادا کی رنگینی نے شگفتگی پیدا کر دی ہے۔ زبان ایسی صاف اور شُستہ استعمال ہوئی ہے کہ آج کل کی زبان سے زیادہ قدیم نہیں معلوم ہوتی۔ ان خوبیوں کے ساتھ جب جذبات نگاری، کردار نگاری، منظر نگاری، مصوری، واقعہ بندی کو دیکھا جائے تو یہ مثنوی ادبی حیثیت سے اور بھی بلند ہو جاتی ہے۔ یہ مثنوی مقامی حالات، وقتی کیفیات، رسم ورواج اور طریقۂ بود و باش کو نمایاں کرتی ہے۔ مثنوی چھپ چکی ہے۔ اور ہر جگہ دستیاب ہوتی ہے۔ اور آج بھی اسی ذوق و شوق سے پڑھی جاتی ہے۔

غزلیات سے چند اشعار بطور نمونہ پیش کئے جاتے ہیں۔

حسن تجھ کو کیا رات غم تھا کسی کا ۔۔۔ نہ رکتی تھیں آہیں نہ تھمتے تھے آنسو

برپا ہوئی اک مجھ پہ قیامت تو یہیں اور ۔۔۔ میں حشر کو کیا روؤں کہ اٹھ جانے سے تیرے

بس آج کی شب بھی سو چکے تم ۔۔۔ پھر چھیڑا حسن نے اپنا قصہ

کھڑا اُس پہ میں جان وارا کیا ۔۔۔ وہ جب تک کہ زلفیں سنوارا کیا

ابھی دل کو لے کر گیا ہے آہ — وہ چلتا رہا میں پکارا کیا
قمار محبت میں بازی سدا — وہ جیتا کیا اور میں ہارا کیا

کیا قتل اور جان بخشی بھی کی تو
حسن اس نے احساں دوبارہ کیا

عیش و وصال و صحبتِ یاراں فراغ دل — اس ایک جان کے لئے کیا کیا نہ چاہئے
اظہار خموشی میں ہے سو طرح کی فریاد — ظاہر کا یہ پردہ ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

سید محمد میر سوز سید محمد میر نام۔ سوز تخلص۔ میر ضیاء الدین کے بیٹے تھے۔ ۱۷۲۰ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ اور وہیں تعلیم و تربیت پائی۔ شاہ عالم کے عہد میں جب دلی پر تباہی آئی تو سوز نے فرخ آباد کا رخ کیا اور وہاں نواب مہربان خاں رند کی سرکار میں کچھ دنوں زندگی بسر کی۔ اس کے بعد لکھنؤ پہنچے مگر رنگ نہ جما۔ مرشد آباد کا قصد کیا۔ لیکن وہاں بھی قسمت نے یاوری نہ کی۔ پھر لکھنؤ واپس آئے۔ اس مرتبہ تقدیر نے زور کیا۔ نواب آصف الدولہ ان کے شاگرد ہوگئے۔ چند روز آرام سے نہ گزرے تھے کہ ۱۷۹۹ء میں سفر آخرت پیش آیا۔

میر سوز کی علمی قابلیت لوازمات شاعری کو نبھانے کے لئے کافی تھی۔ خط شفیعہ اور نستعلیق خوب لکھتے تھے۔ ورزش بھی کیا کرتے تھے اور فن شہسواری اور سپاہ گری و تیر اندازی میں ماہر و مشاق تھے۔

ابتداءً میر تخلص کرتے تھے۔ لیکن میر تقی میر کی عالمگیر شہرت کے مقابلے میں میر کو بے فروغ پاکر سوز تخلص اختیار کیا۔

میر سوز کی زبان غزل کے لئے خاص طور پر موزوں ہے یعنی صاف، سادہ اور شیریں۔ کلام تصنع اور تکلف سے قطعی پاک ہے۔ روزمرّہ اور محاورہ کو نہایت خوبی اور سادگی سے نظم کرتے ہیں۔ فارسی، اضافت، تشبیہ واستعارہ و تراکیب بہت کم بلکہ نہ ہونے کے برابر ہیں۔ خیالات سیدھے سادے بلکہ روزمرّہ کی باتیں ہیں۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مخاطب سے میٹھے باتیں کررہے ہیں۔ معشوق کو فقط جان یا میاں یا میاں جان کہہ کر خطاب کرنا ان کا خاص محاورہ ہے۔ مضمون جیسے سیدھے سادے ہوتے ہیں ویسے ہی آسان آسان طرحیں بھی لی ہیں۔ ردیف چھوڑ کر اکثر قافیہ ہی پر اکتفا کرتے ہیں۔ پڑھنے کا طریقہ بھی وہ ایجاد کیا تھا کہ پڑھتے وقت خود مضمون کی تصویر بن جاتے تھے۔ آواز میں درد تھا اور پھر اس کا اداکاری سے شعر عجب مزا دیتا تھا۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو۔

بھلا رے عشق تیری شان وشوکت — بھائی میرے تو اڑ گئے اوسان
ایک ڈر تھا کہ جی بچے نہ بچے — دوسرے غم نے کھائی میری جان
بس غمِ یار ایک دن دو دن — اس سے زیادہ نہ ہو جیو مہمان
نہ کر بیٹھے ہو پاؤں پھیلا کر — اپنے گھر جاؤ خانہ آبادان
عارضی حسن پر نہ ہو مغرور — میرے پیارے یہ گو ہے یہ میدان
پھر ہے نے زلف وخال زیرِ زلف — چار دن تو بھی کھیل لے چوگان

اور تو اور کہہ کے دو باتیں
سوز کہلایا صاحبِ دیواں

دل ایماں سوز کہتے ہیں کہ کافر ہو گیا　　آہ یارب رازِ دل اُن پر بھی ظاہر ہو گیا

سوزؔ کیوں آیا عدم کو چھوڑ کر دنیا میں تو　　واں تجھے کیا تھی کمی یاں تجھ کو کیا درکار تھا

اور تو بس نہیں چلتا ہے رقیبوں کا مگر　　سوزؔ کے نام کو لکھ لکھ کے جلا دیتے ہیں

اس عہد کے دیگر خوش فکر شاعر

نواب انعام اللہ خاں انعام اللہ خاں نام اور یقینؔ تخلص۔ دہلی کے رہنے والے تھے اور حضرت مرزا مظہر جانِ جاناں سے اصلاح سخن لیتے تھے۔ تئیس سال کی عمر میں ۱۱۶۹ھ (۱۷۵۵ء) میں اپنے والد کے ہاتھ سے قتل ہوئے۔ صاحب دیوان تھے۔ حال ہی میں مرزا فرحت اللہ بیگ نے آپ کا دیوان حیدرآباد سے شائع کیا ہے۔

یقینؔ کی زبان نہایت صاف اور شستہ ہے۔ دیوان میں کُل ایک سو ستّرہ غزلیں ہیں اور سب پانچ پانچ شعر کی ہیں اور کلام کا وہی رنگ ہے جو اُن کے استاد مرزا مظہر کا ہے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:-

ہر گھڑی صحرا نشینی پر نہ کر جرأت یقینؔ　　آ گئی تھی راس مجنوں کو بیاباں کی ہوا

تری اُلفت سے مرنا خوش نہیں آتا مجھے ورنہ
یہ ایسا کار آساں اس قدر دشوار کیوں ہوتا

کعبہ سے ہم گئے نہ گیا پر بتوں کا عشق　　اس درد کی خدا کے بھی گھر میں دوا نہیں

عشق میں ملتی نہیں راحت مگر جوں کوہکن　　جان شیریں دیجئے تب خوابِ شیریں کیجئے

میر محمدی بیدار میر محمدی نام۔ بیدار تخلص تھا۔ مگر شہرت میر محمدی کے نام سے ہوئی۔ دہلی کے رہنے والے تھے۔ وہیں نشو و نما بھی ہوا۔ حضرت خواجہ میر درد کے شاگرد تھے۔ طریقۂ چشتیہ کے اذکار و اشغال کی ورزش کرنے کے بعد خرقۂ خلافت پہنا۔ آخر عمر میں آگرہ جا بسے تھے۔ وہیں ۱۷۹۶ء میں راہی ملک بقا ہوئے۔ جب میر و مرزا نے رعایت لفظی کے ناپسندیدہ رنگ کو ترک کیا تو بیدار نے بھی اس میں کوشش کی اور صفائی کے ساتھ تصوف کا رنگ بقدر مناسب شامل کرکے اپنے طرز کلام کو علیحدہ کر لیا۔ نمونۂ کلام یہ ہے:۔

اک میں ہی غمزدہ ہوں کہ ناشاد رہ گیا ۔۔۔ کس کس کا دل نہ شاد کیا تو نے اے فلک

صحرا میں قیس کوہ میں فرہاد رہ گیا ۔۔۔ بیدار راہ عشق کسی سے نہ طے ہوئی

اے نالۂ جاں سوز یہ کیا بے اثری ہے ۔۔۔ اب تک مرے احوال سے وہ بے خبری ہے

محو خیال یار رہے ہم جہاں رہے ۔۔۔ نے سجدہ سے کام نہ مطلب حرم سے تھا

تبصرہ

زبان یہ زریں دور زبان کی ترقی کے لئے خاص طور پر ممتاز ہے۔ میر درد اور سوز نے زبان کی صفائی کی ایسی کامیاب کوشش کی کہ نظم اردو ان حضرات کے بار احسان سے کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتی۔ سودا نے فارسی کی لطیف اور نفیس تراکیب سے اردو میں وسعت پیدا کی۔ ایرانی محاوروں کو کہیں ترجمہ کرکے کہیں تصرف کی مدد سے اردو میں

اس طرح کھپایا کہ جزو زبان بن گئے۔ ان ہندی الفاظ سے جو بدنما اور ثقیل تھے
دامن اردو کو پاک کیا اسی دور میں زبان کی ترقی کے لئے مشاعرے منعقد
ہوتے۔ چنانچہ اوپر گذر چکا ہے کہ پہلے دردؔ کے یہاں اور پھر میرؔ کے یہاں
مشاعرہ ہوا کرتا تھا۔ ان مشاعروں میں خاص طور پر زبان کی جانچ پرتال
اور دیکھ بھال ہوا کرتی تھی ۔

موضوع سخن اس دور کو اگر صوفیانہ دور کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔
اکثر و بیشتر شعرا علمی یا اعتقادی طور پر صوفی اور بزرگ
تھے۔ حضرت مظہرؒ۔ میر صاحب۔ بیدار یہاں تک کہ سوداؔ کے کلام میں بھی تصوف
اور اخلاق کی چاشنی بڑا مزہ دیتی ہے۔ ان کے علاوہ خواجہ دردؔ نے تو اپنے
کلام کی بنیاد ہی تصوّف اور اخلاق پر رکھی۔ اور سادگیٔ بیان کے ساتھ
وہ صوفیانہ اور اخلاقی مضامین نظم کئے کہ باید و شاید ۔

اصنافِ سخن اس دور میں غزل معراج کمال پر پہنچی۔ اور گوناگوں
اسلوب بیان غزل میں اضافہ ہوئے۔ سوز و گداز جو
غزل کی جان ہے اس دور کے ساتھ مخصوص ہے۔ ہر آئندہ آنے والے
دور نے اس دور کی غزل کے روبرو سر تسلیم خم کیا ہے۔ اور حقیقت ہے کہ
صفائی، سادگی، جوش و صداقت بیان۔ رنگینی جذبات۔ سوز و گداز اور
اثر جس قدر اس دور نے غزلیات میں بھرا آج تک نصیب نہ ہوا اور نہ آئندہ
امید کیونکہ نہ وہ سادگی رہی نہ صفائی۔ وہ عشق رہا نہ وہ رنگینیٔ حسن اور اگر
ہو بھی تو وہ شیرینیٔ زبان کہاں ۔

قصیدے کے لئے بھی اِس دور کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ سوداؔ نے
اس زمین کو اس قدر بلند کیا کہ فارسی قصیدے کے ہم رُتبہ کر دیا۔ آیندہ
ادوار میں بجز چند شعراء کے کوئی سوداؔ کو نہ پہنچ سکا۔
مثنوی بھی اِس دور میں خوب پھلی۔ میرؔ نے بھی لکھی اور سوداؔ نے بھی۔
مگر میر حسنؔ نے کمال کر دیا اور سحر البیان میں وہ سحر بیانی کی کہ آج تک
اس کا جواب تو ایک طرف اس کا عشرِ عشیر بھی کسی مثنوی نے پیش نہ کیا۔
واسوخت اسی عہد میں ایجاد ہوا۔ اور میرؔ اس کے موجد ٹھہرے۔ ہجو نے
بھی اِس دور میں فروغ پایا۔ کاش اِس دور کے دامن میں یہ خار نہ ہوتے۔

اُسلوب بیان موضوعِ سخن اور اصنافِ سخن کے عنوانات سے جو خصوصیات
اس دور کی بیان ہوئیں وہی اسلوب بیان کی خصوصیات
ہو سکتی ہیں۔ لیکن سب سے زیادہ اہم خصوصیت اِس دور کی یہ ہے کہ اُردو
شاعری کی جبین سے ایہام کا داغ مٹ گیا۔ حضرت مظہرؔ پہلے بزرگ
ہیں جنھوں نے اس تکلف کو ترک کر کے شعراء کے لئے راستہ صاف کیا
اور ایک زبردست رُکاوٹ کو ہٹا دیا۔ سوداؔ نے تشبیہ و استعارہ برتا
لیکن ایسا جیسے آٹے میں نمک۔ زیادہ تر اشعار ایسے لکھے گئے کہ خواہ
انھیں حقیقت کی طرف لے جاؤ خواہ مجاز کی طرف۔ مدعا یہ کہ غزلیات میں
جذبات نگاری ہے۔ خارجی اور صنفی حسن کی عُریاں تعریف و توصیف
نہیں اور اس کی وجہ ہے۔ جس کے بیان کا یہ موقع نہیں۔ انشاءاللہ
آیندہ موقع و محل پر بیان ہو گی۔

مرثیہ اس دور میں مرثیہ بھی لکھا گیا۔ لیکن مرثیہ کے لئے ایک علیحدہ باب کا انتظار کیجئے۔

باب ۵

اُردو شعر و شاعری کا تیسرا دور

شیخ قلندر بخش جراَت

قلندر بخش نام۔ جراَت تخلص۔ حافظ امان کے بیٹے۔ دلی کے رہنے والے تھے۔ لیکن نشو ونما فیض آباد میں ہوا۔ ان کے بزرگ دربار شاہی میں دربانی کی خدمت رکھتے تھے۔ لیکن جراَت نے ترقی کرکے اقلیم سخن کی بادشاہت حاصل کی۔ جوانی میں بینائی سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ لیکن عشق سخن جاری رہا۔ فیض آباد سے لکھنؤ پہنچے اور مرزا سلیمان شکوہ کے دربار میں رسائی حاصل کی۔ آخر ۱۸۱۰ء میں وہیں پیوند خاک ہوئے۔

جراَت جعفر علی خاں حسرت کے شاگرد تھے۔ موسیقی اور ستار بجانے میں بھی کامل تھے۔ اپنے زمانے میں بذلہ سنج اور لطیفہ گو مشہور تھے۔ انشاء اور ان کی صحبتیں خوب گرم رہتی تھیں۔

جراَت کا دیوان چھپ چکا ہے۔ اس میں غزلیں، رباعیاں مخمس، مستزاد، واسوخت، ہجویں وغیرہ اصناف شامل ہیں۔ جراَت اپنے رنگ کے باکمال شاعر ہیں۔ ان کی شاعری کی سطح بلند نہیں۔ باتیں ہی باتیں ہیں۔

نہ کلام میں عُمق ہے نہ خیالات میں بلند پروازی۔ عشق و محبت کی سیدھی سادی واردات ہیں۔ لیکن عشق بھی بلند قسم کا نہیں لیکن اگر بجائے عشق کے ہوس کہا جائے تو بجا ہے۔ لیکن زبان نہایت صاف اور سادہ پائی ہے۔ محاورہ کا لطف بھی ہر جگہ موجود ہے۔ ان کے یہاں مسلسل غزلیں بھی پائی جاتی ہیں۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:-

لگ جا گلے سے تاب اب اے نازنیں نہیں
ہے ہے خدا کے واسطے مت کر نہیں نہیں

کیا رک کے وہ کہے جو ٹک اس سے لگ چلوں
بس بس پرے ہو شوق یہ اپنے تئیں نہیں

پہلو میں کیا کہوں جگر و دل کا کیا ہے رنگ
کس روز اشک خوں سے تر آستیں نہیں

فرصت جو پا کے کہئے کبھو درد دل سو ہائے
وہ بدگماں کہے ہے کہ ہم کو یقیں نہیں

آتش سی پھک رہی ہے مرے تن بدن میں آگ
جب سے کہ روبرو وہ رُخِ آتشیں نہیں

اس بن جہان کچھ نظر آتا ہے اور ہی
گویا وہ آسماں نہیں وہ زمیں نہیں

کیا جانے کیا وہ اِس میں ہے لوٹے ہے جس پہ دل
یوں اور کیا جہاں میں کوئی حسیں نہیں

سُنتا ہے کون کس سے کہوں دردِ بیکسی
ہم دم نہیں ہے کوئی مرا ہم نشیں نہیں
ہر چند ہے یہ لطف شبِ ماہ سیرِ باغ
اندھیر پر یہی ہے کہ وہ مہ جبیں نہیں
آنکھوں کی راہ نکلے ہے کیا حسرتوں سے جی
وہ روبرو جو اپنے دمِ واپسیں نہیں
طوفان گریہ کیا کہیں کس وقت ہم نشیں
موجِ سرشک تا فلکِ ہفتمیں نہیں
حیرت ہے مجھ کو کیونکہ وہ جرأت ہے چین سے
جس بن قرار جی کو ہمارے کہیں نہیں

میر انشاء اللہ خاں انشا

میر انشاء اللہ خاں نام انشا تخلص۔ میر ماشاء اللہ خاں کے بیٹے تھے۔ آپ کی ولادت کا فخر مرشد آباد کو حاصل ہے۔ میر ماشاء اللہ خاں حکیم اور شاعر ہونے کے علاوہ عالم و فاضل بھی تھے۔ چنانچہ میر انشاء اللہ خاں کی تعلیم و تربیت اپنے ہاتھوں میں لی۔ انشا خود بلا کے ذہین اور ذکی تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عربی و فارسی میں استعداد کامل پیدا کی۔ فن طبابت خاندانی طرۂ امتیاز تھا۔ اسے بھی حاصل کیا۔ اور آخر میں شاعری کی طرف متوجہ ہوئے۔ عربی، فارسی اور اُردو تینوں زبانوں میں طبع آزمائی کی۔ اُردو میں خصوصاً وہ کمال پیدا کیا کہ آسمان شاعری پر مہر و ماہ ہو کر چمکے۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ سلطنت مغلیہ بساط کی تھی اور بادشاہ شطرنج سے
زیادہ حیثیت نہیں رکھتا تھا انشا اسی عہد میں دہلی گئے۔ شاہ عالم ثانی
نے قدردانی کی۔ یہ دربار میں داخل ہوئے اور چند روز اپنی زورِ طبیعت
اور شگفتہ مزاجی کا ڈنکا بجایا۔ لیکن جب خزانہ کو خالی پایا تو دربار سے جی
اُچاٹ ہوا۔ دلی چھوڑ کر لکھنؤ کا رُخ کیا اور مرزا سلیمان شکوہ کے دربار میں
رسائی پیدا کی۔ سلیمان شکوہ شاہ عالم ثانی کے بیٹے تھے۔ انھوں نے باپ کا
نمک خوار سمجھ کر اور کچھ اُن کی بذلہ سنجی اور لطیفہ گوئی کی وجہ سے انکی سرپرستی
کی۔ اور اپنی غزلیں اصلاح کے لئے اُنھیں دینے لگے۔ لیکن ان کی فطرت
سیماب پا نے قناعت سے بیٹھنے نہ دیا اور نواب سعادت علی خاں کے
دربار میں پہنچا دیا۔ اب انشا کا ستارۂ اقبال چمکا اور نواب کے مزاج میں
وہ دخل پایا کہ نواب کو ان کے سوا کسی کی بات میں مزہ ہی نہ آتا تھا لیکن
ہر بات کی ایک حد ہوتی ہے خصوصاً بذلہ سنجی۔ لطیفہ گوئی اور شوخیٔ طبع اگر
حد سے تجاوز کر جائے تو باعث ملال ہو جاتی ہے۔ نواب صاحب فطرۃً
متین اور سنجیدہ مزاج تھے۔ انشا، کے مزاج میں تمسخر تھا۔ اس وجہ سے نواب
کے ساتھ زیادہ دن تک نہ بن سکی۔ ۱۲۲۵ھ (سنہ ۱۸۱۰ء) میں اقبال نے منہ
موڑا اور یہ دربار کا چہچہاتا ہوا بلبل اپنے مکان کے قفس میں بند کر دیا گیا۔
آزاد نے آبِ حیات میں انشاء کے مجنوں ہو جانے اور ایڑیاں
رگڑ رگڑ کر مرنے کی بڑی دردانگیز تصویر کھینچی ہے۔ اگرچہ بے ثباتیٔ دنیا
اور انقلاباتِ زمانہ سے کچھ بعید نہیں۔ لیکن اس تصویر کی تیاری میں حضرت

آزاد کی جادو طرازی نے خاص طور سے رنگ آمیزیاں کی ہیں" حیات دبیر" کے مصنف نے مرزا اوج کی زبانی لکھا ہے جو انشا کے نواسے تھے کہ انشار نہ مجنون ہوئے نہ ان کی تنخواہ بند ہوئی۔ صرف اتنا صحیح ہے کہ نواب صاحب نے حکم دے دیا تھا کہ سوائے دربار کے اور کہیں نہ آئیں جائیں اور دربار میں بھی اس وقت حاضر ہوں جب بلایا جائے۔ چنانچہ انشا نے اسی حبس بیجا کی طرف اشارہ کیا ہے۔

بدوں حکم وزیر الممالک اے آغا چساں کنم حرکت نوکری ست یا بازی

آخر اسی حالت میں ١٨٧٧ء میں قید حاکم کے ساتھ قید حیات سے آزاد ہوئے۔ انشا کے علم و فضل، ذہن و ذکاوت، مشق سخن اور زور کلام میں کسی شک و گمان کو دخل نہیں۔ کلیات چھپ چکا ہے۔ اس میں کیا کیا کچھ نہیں ہے۔ دیوان فارسی کے علاوہ قصیدے، غزلیں، خطوط منظوم، رباعیاں، پہیلیاں، چیستانیں، ہجویں اور چھوٹی چھوٹی مثنویاں وغیرہ سبھی کچھ موجود ہیں۔ اردو فارسی کے علاوہ پنجابی، پوربی، بھاشا، مرہٹی، کشمیری وغیرہ زبانوں کو بے ساختہ استعمال کر کے اپنی طبیعت کی ہمہ گیری کا ثبوت دیا ہے۔ لیکن افسوس کہ ان کی شاعری کو مسخرے نے ڈبویا۔ ان کی شوخ اور چنچل طبیعت انھیں کسی جگہ جم کر بیٹھنے نہیں دیتی۔ ابھی مہنت بنے بیٹھے ہیں۔ ابھی آزادوں کے انداز میں مستزاد کہہ رہے ہیں۔ کہیں ہجو کے کانٹوں میں الجھے ہوئے ہیں۔ کہیں لطافت و ظرافت کے زور میں طبیعت کو بے لگام چھوڑ دیا ہے۔ مدعا یہ کہ انشا، ساقی در لکلام اگر اپنی طبیعت پر قابو رکھتا تو زبان اردو کے لئے

خصوصاً اور ملک کے لئے عموماً بڑا مفید ثابت ہوتا۔

کلیات کے علاوہ انشا نے ایک کتاب "دریائے لطافت" بھی لکھی جو ۱۸۰۷ء میں تکمیل کو پہنچی۔ یہ اردو قواعد کی پہلی کتاب ہے۔ اگرچہ فارسی میں لکھی گئی ہے لیکن جابجا اردو اشعار اور نثر کے ٹکڑے اس میں درج کئے ہیں۔ اسکے علاوہ "رانی کیتکی" کی کہانی خالص اردو میں لکھی ہے۔ یعنی عربی اور فارسی الفاظ کو اس میں دخل نہیں تاہم فصاحت روزمرہ اور محاورہ سے گری ہوئی نہیں ہے۔ قصیدوں میں انگریزی الفاظ کو نہایت بے ساختگی سے استعمال کیا ہے۔ جن میں اکثر الفاظ آج ہماری زبان پر گھل مل گئے ہیں۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:-

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں
بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

تصور عرش پر ہے اور سر ہے پائے ساقی پر
غرض کچھ اور دھن میں اس گھڑی میخوار بیٹھے ہیں

بسانِ نقشِ پائے رہرواں کوئے تمنا میں
نہیں اٹھنے کی طاقت کیا کریں لاچار بیٹھے ہیں

یہ اپنی چال ہے افتادگی سے اب کہ پہروں تک
نظر آیا جہاں پر سایۂ دیوار بیٹھے ہیں

یہاں صبر و تحمل آہ ننگ و نام کیا شے ہے
میاں رو پیٹ کر ان سب کو ہم بیکار بیٹھے ہیں

نجیبوں کا عجب کچھ حال ہے اس دور میں یارو
جہاں پوچھو یہی کہتے ہیں ہم بیکار بیٹھے ہیں

بھلا گردش فلک کی چین دیتی ہے کسے انشا
غنیمت ہے کہ ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں

لگا کے برف میں ساقی صراحی مے لا — جگر کی آگ بجھے جس سے جلد وہ شے لا
قدم کو ہاتھ لگاتا ہوں اٹھ کہیں گھر چل — خدا کے واسطے اتنے تو پاؤں مت پھیلا
نکل کے وادیٔ وحشت سے دیکھ اے مجنوں — کہ زور دھوم سے آتا ہے ناقہ لیلا
گرا جو ہاتھ سے فرہاد کے کہیں تیشہ — درون کوہ سے نکلی صدائے واویلا

نزاکت اس گل رعنا کی دیکھیو انشا
نسیم صبح جو چھو جائے رنگ ہو میلا

شیخ غلام ہمدانی مصحفی

غلام ہمدانی نام مصحفی تخلص۔ شیخ ولی محمد کے بیٹے۔ ۱۷۵۰ء میں بمقام امروہہ پیدا ہوئے۔ اور عنفوان شباب میں دہلی آئے۔ طبیعت میں موزونیت خداداد تھی۔ علوم متداولہ سے فارغ ہو کر شعر و سخن کی طرف مائل ہوئے۔ بزرگان دہلی کی صحبتوں نے مذاق شاعری درست اور کثرت مشق نے بزم شعراء میں چرچا کیا۔ جب تک دہلی میں رہے اپنے گھر پر مشاعرہ کیا کرتے تھے۔ مزاج میں غربت، مسکینی اور ادب کی پابندی تھی۔ اس وجہ سے سب شعراء اور

معزز اشخاص لطف و مروت سے پیش آتے تھے۔ انہیں بھی دہلی اور اہل دہلی سے اس قدر محبت تھی کہ دہلی ہی کو اپنا وطن بنایا اور مرتے دم تک اس کی محبت دل میں رہی۔

جب دہلی تباہ ہوئی اور اہل کمال کا مجمع منتشر ہوا۔ مصحفی نے بھی بادل ناخواستہ دہلی کو خیرباد کہا۔ چند روز ٹانڈہ میں نہایت فارغ البالی کے ساتھ رہے۔ اس کے بعد لکھنؤ پہنچے۔ لیکن قسمت نے کچھ یاوری نہ کی۔ ناچار دہلی واپس آئے۔ مگر کچھ دنوں کے بعد کشش آب ودانہ پھر انھیں لکھنؤ لے گئی۔ اس مرتبہ مرزا سلیمان شکوہ کے سرکار میں ملازم ہوگئے۔ مرزا سلیمان شکوہ نے انھیں اپنا استاد بنایا۔ رفتہ رفتہ مصحفی جگت استاد ہو گئے۔

دوران قیام لکھنؤ میں مصحفی اور انشا کے خوب معرکے ہوئے۔ یہ معرکے شاعرانہ تعریضوں سے شروع ہوکر ہجوؤں تک نوبت پہنچی اور آخر میں تو یہ حال ہوگیا کہ ابتذال اور رکاکت پر تہذیب اور شائستگی نے آنکھیں بند کرلیں۔

مصحفی کو مرزا سلیمان کی شکوہ کی سرکار سے صرف پچیس ۲۵ روپئے ماہوار ملتے تھے۔ جب میر انشاء اللہ خاں کو باریابی ہوئی اور وہ شاہزادہ کی غزلیں بنانے لگے تو ان پچیس روپیوں میں بھی تخفیف ہوگئی۔ خود فرماتے ہیں۔ ع اے وائے کہ پچیس سے اب پانچ ہیں اپنے

غرض اس افلاس میں گذرا وقات کے لئے غزلیں اور اشعار بیچتے تھے

اور صبر و شکر کے ساتھ زندگی کے ایام بسر کرتے تھے۔ آخر اسی حالت میں ۱۸۲۴ء میں داعیِ اجل کو لبیک کہا۔

مصحفی نے آٹھ دیوان اپنی یادگار چھوڑے جو آپ کی استادی اور قادر الکلامی کو مسلم کرتے ہیں۔ ان کے علاوہ تذکرۂ شعرائے اُردو بزبان فارسی لکھا۔ اس میں محمد شاہی عہد کے مصحفی سے معاصرین تک کُل شعرا کا حال درج ہے۔

"آبِ حیات" میں مولانا آزاد نے جابجا سید انشا کو مصحفی پر ترجیح دی ہے۔ مگر اب وہ زمانہ نہیں رہا۔ اب ہمارے روبرو کلیات انشا اور دواوین مصحفی موجود ہیں۔ انشا کی ذہانت، طباعی، بذلہ سنجی اور ظرافت میں جائے کلام نہیں علم و فضل بھی مسلم ہے۔ لیکن سخن سنجی، مشاقی اور متانت میں مصحفی سید صاحب سے بہت آگے ہیں۔ اگر مصحفی کے آٹھ دیوانوں میں سے بلند مرتبہ اور معیاری اشعار انتخاب کئے جائیں تو سید صاحب کے مجموعہ ہزل و غزل کے برابر ایک مجموعہ ان کے منتخب اشعار کا تیار ہو سکتا ہے۔ علاوہ بریں مصحفی کی استادی، مشاقی اور ہر دل عزیزی کا ایک زندہ ثبوت یہ بھی ہے کہ خواجہ حیدر علی آتش، میر مستحسن خلیق، میر مظفر حسین ضمیر، میر مظفر علی اثر جو اپنے وقت میں مسلم الثبوت اُستاد ہوئے۔ ان ہی کے دامنِ تربیت میں پل کر جوان ہوئے تھے۔ مصحفی کا کلام اِس امر کا متقاضی ہے کہ انھیں اُردو شعر و شاعری کے عہدِ زریں یعنی دورِ دوم میں جگہ دی جائے۔ کیونکہ جہاں ان کے کلام میں میر کا سا درد، سودا کا سا زور اور میر سوز کی سی سادگی پائی جاتی ہے وہاں خیالات میں متانت اور طرزِ ادا میں استواری بھی ہے۔ زبان پر بھی بہت سے

قدیم الفاظ پڑھے ہوئے ہیں۔ قصیدوں میں جوش و خروش نہ سہی لیکن انداز وہی، سوداؔ کے قصیدوں کا ہے لیکن چونکہ عہد ندیم کے شعراء اور مصحفی میں بیس بیس تیس تیس برس کا تفاوت ہے اور ان کی اور سید انشا کے درمیان خوب نوک جھونک رہی ہے۔ اس لئے مجبوراً انھیں دور سوم میں جگہ دی گئی ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ اِس دَور کا صدر اگر کسی کو بنایا جاسکتا ہے تو وہ آپ ہی ہیں۔

سطور بالا سے مصحفی کے کلام کے متعلق کچھ اندازہ ہوا۔ ان کا کوئی خاص ذاتی رنگ نہیں ہے۔ بزرگوں ہی کے نقش قدم پر چلتے ہیں۔ اور اسی میں سعادت سمجھتے ہیں۔ البتہ سید انشاء کے خلاف اصول فن کی پوری پابندی کرتے ہیں۔ غزلوں میں اکثر سنگلاخ زمینیں اختیار کی ہیں۔ اور اپنی قادرالکلامی کی مدد سے انھیں ہرا بھرا کیا ہے۔

نواب کلب علی خاں مرحوم نے ان کے آٹھوں دیوانوں کا خلاصہ چھپوا دیا ہے۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

دن جوانی کے گئے موسم پیری آیا — آبرو خواب ہے اب وقت حقیری آیا
تابِ طاقت نہ رہے کیا خاک کہ اعضا کے تئیں — حاکم ضعف سے فرمان تغیری آیا
سبق نالہ تو بلبل نے پڑھا مجھ سے ولے — نہ اُسے قاعدۂ تازہ صفیری آیا
شاعری پر کبھی اپنی جو گئی اپنی نظر — نہ ضمیر اپنے میں اس وقت ضمیری آیا
پوچھ مت معرکۂ عشق کا ہنگامہ کہ واں — قیس مارا گیا وامق باسیری آیا
چشم کم سے د نظر مصحفی خستہ پہ کر — وہ اگر آیا تو مجلس میں نظیری آیا

خدا جانے کہ بعد از مرگ کیا احوال ہووے گا / کریں گے خواب راحت یا یہی جنجال آ دے گا

مصحفی ہم تو یہ سمجھے تھے کہ ہوگا کوئی زخم / تیرے دل میں تو بہت کام رفو کا نکلا

مت میرے رنگ زرد کا چرچا کرو کہ یاں / رنگ ایک سا کسی کا ہمیشہ نہیں رہا

درد و غم کو بھی ہے نصیب شرط / یہ بھی قسمت سوا نہیں ملتا

شیخ ولی محمد نظیر اکبرآبادی

نظیر کے جیتے جی اور ان کے بعد عرصہ دراز تک لوگوں کی توجہ اس بے نظیر شاعر کی طرف منعطف نہیں ہوئی۔ مگر اب زمانہ آگیا ہے کہ تاریخ ادب اردو میں اس خلّاق شاعر کو نمایاں جگہ دی جائے۔ لیکن یہ ایک اہم سوال ہے کہ کون سے دور میں انھیں جگہ دی جائے۔ نظیر سنہ ۱۷۴۰ء میں پیدا اور سنہ ۱۸۳۰ء میں فوت ہوئے۔ اس اعتبار سے آپ کی عمر دو دوروں میں یعنی دور دوم و سوم میں گذری۔ آپ نے میر و سودا کا عہد بھی پایا اور مصحفی و انشا کا بھی۔ اب رہا کلام وہ نہ دورِ دوم کا ہے نہ دورِ سوم کا۔ بلکہ اگر زبان سے قطع نظر کر لی جائے تو دورِ حاضرہ کے شاعر کا کلام معلوم ہوتا ہے۔ مسٹر رام بابو سکسینہ نے تاریخ ادب اردو میں نظیر کے لئے ایک الگ باب قائم کیا ہے۔ اور اس میں نصیر دہلوی کو بھی شامل کیا ہے۔ مسٹر ٹی گراہم بیلی نے انھیں مصحفی و انشا کے دور میں جگہ دی ہے۔ میں حیران ہوں کہ کیا کروں۔ چھوڑ جاؤں یہ ناممکن ہے۔ الگ دور قائم کروں تو اس کے لئے نظیر ہمزبان شعرا کی زبان کہاں سے لاؤں۔ ناچار مسٹر ٹی گراہم بیلی کے نقش قدم پر چلتا ہوں۔

شیخ ولی محمد نام۔ نظیر تخلص خلف محمد فاروق، دہلی میں پیدا ہوئے۔ آپ

اپنے والدین کے اکلوتے بیٹے تھے۔ اس لئے بڑے نازو نعم میں پرورش پائی۔
لڑکپن میں اپنی والدہ کے ہمراہ آگرہ پہنچے اور محلہ تاج گنج میں سکونت اختیار کی۔
علوم متداولہ حاصل کئے۔ چنانچہ عربی اور فارسی میں کامل دستگاہ رکھتے تھے۔

نظیر آزاد منش، درویش مزاج اور قناعت گزیں آدمی تھے۔ نواب سعادت علی
خاں نے لکھنؤ بلایا۔ مہاراجا بھرت پور نے بھی طلب کیا مگر آپ نے گوشۂ عزت کو
چھوڑ کر درباداری کے دردسر کو قبول نہ کیا۔ آگرہ ہی میں ایک معلم کی حیثیت سے
بسر اوقات کرتے رہے۔ آخر اسی حال میں اس سرائے فانی سے کوچ کیا۔

نظیر کا کلیات چھپ چکا ہے۔ اس میں مختلف قسم کے بہت سے عنوانات
پر نظمیں ہیں۔ زیادہ تر مسدس اور مخمس ہیں۔ اکثر و بیشتر نظمیں ظرافت آمیز ہیں۔
حقایق و معارف کو نہایت خوش اسلوبی سے بیان کرتے ہیں۔ واقعات زمانہ
کو اچھے اور بُرے دونوں پہلوؤں سے اس طرح پیش کرتے ہیں کہ تصویر کھینچ دیتے
ہیں۔ کلیات گوناگوں خوش رنگ پھولوں کا گلدستہ ہے۔ کہیں رندی کا رنگ
جھلکتا ہے کہیں زہد و پارسائی کا، کہیں پند و نصائح ہیں اور کہیں حقائق و
معارف۔ بعض نظمیں موت، فنا، ترک دنیا وغیرہ پر نہایت مؤثر طریقے پر لکھی
گئی ہیں۔

لیکن افسوس ہے کہ نظیر کے کلام میں ہمواری نہیں۔ جو جو نظمیں متانت
اور قواعد کے زیور سے آراستہ ہیں۔ وہ نہایت بلند پایہ ہیں اور نظیر کی قادر الکلامی
پر دلالت کرتی ہیں۔ لیکن اکثر نظمیں فحش گوئی۔ ابتذال، رکاکت کے علاوہ بے اصولی
اور خلاف قواعد تصرفات کی وجہ سے پایۂ اعتبار سے ساقط ہیں۔ اوزان اور قوافی

نظیر اکبر آبادی

کی غلطیاں اور غلط الفاظ کا استعمال بکثرت ملتا ہے اور اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ وہ عوام کی زبان زیادہ استعمال کرتے تھے۔ بہرکیف اگر کلیات نظیر کا انتخاب کیا جائے اور مبتذل مضامین کو خارج کر دیا جائے تو نہایت نفیس اور کار آمد گلدستہ تیار ہو سکتا ہے۔ چنانچہ مکتبہ ابراہیمیہ نے "جواہر کلیات نظیر" شائع کی ہے۔ افسوس ہے کہ ہم اس مختصر تاریخ میں نظیر کے کلام کا نمونہ پیش نہیں کر سکتے۔ لہٰذا "جواہر کلیات نظیر" ملاحظہ فرمائیے۔

تبصرہ

زبان اصلاح زبان کے لحاظ سے یہ دور کچھ زیادہ اہم نہیں۔ یوں تو غیر ارادی طور پر زبان کی اصلاح ہمیشہ ہوتی رہتی ہے لیکن اس دور میں کوئی خاص کوشش نہیں کی گئی۔ نظیر کے کلام سے قطع نظر انشار، مصحفی وغیرہ شعرار کے یہاں کثرت سے قدیم الفاظ موجود ہیں۔ مثلاً نت ٹک۔ بھلا رے زور۔ واچھڑے، جھکڑا وغیرہ۔

انشا نے ہندی الفاظ استعمال کئے مگر سنجیدگی سے نہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہ اکثر کرخت اور غیر فصیح ہیں۔ مثلاً ڈنڈ، گنڈ منڈ، بھسنڈ، رنڈ وغیرہ۔

زبان کے سلسلے میں البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ادائے مطالب کی وسعت بڑھی ہوئی ہے۔ مصحفی کی قادر الکلامی نے ہر قسم کے مطالب کو نہایت صفائی سے ادا کر دیا ہے۔ جرأت کے یہاں بھی صفائی اور سادگی بہت پائی جاتی ہے۔

اُسلوب بیان اُسلوب بیان کے لحاظ سے بھی یہ دور زیادہ اہم نہیں ہے۔ سید انشا اور نظیر اکبر آبادی کے کلام میں ظرافت اور تمسخر کی چاشنی ہے۔ نظیر کی ظرافت اکثر مقامات پر مفید ہے۔ لیکن انشا کا تمسخر حد سے

بڑھ کر رکاکت تک پہنچ جاتا ہے۔ مصحفی کے کلام میں متانت اور سنجیدگی ہے لیکن اسلوب بیان وہی ہے جو متقدمین شعراء کا۔ نظیر اکبرآبادی نے البتہ گوناگوں اسلوب پیش کیے ہیں جو اس دور کے لیے ہی نہیں بلکہ ہر آئندہ دور کے لیے باعث فخر ہوسکتے ہیں۔ تنگ نائے غزل سے نکل کر انھوں نے ہر قسم کی، ملکی، سماجی، اخلاقی مضامین پر طبع آزمائی کی۔ ان کے کلام کی قدر اگرچہ اس عہد میں نہیں ہوئی۔ مگر موجودہ عہد میں بہت سے شعراء اُن کے ہم زبان ہو گئے ہیں۔

موضوع سخن نظیر کو چھوڑ کر باقی تمام شعراء کے یہاں اخلاقی مضامین اور صوفیانہ خیالات کی نمایاں کمی معلوم ہوتی ہے۔ رفتہ رفتہ غزل میں ہر قسم کے وہ مضامین آتے جاتے ہیں۔ جن کو غزل سے کوئی تعلق نہیں، بلکہ وہ غزل کے لیے قطعی ناموزوں معلوم ہوتے ہیں۔ اگرچہ موضوع سخن عشق و عاشقی ہے لیکن لطیف جذبات اور احساسات کی کمی ہے۔ عام طور پر کلام میں ناہمواری اور بے اعتدالی پائی جاتی ہے۔ کسی رنگ کو اس عہد کا خاص رنگ نہیں کہہ سکتے۔

مقامی خصوصیات اس دور کے شعراء نے خصوصاً نظیر نے مقامی اور ملکی خصوصیات کو زیادہ برتا ہے۔ مقامی میلوں ٹھیلوں، موسموں اور رسم و رواج وغیرہ کے متعلق کافی نظمیں لکھی ہیں۔

ریختی[1] اگرچہ اردو کے ابتدائی دور میں مولانا ہاشمی بیجاپوری اور رضاکی وغیرہ شعراء کے یہاں ریختی کا سراغ ملتا ہے۔ لیکن غور کرنے پر یہ حقیقت

---

[1] ریختی اس قسم کا نام رکھا گیا جس میں زنانہ زبان میں زنانہ جذبات و احساسات نظم کیے۔ بقیہ

"۔ فرق ہے کہ وہ ریختی نتیجہ تھی ہندی اثر کا۔ ہندی شاعری کا یہ خاص رنگ ہے کہ اس میں اظہارِ عشق جنس لطیف کی طرف سے ہوتا ہے۔ زیادہ تر عورتوں کے جذبات اور احساسات نظم کئے جاتے ہیں۔ چنانچہ ابتدائی دور کی ریختی میں ہوا و ہوس، دل لگی اور ٹھٹھول کا پتہ نہیں۔ پیشِ نظر دور میں سعادت یار خاں رنگین اور ان کے دوست سید انشا نے بقول غفر غیبی" ریختہ کے تئیں چھوڑ کر ایک ریختی ایجاد کی۔۔۔۔۔۔"

(آبِ حیات صفحہ ۱۱۰)

جاتے تھے۔ واضح ہو کہ اردو میں مردانہ اور زنانہ زبان میں ہمیشہ سے فرق چلا آتا ہے۔ خاص خاص الفاظ، محاورات عورتوں کے لئے مخصوص ہوتے ہیں۔ اسی طرح فارسی عطف و اضافت مردوں کے لئے مخصوص ہیں۔ ریختی میں جہاں عورتوں کے مخصوص الفاظ، محاورات وغیرہ نظم ہوتے ہیں وہاں فارسی عطف و اضافت اور فارسی و عربی کے عالمانہ الفاظ سے قطعی گریز کیا جاتا ہے۔

ریختی کے امام جان صاحب ہوئے۔ آپ کا نام میر یار علی خاں اور تخلص جان صاحب تھا۔ لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔ رامپور میں سنہ ۱۸۹۷ء میں ان کا انتقال ہوا۔ ایک دیوان ریختی آپ کی یادگار ہے۔ اگر اس دیوان کو طرح طرح کے خطرناک کانٹوں سے پاک کر کے ایک مختصر انتخاب مرتب کر لیا جائے تو بیگمات کی زبان، ان کے خیالات، جذبات، احساسات، طریقۂ بود و باش، رسم و رواج وغیرہ کا اچھا خاصہ دلچسپ مرقع تیار ہو سکتا ہے۔

موجودہ عہد بھی ریختی گو شعراء سے خالی نہیں۔ چنانچہ شیدا صاحب الہ آبادی اب بھی شاعروں کو اپنی ریختی سے شگفتہ کر دیتے ہیں۔ ان کا ایک مجموعہ "آرسی" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ اس میں ریختیاں اور قصیدیاں وغیرہ شامل ہیں۔

باب ۶

اُردو شاعری کا چوتھا دَور (لکھنؤ میں)

تمہید اب تک جس قدر اساتذہ اُردو شاعری میں گزرے وہ سب دہلی کے رہنے والے تھے۔ اگرچہ مصحفی امروہہ کے رہنے والے تھے مگر اُنھیں بھی دہلی سے وہ محبت تھی کہ وہیں کی وطنیت پر فخر کیا کرتے تھے۔ شہر دہلی زبان و ادب کا مرکز تھا۔ بیرونجات کے شعراء زبان و ادب کے معاملات میں اساتذۂ دہلی کی تقلید کرتے تھے۔ اہلِ لکھنؤ میں اب تک کوئی صاحب کمال پیدا نہیں ہوا تھا۔ شعرائے لکھنؤ بھی چنانچہ اساتذۂ دہلی کو اپنا استاد مانتے تھے۔ اور ان کی تقلید کا دم بھرتے تھے۔ لیکن اب اساتذہ دہلی ایک ایک کرکے پیوندِ خاک ہونے شروع ہوئے۔ میرؔ، سوداؔ، انشاؔ، مصحفیؔ، جراٴتؔ غرض سب میدان زندگی کے ساتھ معرکۂ شعر و ادب سے کنارہ کش ہوئے۔ میدان صاف تھا۔ اہلِ لکھنؤ نے صاحب کمال پیدا کرنے شروع کئے۔ چنانچہ دہلی کی طرح لکھنؤ بھی مرکز سمجھا جانے لگا۔ اہلِ لکھنؤ نے صاحب زبانی کا دعویٰ کیا اور دہلی کی تقلید کا جوا کندھے سے اُتار پھینکا اور حقیقت یہ ہے کہ زبان کی اصلاح میں بڑے سلیقے سے کام کیا۔ لکھنؤ اسکول کے بانی مبانی شیخ امام بخش ناسخؔ اور خواجہ حیدر علی آتشؔ ہیں۔

شیخ امام بخش ناسخ

امام بخش نام۔ ناسخ تخلص۔ خدا بخش خیمہ دوز کے بیٹے تھے۔ سنہ ولادت معلوم نہیں۔ بچپن فیض آباد میں بسر ہوا۔ جب لکھنؤ اودھ کا دارالحکومت قرار پایا۔ تو آپ بھی لکھنؤ چلے آئے۔ یہاں علوم متداولہ حاصل کئے۔ ۔ورعربی و فارسی میں کمال پیدا کیا۔ میر تقی میر حیات تھے۔ غزل لے کر اُن کی خدمت میں پہنچے۔ میر نے اصلاح کے شرف سے پہلو تہی کی۔ آپ مایوس ہو کر واپس آئے۔ اور خود ہی لکھتے اور خود ہی اصلاح کرتے رہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ میر کے انکار کے بعد مصحفی اور تنہا سے مشورہ سخن کیا۔

کہتے ہیں کہ جب ناسخ لکھنؤ پہنچے تو وہاں میر کاظم علی ایک رئیس تھے۔ اُنھوں نے ان کو اپنا فرزند بنا لیا۔ وہ مرے تو اچھی خاصی دولت وصیت نامے کی رو سے اُن کو ملی۔ بہر کیا تھا۔ ٹکسال میں مکان لیا اور فارغ البالی سے بسر اوقات کرنے لگے۔

ناسخ کو پہلوان سخن کہا جاتا ہے۔ ان کے کلام سے تو ان کی پہلوانی ٹپکتی ہی ہے۔ جسم کے بھی پہلوان تھے۔ ورزش کا شوق تھا۔ خوراک ایسی ڈبل تھی کہ آج کل کے اہل لکھنؤ مبالغہ سمجھیں تو بعید نہیں۔ دن رات میں ایک وقت کھاتے تھے۔ مگر پانچ سیر پختہ، نہایت قوی ہیکل تھے۔ بلند بالا۔ فراخ سینہ اور اس پر رنگ سیاہ۔

لکھنؤ میں قمر الدین احمد عرف مرزا حاجی، عالی خاندان، علوم و فنون، میں صاحب استعداد اور مذاق سخن سے آشنا تھے۔ ان کا گھر قبلہ حاجات

بنا ہوا تھا۔ اہل فضل و کمال اُن کی مصاحبت میں رہتے تھے۔ شعر و سخن کا مشغلہ، زبان کی تراش خراش اور تحقیقات علمی کا ہنگامہ گرم رہتا تھا۔ اسی صحبت میں ناسخ کا نشو و نما ہوا۔ اور اصلاح زبان کا چسکا اسی صحبت میں پڑا۔ ذاتی قابلیت اور مرزا حاجی کی مصاحبت نے ان کی شخصیت کو بڑھایا۔ اہل فہم اور اہل کمال ان کی طرف کھنچ کھنچ کر آنے لگے۔

ناسخ نے متعدد سفر کئے۔ الہ آباد بھی گئے تھے۔ دیوان چند دلال نے حیدر آباد بھی بلایا مگر نہیں گئے، لکھنؤ سے کمال محبت تھی۔ آخر ادھر اُدھر کے سفر سے فارغ ہو کر لکھنؤ آئے اور وہیں ۱۸۳۸ء میں راہی ملک بقا ہوئے۔

تین دیوان آپ کی یادگار ہیں جن میں سے دو بہت مشہور ہیں۔ چھپ چکے ہیں۔ اور ہر جگہ دستیاب ہوتے ہیں۔ دیوانوں میں سوائے غزلیات، رباعیات اور قطعات کے اور کچھ نہیں، قصیدہ کبھی نہیں لکھا۔ ہجو سے بھی قطعی گریز کیا ہے۔ آپ نے ایک مثنوی "نظم سراج" تصنیف کی جو مشہور نہیں ہوئی۔ ناسخ کی شہرت زیادہ تر ان کی غزلیات کی وجہ سے ہے تاریخ گوئی میں بھی ناسخ کو کمال حاصل تھا۔ چنانچہ سیکڑوں تاریخیں دیوانوں میں موجود ہیں۔

غزلیات میں ناسخ کا رنگ گذشتہ تمام شعراء سے مختلف ہے۔ سب سے پہلی خصوصیت ان کے کلام کی یہ ہے کہ اغلاط اور عیوب سے قطعی پاک ہے۔ قواعد اور اصول کی بڑی سختی سے پابندی کی گئی ہے اور اس پابندی کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ کلام پھیکا اور بے نمک ہو گیا ہے۔ جذبات اور

اور احساس کا خون بہانا انھیں منظور ہے لیکن بے قاعدگی اور بے صلی گوارا نہیں اور پھیکا پن ان کے کلام کی دوسری بڑی خصوصیت ہو سکتی ہے۔

کلام میں تشبیہات اور استعارات کی بہتات ہے۔ نازک خیالی، مضمون آرائی اور بلند پروازی کو دور از کار تشبیہ اور استعارے کے بیچ میں الجھا کر بے اثر اور بے کیف کر دیتے ہیں۔ کلام میں مبالغہ بے اثری کی حد سے گزر کر بعض اوقات درد سری تک پہنچ جاتا ہے۔ اخلاقی مضامین کو نیم منطقی، دلیل، تمثیل، حسن تعلیل، اور بعض اوقات لفظی ہیر پھیر سے اس طرح ثابت کرتے ہیں کہ ان میں اثر مطلق نہیں رہتا۔ خارجی مضامین زیادہ پائے جاتے ہیں۔ مختصر یہ کہ با قاعدگی، تصنع، مبالغہ، بے اثری اور الجھاؤ ناسخ کے کلام کی خصوصیات ہیں۔ علاوہ ازیں فارسی اور عربی کے ثقیل الفاظ سے کہیں کہیں کلام میں غرابت بھی پیدا ہو گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ خصوصیات شعر و شاعری کے مقصد کے منافی ہیں۔ لیکن اس امر کو فراموش نہیں کر دینا چاہئے۔ کہ ناسخ ارتقا و اصلاح زبان کی تاریخ میں سنہرے صفحات کے مستحق ہیں۔ اردو زبان ان کے احسانات سے قیامت تک سبکدوش نہیں ہو سکتی۔

ناسخ نے زبان اردو پر جو احسانات کئے ان کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

(۱) فارسی، عربی اور ہندی الفاظ کے لئے تذکیر و تانیث کے قاعدے مقرر کئے۔

(۲) ثقیل اور بدنما الفاظ و محاورات کو ترک کر کے لطیف و فصیح الفاظ اور محاورات رائج کئے۔ مثلاً "ٹک" کی بجائے "ذرا"، "نپٹ" کے بجائے "بہت"، "تجھ سوا"

کے بجائے "تیرے سوا" وغیرہ۔

(۳) ثقیل اور بھونڈے ہندی الفاظ کو ترک کیا۔ فارسی اور عربی الفاظ زیادہ استعمال کئے۔ جس سے زبان میں وسعت پیدا ہوگئی۔

(۴) غلط افعال کو ترک کیا۔ مثلاً کاہل سے کہلانا وغیرہ متروک قرار دیئے۔

(۵) غزل میں عاشقانہ مضامین کے علاوہ اور مضامین شامل کئے اور آیندہ ترقیوں کے لئے میدان صاف کر دیا۔

(۶) فحش، مبتذل اور عامیانہ الفاظ ترک کر دیئے اور غزل میں متانت اور سنجیدگی کی بنیاد قائم کی۔ اب نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:۔

دم بلبل اسیر کا تن سے نکل گیا — جھونکا نسیم کا جو ہی سن سے نکل گیا
لایا وہ ساتھ غیر کو میرے جنازہ پر — شعلہ سا ایک جیب کفن سے نکل گیا
ساقی بغیر شب جو پیا آب آتشیں — شعلہ وہ بن کے میرے دہن سے نکل گیا
اب کی بہار میں یہ ہوا جوش اے جنوں — سارا لہو ہمارے بدن سے نکل گیا
اس رشک گل کے جاتے ہی بس آ گئی خزاں — ہر گل بھی ساتھ بو کے چمن سے نکل گیا
اہلِ زمیں نے کیا ستم نو کیا کوئی — نالہ جو آسمانِ کہن سے نکل گیا
سنسان مثل وادیٔ غربت ہے لکھنؤ — شاید کہ ناسخ آج وطن سے نکل گیا

مرتبہ کم حرص رفعت سے ہمارا ہو گیا — آفتاب ایسا ہوا اونچا کہ تارا ہو گیا
ہے تصور نوک مژگاں کا جو ہر دم سامنے — دیدۂ گریاں ہمارا اب ہزارا ہو گیا
باعثِ چاکِ کتاں ہوتا ہے جلوہ ماہ کا — واں چھپا وہ ماہ یاں دل پارہ پارہ ہو گیا

ایک درہم اور داخل گنج قاروں میں ہوا بہت ایسا میرے طالع کا ستارا ہو گیا
بے ثباتی جو ہوئی عالم کی ثابت اے فلک آفتاب اپنی نظر میں اک شرارا ہو گیا

تم ہے جادوگری تم پر کہ اے چشمانِ یار
ناسخ جادو بیاں عاشق تمھارا ہو گیا

شاگردانِ ناسخ یوں تو سیکڑوں موزوں طبع شیخ امام بخش ناسخ کے دامن تربیت میں پرورش پاکر شاعر ہوئے اور آدھے سے زیادہ لکھنؤ آپ کا معتقد تھا۔ گرچند شاگرد صاحب دیوان اور فخر اُستاد ہوئے۔

خواجہ وزیر خواجہ محمد وزیر نام۔ وزیر تخلص۔ لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔ پہلے خواجہ آتش سے مشورہ سخن کرتے تھے۔ پھر ناسخ کے شاگرد ہوئے۔ نازک خیال اور قادر الکلام شاعر تھے۔ شیخ صاحب بھی ان کی شاگردی پر فخر کرتے تھے۔ ۱۸۵۴ء میں آپ کا انتقال ہو گیا۔

میر علی اوسط رشک پورا نام و لقب والا جاہ میر علی اوسط اور رشک تخلص ہے۔ لکھنؤ میں نشوونما ہوا۔ ایک ضخیم دیوان آپ کی یادگار ہے۔ تاریخ میں یدِطولیٰ حاصل تھا۔ ۱۸۶۷ء میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔

برق مرزا محمد رضا خاں نام اور برق تخلص تھا۔ واجد علی شاہ اختر کے مصاحب اور اُستاد تھے۔ بہت پُرگو اور قادر الکلام شاعر تھے۔ ۱۸۵۷ء میں جہان فانی سے کوچ کیا۔

بحر شیخ امداد علی نام اور بحر تخلص تھا۔ صحت الفاظ، تحقیق لغت اور فن

عروض میں مشہور تھے۔ تمام عمر عسرت اور تنگ حالی میں بسر ہوئی۔ نواب کلب علی خاں والیِ رام پور نے شہرت سُن کر بلا بھیجا اور عزت افزائی فرماکر تنخواہ مقرر کردی۔ آخر وقت میں وطن یاد آیا۔ دربار سے رخصت ہوکر لکھنؤ واپس چلے آئے۔ آخر ۱۸۸۲ء میں رحلت فرمائی۔

منیر شکوہ آبادی

سید اسمٰعیل حسین نام۔ منیرؔ تخلص۔ شکوہ آباد کے رہنے والے تھے۔ پہلے نواب باندہ کی سرکار میں ملازم تھے۔ غدر کے بعد نواب صاحب رام پور نے قدر افزائی فرمائی۔ آخر ۱۸۸۱ء میں انتقال ہوا۔ غزلیات میں وہی رنگ ہے جو ناسخ کا۔ مثنوی بھی لکھی لیکن مذہبی رنگ کی۔ البتہ قصائد اُن کے بڑے دھوم دھام کے ہیں۔ سوداؔ اور ذوقؔ کے بعد ان ہی کے قصیدوں پر نظر پڑتی ہے۔

خواجہ حیدر علی آتش

خواجہ حیدر علی نام اور آتشؔ تخلص تھا۔ آباو اجداد دہلی کے رہنے والے تھے۔ نواب شجاع الدولہ کے عہد میں ان کے والد خواجہ علی بخش فیض آباد پہنچے۔ آتش وہیں پیدا ہوئے۔ ابھی جوان بھی نہ ہونے پائے تھے اور تعلیم بھی خوب نہ ہوئی تھی کہ سایۂ پدری سر سے اُٹھ گیا۔ ابتدائی عمر زیادہ تر فوج کے لڑکوں میں گزری جس کی وجہ سے آپ بانکے اور شورہ پشت ہوگئے۔

نواب محمد تقی کے ہمراہ لکھنؤ پہنچے تو یہاں جرأت، انشا اور مصحفی کا دور دورہ تھا۔ گھر گھر شاعری کا چرچا تھا۔ ان کو بھی شعر و سخن کا شوق پیدا ہوا۔ مصحفی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ اور کثرتِ مشق سے فخرِ استاد ہوگئے۔

علمی استعداد معمولی تھی۔ لیکن بزرگوں کی صحبت اور مصحفی کی اُستادی نے شاعری کی ضروریات سے واقف کر دیا تھا۔ اصنافِ سخن میں غزل کے سوا اور کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا۔ زبان کی تراش خراش، صفائی اور پاکیزگی میں اتنی کوشش کی کہ اپنے وقت کے مسلّم الثبوت استاد ہو گئے۔

اسّی روپیہ مہینہ بادشاہ کے یہاں سے ملتا تھا۔ شاگردوں یا امیروں میں سے کوئی سلوک کرتا تو اُس سے انکار نہیں تھا۔ باپ دادا سے توکّل ترکہ میں پایا تھا۔ اور ہوش سنبھالتے ہی بانکپن اور شورہ پشتی کی تعلیم ملی تھی۔ یہ دونوں انداز بڑھاپے تک قائم رہے۔

گیروا تہبند باندھتے تھے۔ ڈنڈا ہاتھ میں رہتا تھا۔ بیچ کام کا سلیم شاہی جوتا پاؤں میں۔ ڈنڈے میں ایک چھلّا سونے کا لگا رہتا۔ دوسرے تیسرے فاقے کی حالت میں چھلّا رہن رکھ کر فاقہ شکنی کرتے۔ بھنگ پینے کا چسکا زندگی بھر رہا۔

لکھنؤ میں نوازگنج کے قریب ایک کچّا مکان خرید لیا تھا۔ اسی میں رہتے تھے۔ شادی بھی کر لی تھی۔ ایک بیٹا تھا۔ محمد علی جوشش۔ بیوی کے مرنے کے بعد آنکھوں کی بینائی بھی جاتی رہی تھی۔

اخیر زمانے میں معالی خاں کی سرائے میں اُٹھ آئے تھے۔ ڈاڑھی بڑھا لی تھی اُس پر مہندی کا خضاب کیا کرتے تھے۔ مگر وضعداری کی دوسری باتوں میں کوئی فرق نہیں آیا۔ وہی رندانہ مزاج، وہی فقر و فاقہ ایک ٹوٹے کھٹولے پر بیٹھے رہتے تھے۔ سامنے حقّہ رکھا رہتا تھا۔ کوئی امیر یا غریب آتا اُس کے سامنے وہی ٹوٹا ہوا حقّہ پیش کیا جاتا۔ آخر اسی فقر و فاقہ میں

۱۸۴۶ء میں قفس عنصری سے آزاد ہوئے۔ میر دوست علی خلیل نے تجہیز و تکفین کی۔
ایک دیوان مکمل اور ایک تتمہ ان کی یادگار ہے۔ دیوان میں غزلیات کے
سوا اور کچھ نہیں۔
آپ ناسخ کے ہمعصر ہیں اور کبھی کبھی اُن سے نوک جھونک بھی ہو جاتی تھی۔
لیکن مصحفی اور انشا کی طرح ہجو تک نوبت نہیں پہنچی۔
زبانِ اُردو کی اصلاح میں جو مرتبہ ناسخ کو حاصل ہے وہی خواجہ صاحب
کو بھی حاصل ہے۔ ناسخ نے اُصول مرتب کئے۔ آتش نے صفائی اور محاورہ
اور روزمرّہ کا بہترین صرف کیا۔ ناسخ کے خلاف آتش کے ہاں ثقیل الفاظ
بہت کم ہیں۔ یعنی ان کے کلام میں فصاحت زیادہ ہے۔
نازک خیالی اور بلند پروازی میں ناسخ بہت بلند ہیں۔ لیکن سوز و گداز،
صفائی اور اثر کے لحاظ سے آتش کا کلام بہتر ہے۔ کہیں اخلاقی مضامین
پُر تاثیر ہیں اور تصوف کی چاشنی بھی مزہ دے جاتی ہے۔
اِس دور کے عام رنگ یعنی تصنع سے آتش کا کلام قطعی پاک نہ رہ سکا۔
خارجی اور سطحی مضامین بھی ان کے ہاں بکثرت ملتے ہیں۔ کلام میں ناہمواری سے،
عامیانہ مضامین اور حُسن کے خارجی لوازمات کی تعریف سے کہیں کہیں کلام
میں پستی آجاتی ہے۔ غلط الفاظ کا استعمال بھی کہیں کہیں نظر سے گزرتا
ہے۔ مثلاً المضاف بجائے المضاعف۔ حلوہ بجائے حلوہ وغیرہ استعمال کئے ہیں۔
اس کو علمی استعداد کی کمی سمجھئے یا کچھ اور۔
نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:—

خوشی سے اپنی رُسوائی گوارا ہو نہیں سکتی
گریباں پھاڑتا ہے تنگ جب دیوانہ آتا ہے

بگولے کی طرح کس کس خوشی سے خاک اُڑاتا ہوں
تلاشِ گنج میں جو سامنے ویرانہ آتا ہے

طلب دُنیا کی کر کے زن مُریدی ہو نہیں سکتی
خیالِ آبروئے ہمتِ مردانہ آتا ہے

تماشا گاہ ہستی میں عدم کا دھیان ہے کس کو
کسے اس انجمن میں یادِ خلوت خانہ آتا ہے

زیارت ہو گی کعبہ کی یہی تعبیر ہے اس کی
کئی شب سے ہمارے خواب میں بتخانہ آتا ہے.

عتاب و لطف جو فرمائیں ہر صورت سے راضی ہیں
شکایت سے نہیں واقف ہمیں شکرانہ آتا ہے

خدا کا گھر ہے بتخانہ ہمارا دل نہیں آتش
مقامِ آشنا ہے یاں نہیں بیگانہ آتا ہے

فریبِ حُسن سے گبر و مُسلماں کا چلن بگڑا
خدا کی یاد بھولا شیخ بت سے برہمن بگڑا

تری تقلید سے کبکِ دری نے ٹھوکریں کھائیں
چلا جب جانور انساں کی چال اس کا چلن بگڑا

وہ بدخو طفلِ اشک اے چشمِ تر ہیں دیکھنا ایک دن
گھروندے کی طرح سے گنبدِ چرخِ کہن بگڑا

کسی کی جب کوئی تقلید کرتا ہے میں روتا ہوں
ہنسا گُل کی طرح غنچہ جہاں اُس کا دہن بگڑا

ارادہ میرے کھانے کا نہ اے زاغ و زغن کیجو
وہ کشتہ ہوں جسے سونگھے سے کتے کا بدن بگڑا

امانت کی طرح رکھا زمیں نے روز محشر تک
نہ اک مُو کم ہوا اپنا نہ اک تارِ کفن بگڑا

گلے مُنہ بھی چڑھانے دیتے دیتے گالیاں صاحب
زباں بگڑی تو بگڑی تھی خبر لیجیے دہن بگڑا

بنا وٹ کیفِ مے سے کُھل گئی اُس شوخ کی آتشؔ
لگا کر مُنہ سے پیمانہ کو وہ پیماں شکن بگڑا

شاگردانِ آتشؔ

شاگردانِ آتشؔ میں یوں تو میر دوست علی خلیل صاحب مرزا شناور، میر وزیر علی صبا۔ نواب محمد خاں رند، نواب مرزا شوق بڑے بڑے نامور شعراء اور استاد گزرے ہیں لیکن ہم یہاں صرف پنڈت دیا شنکر نسیمؔ کا تذکرہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

نسیمؔ لکھنوی

پنڈت دیا شنکر کول نام نسیمؔ تخلص۔ لکھنؤ کے کشمیری برہمن تھے۔ سال ولادت ۱۸۱۱ء ہے۔ آپ کے والد کا نام منشی گنگا پرشاد کول تھا۔ عام دستور کے موافق اُردو فارسی کی تعلیم عالم صغر سنی میں پائی۔ شعرائے اُردو کا کلام برابر نظر سے گذرتا رہا۔ شعر و شاعری کی طرف طبیعت مائل ہوئی تو خواجہ حیدر علی آتشؔ کے شاگرد ہوئے۔

نسیمؔ پستہ قامت۔ گندمی رنگ۔ سیہ چشم اور چھریرے بدن کے آدمی تھے۔ سلسلۂ معاش یہ تھا کہ شاہی فوج میں وکیل تھے۔ مزاج میں ظرافت اور بذلہ سنجی تھی۔ مگر افسوس کہ یہ چہچہاتا ہوا بلبل عین عالمِ شباب میں بعمر ۳۲ سال ۱۸۴۳ء میں دفعتاً خاموش ہو گیا۔

ایک مختصر دیوان غزلیات کا اور ایک مثنوی "گلزارِ نسیم" آپ کی یادگار ہے۔ غزلیات میں اُستاد آتش کا رنگ بہت کچھ نمایاں ہے۔ زبان کی صفائی اور فصاحت ہر جگہ جلوہ گر ہے۔ اگرچہ کلام میں اس دور کی کُل خصوصیات، مثلاً تصنع، تناسب لفظی وغیرہ پائی جاتی ہیں۔ لیکن نسیم کا کلام قطعی بے نمک نہیں۔

نسیم کی شہرت ان کی غزلیات کی وجہ سے نہیں۔ بلکہ "گلزارِ نسیم" کی وجہ سے ہے۔ اہل لکھنؤ خصوصاً اور اُردو داں ہندوستانی عموماً اس مثنوی پر جس قدر فخر کریں بجا ہے۔ شمالی ہند کی مایۂ ناز مثنوی "سحر البیان" کے بعد جس مثنوی پر نظر پڑتی ہے وہ "گلزارِ نسیم" ہی ہے۔ اس میں گُل بکاؤلی کا قصہ نظم ہوا ہے جو پہلے نثر میں تھا۔

"گلزارِ نسیم" کا خاص جوہر ایجاز و اختصار ہے۔ یہاں تک کہ اگر کہیں سے ایک شعر بھی حذف کر دیا جائے تو تسلسل قائم نہیں رہ سکتا۔ کلام میں پختگی ہے۔ معمولی سے معمولی بات بھی رعایت لفظی اور صنائع بدائع کی نقش طرازیوں سے خالی نہیں۔ لیکن باوجود ان لایعنی تکلفات کے نسیم نے واقعہ نگاری، مصوری، جذبات نگاری، لطافت و متانت، روانی و برجستگی کا حق ادا کر دیا ہے۔ غزل کے دو شعر تبرکاً درج کئے جاتے ہیں۔ مثنوی کے لئے "گلزارِ نسیم" ملاحظہ ہو۔

جب نہ جیتے جی مرے کام آئے گی	کیا یہ دُنیا عاقبت بخشائے گی
جاں نکل جائے گی تن سے اے نسیم	گُل کو بوئے گُل ہوا بتلائے گی

باب ۷

اُردو شعر و شاعری کا چوتھا دور (لکھنؤ میں)

ضمیمہ مرثیہ اور شعرائے مرثیہ گو

مرثیہ اس نظم کو کہتے ہیں جس میں کسی کی موت پر اظہارِ غم کیا جائے اور مرحوم کے اوصاف اس طرح بیان کئے جائیں کہ سننے والوں کے دل میں بھی غم والم کا دریا موجزن ہو جائے۔ ان معنوں میں اُردو میں کئی مرثیوں نے شہرت عام و بقائے دوام حاصل کی ہے۔ مثلاً غالبؔ کا مرثیہ عارف کی موت پر۔ حالیؔ کا مرثیہ غالبؔ کی موت پر اور مومنؔ کا مرثیہ اپنی محبوبہ کی موت پر۔

لیکن اُردو میں مرثیہ مع اپنی جملہ خصوصیات کے ایک خاص اصطلاحی معنوں میں سمجھا جانے لگا۔ یعنی اس نظم کو مرثیہ کہنے لگے جس میں امام حسینؓ کی شہادت اور ان کے اہل و عیال کے مصائب کا ذکر کرکے عزاداری کی جائے۔ اس باب کا موضوع یہی مرثیہ ہے۔

ارتقائے مرثیہ صنف مرثیہ نگاری اُردو شعر و شاعری کے ساتھ ہی عالمِ وجود میں آئی۔ باب دوم کے آخر میں مرثیہ کی ابتدا کے متعلق عرض کیا جا چکا ہے۔ یہاں اس کا اعادہ کرنا چنداں ضروری نہیں۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ نوریؔ، ہاشم علی برہان پوری اور قطب شاہ کے بعد

دکن میں ہر شاعر مرثیہ گوئی کو ثواب اُخروی اور نجات دارین کا ذریعہ سمجھتا تھا۔ اور بطور توشۂ آخرت تھوڑا بہت ضرور کہہ لیا کرتا تھا۔

شمالی ہند میں ابتدائی شعراء کے یہاں مرثیہ کا سُراغ نہیں ملتا۔ البتہ فضلی نے ۱۷۳۲ء کے لگ بھگ "روضۃ شہداء" کا اردو میں ترجمہ کیا۔ اس میں اُن کی ایک مسلسل نظم درج ہے۔ جس میں حضرت فاطمۃ الکبریٰ کے جذبات کی ترجمانی کی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:-

دولہا کو سوہائی نہ میں اور موت سو آئی	یہ کیا بُرا ہیرا تھا میرا بائے اے لوگو!
تو مر گیا اور میرے تئیں موت نہ آئی	ناشتے کے کتنے بیٹھ کہا اے مرے نوشہ
کفنی گلے میں ڈال کر لے گی یہ گدائی	اے میرے بنے تیری بنی تیرے بنا ہائے
دل میں کہے گی کیسی بہو بیاہ کے آئی	اے میرے بنے ساس کو کیا منہ میں دکھاؤں

فضلی کے بعد میر تقی میر نے بھی مرثیہ لکھا مگر وہ ان کی شان کے شایان نہ تھا۔ اس وجہ سے اُن کے کلیات میں جگہ نہ پا سکا۔ بطور نمونہ دو ایک بند ملاحظہ ہوں:-

مصیبت ہے، ماتم ہے، غم ہے، تعب ہے	دلوں پر محبتوں کی حالت عجب ہے
حسینؑ و علیؑ کی شہادت کی شب ہے	غرض کیا کہوں کس روش کا غضب ہے
ہر اک گھر میں ماتم کی مجلس رچی ہے	محبتوں کے دل سے خوشی سب بچی ہے
کہ روزِ قیامت کی گویا یہ شب ہے	عجب طرح کی واے ویلا مچی ہے
وہ دل دیر ہے جس میں یہ غم نہ ہوگا	کوئی دل نہیں جس کو ماتم نہ ہوگا
قیامت میں یہ کچھ نہ ہوگا جواب ہے	یہ دن کچھ قیامت سے بھی کم نہ ہوگا

اس وقت جو کچھ لکھا گیا۔ اُس کو بنظر غور دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شعراء نے اس صنف کو کبھی ادبی اہمیت نہیں دی۔ محض مذہبی فریضہ سمجھ کر جو کچھ ہو سکا لکھ لیا۔ اور مجالس عزا میں "رو رُلاکر" ثواب اُخروی حاصل کر لیا۔ غلط الفاظ، غلط محاورات، خلاف روزمرہ، عروض و قافیہ کی فروگذاشتیں بکثرت پائی جاتی ہیں۔ کسی سخن فہم کو مذہبی عظمت کے خیال سے ان فروگذاشتوں پر اعتراض کرنے اور اُن کی مراثی کی تنقیص کرنے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ لیکن دبی زبان میں اتنا ضرور کہہ دیا کرتے تھے کہ "بگڑا شاعر مرثیہ گو" اور شعراء تو خیر ایک طرف میر سے قادر الکلام نے بھی اس زمین کو کچھ بلند نہ کیا۔

سب سے اوّل سوداؔ نے اس صنف کی ادبی اہمیت دریافت کی اور ان کے کارناموں کے بعد مرثیہ جو اب تک حصول ثواب کے لئے کہا جاتا تھا۔ مقتضیات شاعری کے ہم عنان ہو کر ترقی کے منازل طے کرنے لگا۔ چنانچہ وہ اپنے مراثی کے دیوان کے دیباچہ میں فرماتے ہیں۔

"لیکن مشکل ترین دقائق طریق مرثیہ کا معلوم کیا کہ مضمون واحد کو ہزار رنگ میں ربط معنی سے دیا۔ چنانچہ اس کام میں محتشم ساکسو نے عز قبول نہیں پایا۔ بس لازم ہے کہ مرثیہ در نظر رکھ کر مرثیہ کہے نہ کہ برائے گریۂ عوام اپنے تئیں ماخوذ کرے۔"

ابتدائی عہد سے لے کر میرؔ تک مرثیہ نے اس قدر ترقی کی تھی کہ مفرد سے مربع ہو گیا تھا۔ اور بس۔ بحریں مختلف ہوتی تھیں اور خصوصاً وہ شگفتہ بحریں زیادہ مستعمل تھیں۔ جو بطریق سوز پڑھی جا سکتی ہیں۔

سودا کی جدت پسند طبیعت نے منفردہ اور مربع کے علاوہ دیگر شکلیں بھی استعمال کیں۔ اور اس طرح مراثی میں کسی حد تک تنوع پیدا کر دیا۔ ان کے کلیات میں مراثی کی مندرجہ ذیل شکلیں پائی جاتی ہیں۔

منفردہ، مستزاد منفردہ۔ مثلث۔ مستزاد مثلث۔ مربع۔ مستزاد مربع۔ مخمس۔ ترکیب بند مخمس ترجیع بند، مسدس۔ مسدس ترکیب بند۔

مسدس جس نے سودا کے بعد مرثیہ کے لئے خصوصیت حاصل کر لی۔ سودا سے قبل کہیں نہیں پایا جاتا۔ یہ جدت سودا ہی کا حصہ ہے۔ بعض کے نزدیک اس کے موجد میاں سکندر پنجاب کے رہنے والے تھے۔ یہ سودا کے ہم عصر تھے۔ ان کا ایک مسدس نواح لکھنؤ میں زبان زد خاص و عام ہے۔ اس مسدس کے علاوہ سکندر کا اور کلام دستیاب نہیں ہوتا۔ یہ بات کچھ سمجھ میں نہیں آتی کہ سودا نے میاں سکندر کی تقلید میں مسدس لکھا ہو۔ مرزا نے جب شکلوں میں مرثیہ لکھا چنانچہ مسدس بھی لکھا ہوگا۔ کوئی وجہ نہیں کہ مسدس کو چھوڑ دیا ہو۔

ایک مربع کے تین بند بطور نمونہ ملاحظہ ہوں:۔

کریں نہ اہل جہاں کس طرح سے شیون و شین   سروں کو اپنے نہ پیٹے سو کیوں نہ کرکے بین
ہوا ہے آج کے دن قتل کربلا میں حسینؑ   یہ عزیز ہے رموز خدا کے محرم کا

ہزار طرح سے دریا رواں تھے دنیا میں   جو کوئی تھا سو وہ سیراب تھا ہر اک جا میں
کئی غریب جو تھے کربلا کے صحرا میں   نصیب ان کو نہ قطرہ ہوا کسی یم کا

یہ ظلم کس کی زباں کو ہے کہنے کا یارا   نبیؐ کا قتل کیا ظالموں نے گھر سارا
جوان میں طفل تھا ششماہہ اس کو بھی مارا   کیا نہ عمر نے کچھ فرق زائد و کم کا

شعرائے مرثیہ گو اس وقت تک مرثیہ نے کوئی خاص اہمیت حاصل نہیں کی تھی۔ سودا نے اوّل اوّل ادبیت کا خیال رکھ کر مرثیہ لکھا۔ اس کے بعد اس نے ترقی کی منزلیں طے کرنی شروع کیں اور رفتہ رفتہ ایک مستقل صنف شاعری کی حیثیت پیدا کرلی۔ اور ایک جماعت شعراء کی پیدا ہو گئی جنھوں نے اس صنف کے لئے اپنی زندگیاں وقف کردیں۔ چنانچہ میر خلیق، میر ضمیر، مرزا فصیح اور میاں دلگیر کو عہد حاضرہ کے مرثیہ کے ابتدائی شعراء کی حیثیت سے پیش کیا جا سکتا ہے۔

مرزا فصیح اور میاں دلگیر حج بیت اللہ کے لئے مکہ معظمہ تشریف لے گئے۔ اور وہیں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ میر خلیق اور میر ضمیر یہیں رہے اور اپنی کوششوں سے مرثیہ کو آسمان شہرت پر پہنچا دیا۔

میر ضمیر گذشتہ سطور میں عرض کیا جا چکا ہے کہ سودا نے سب سے پہلے مرثیہ کو مسدس میں لکھا۔ چنانچہ میر ضمیر نے سودا کے نقش قدم پر چل کر مسدس کو مرثیہ کے لئے انتخاب کیا اور اسی پر اپنے کمالات کی بنیاد قائم کی۔ مرثیہ جو اب تک رونے رُلانے کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا اُسے میر ضمیر نے خوشنما تشبیہوں اور استعاروں سے، روایات اور مناظر قدرت سے اور موسمی، مقامی اور رزمیہ بیانات سے مالا مال کردیا۔ سراپا کی ایجاد سے مرثیہ میں جان ڈال دی اور طول دے کر سو سو بند تک پہنچا دیا۔ علاوہ بریں پڑھنے کا ایک طریقہ ایجاد کیا۔ پہلے سوز کے طرز پر پڑھا جاتا تھا۔ میر ضمیر نے تحت اللفظ پڑھا اور ان کے بعد یہ روش عام ہوگئی۔

میر خلیق میر مستحسن خلیق خلف ارشد میر غلام حسن حسن۔ صاحب مثنوی سحرالبیان دہلی میں پیدا ہوئے۔ لکھنؤ اور فیض آباد میں تعلیم و تربیت پائی۔ سولہ برس کی عمر سے شعر و شاعری کا شوق دامن گیر ہوا اور مصحفی کے شاگرد ہوئے۔ والد کے انتقال کے بعد عیال کا بوجھ اُن کے سر آ پڑا۔ غزلیں بیچ بیچ کر گزارا کیا کرتے تھے۔ بڑے پُر گو شاعر تھے۔ ایک دیوان غزلوں کا مکمل کر لیا تھا لیکن اُسے رواج نہیں دیا۔ مرثیہ گوئی میں خاص شہرت تھی۔

خوبیٔ محاورہ اور لطفِ زبان خلیق کی شاعری کی خصوصیت ہے۔ لکھنؤ میں ان کی اور ان کے تمام گھرانے کی زبان محاورہ کے لحاظ سے مستند سمجھی جاتی تھی۔ مرثیے میں میر خلیق کی توجہ تمام تر زبان کی صفائی اور جذبات کی صداقت کی طرف رہتی تھی۔ سوز و گداز کو تخیل کی بلند پروازی پر مقدم سمجھتے تھے اور مضمون آفرینی کی ہوس کم کرتے تھے۔ اور بقول آزاد ان کا کلام بہ نسبت سبحان اللہ اور واہ واہ کے آہ و نالہ کا زیادہ طلبگار رہتا۔

میر ببر علی انیس میر ببر علی نام۔ انیس تخلص۔ میر مستحسن خلیق کے بیٹے میر حسن کے پوتے تھے۔ ۱۸۰۲ء میں مقام فیض آباد پیدا ہوئے اور وہیں تعلیم و تربیت پائی۔ اپنے خاندانی کمال یعنی شاعری میں باپ کے شاگرد ہوئے۔ اور جب سے مرثیہ کہنا شروع کیا اُس وقت سے تمام عمر اسی میں صرف کر دی۔

جب آصف الدولہ نے لکھنؤ کو رونق دی تو میر انیس بھی وہاں پہنچے۔

اور اپنے کمالات سے آدھے سے زیادہ لکھنؤ کو اپنا گرویدہ کر لیا۔ میر خلیق کی زندگی ہی میں میر انیس نے کافی شہرت حاصل کر لی تھی۔

انیس کا خیال تھا کہ میری شاعری کی خاطر خواہ کچھ قدر لکھنؤ والے ہی کر سکتے ہیں۔ اور اسی خیال سے انھوں نے انتزاع سلطنت اودھ تک بیرونجات کا سفر نہیں کیا۔ لیکن آخر واقعات نے مجبور کیا اور انھیں سفر کرنا پڑا۔ ۱۸۵۹ء اور ۱۸۶۰ء میں دو مرتبہ عظیم آباد گئے۔ واپسی پر کچھ روز کے لئے بنارس قیام کیا۔ ۱۸۷۱ء میں حیدرآباد تشریف لے گئے۔ اور واپسی پر الہ آباد کو شرف بخشا۔ ان مقامات پر آپ نے اپنے مرثیے پڑھے اور ہزاروں آدمیوں سے خراج تحسین وصول کیا۔ آخر لکھنؤ میں ۱۸۷۴ء میں داعی اجل کو لبیک کہا اور اپنے مکان میں دفن ہوئے۔

انیس کی کل تصانیف شائع نہیں ہو سکیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ہزاروں مرثیے، سلام، رباعیاں اور قطعے تصنیف کئے۔ اشعار کی تعداد لاکھوں تک پہنچی تھی۔ لیکن فی الحال پانچ جلدیں مراثی کی شائع ہیں اور ہر جگہ دستیاب ہوتی ہیں۔ باقی تصانیف اُن کے خاندان میں محفوظ ہیں۔

زبان کے لحاظ سے میر انیس کے مراثی کی خصوصیت صفائی، سادگی، روانی اور فصاحت ہے۔ زبان پر قدرت کامل حاصل ہے۔ جس مضمون کو لیتے ہیں نہایت سادگی سے پُر تاثیر انداز میں ادا کر دیتے ہیں۔ زبان کی لطافت محاورات کی دلآویزی اور تشبیہوں کی ندرت سے کلام کو تازگی بخشتے ہیں۔ شاعری میں انیس کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ انسانی فطرت، جذبات اور

احساسات کا مطالعہ جس قدر انیس نے کیا ہے۔ اور کسی اُردو شاعر کے ہاں نہیں ملتا۔ مسرّت و غم، محبّت و نفرت، رشک و حسد، بیم و رجا، رحم و غضب۔ غرض ہر دلی کیفیت کا کامل مرقّع ان کے مرثیوں میں موجود ہے۔ ان مرقّعوں کی تیاری میں مختلف اشخاص کے درمیان حفظ مراتب کو انیس کبھی نظر انداز نہیں کرتے۔ بچّے کے مُنہ سے ہی وہی بات ادا کرتے ہیں جو اُس کی عمر کے شایاں ہوتی ہے۔ اسی طرح عورت کے وہی خیالات ہوتے ہیں جو عورت کے ہونے چاہیئں۔ مرد، عورت، آقا، خادم، دوست، دشمن غرض شخصیت میں وہی فرق ہے جو ہونا چاہیئے۔ مدّعا یہ کہ کردار نگاری میں خود انیس کی طبیعت کو دخل نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ کردار کا صحیح اور اصلی مرقع پیش کرتے ہیں اور اس سے ان کے مرثیوں میں ڈرامائی عنصر پیدا ہو جاتا ہے۔

مناظر قدرت، رزمیہ بیانات اور موسموں کی کیفیات جیسی میر انیس کے مرثیوں میں ہیں اُردو شاعری اُن کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہے۔ انیس ہر چیز کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ پڑھنے والوں کی آنکھوں میں اس کی تصویر پھرنے لگتی ہے۔ رزمیہ بیان میں آپ کو کمال حاصل ہے۔ اس لحاظ سے اگر اُنھیں اُردو کا فردوسی اور ہومر کہا جائے۔ تو کچھ مبالغہ نہیں۔

انیس کے بعد اُن کے بیٹے میر نفیس اپنے والد کے نقش قدم پر چلے اور مرثیہ نگاری میں اچھا نام پیدا کیا۔ انیس کے پوتے میر جلیس بھی اچھے شاعر ہوئے۔

مرزا سلامت علی دبیر مرزا سلامت علی نام۔ دبیر تخلص۔ مرزا غلام حسین کے بیٹے۔ ۱۸۰۳ء میں بمقام دہلی پیدا ہوئے۔
سات سال کی عمر میں باپ کے ہمراہ لکھنؤ آئے اور تحصیل علم میں مصروف ہوئے۔ عربی اور فارسی میں فضل و کمال حاصل کیا۔ شعر و سخن سے قدرتی مناسبت تھی۔ میر مظفر حسین ضمیر اُس زمانے میں مرثیہ گو شاعروں میں بہت ممتاز تھے۔ ان کی مجلسوں میں شریک ہوتے ہوتے ان کو بھی ذوق پیدا اور یہ ان کے شاگرد ہو گئے۔
جب انیس فیض آباد سے لکھنؤ آئے تو لکھنؤ میں دبیر کا طوطی بول رہا تھا۔ تاریخ ادبِ اُردو کے مطالعہ سے یہ عجیب بات ذہن نشین ہوتی ہے کہ ہر دور میں دو شاعر مدِ مقابل رہے ہیں۔ میر و سودا۔ مصحفی و انشا۔ ناسخ و آتش۔ ذوق و غالب۔ داغ و امیر۔ غرض مرثیہ کا دور بھی اس خصوصیت سے بری نہیں ضمیر اور خلیق پہلے حریف رہ چکے ہیں۔ اب انیس و دبیر کا عہد آیا۔ لکھنؤ کے سخن شناس دو حصوں میں تقسیم ہو گئے۔ آدھا لکھنؤ انیسیہ ہو گیا اور آدھا دبیریہ۔ لیکن خیر یہ رہی کہ انیس و دبیر۔ مصحفی و انشا کی طرح دست و گریبان نہیں ہوئے۔ بلکہ انیسیوں اور دبیریوں کے اُکسانے سے دونوں استادوں کے جوہر خوب چمکے۔ دبیر و انیس میں اگرچہ حریفانہ معرکہ آرائی رہی لیکن ایک دوسرے کو قدر و منزلت کی نگاہوں سے دیکھتے رہے۔ میر انیس کے انتقال کے بعد ایک سال تک دبیر زندہ رہے لیکن اُنھوں نے اس عرصہ میں شعر کہنا ترک کر دیا تھا اور کہا کرتے تھے۔ ع

سو رسینا بے کلیم اللہ منبر بے انیس

انیس کی طرح مرزا دبیر نے بھی غدر تک لکھنؤ نہیں چھوڑا۔ غدر کے بعد مرشد آباد اور پٹنہ کا سفر کیا۔ اور آخر ۱۸۷۵ء میں وفات پائی اور لکھنؤ میں جس مکان میں سکونت تھی اس میں پیوند خاک ہوئے۔

مرزا صاحب نے چودہ پندرہ برس کی عمر سے مرثیہ کہنا شروع کیا۔ اور تمام عمر مشق سخن جاری رہی۔ پچاس پچپن برس میں کم سے کم تین ہزار مرثیہ لکھا ہوگا۔ نوحوں اور رباعیوں کا کچھ شمار نہیں۔

مرزا صاحب کے کلام کا خاص جوہر تشبیہات اور استعارات ہیں۔ یہ اپنی قوت متخیلہ کے زور سے عجیب عجیب استعارے اور نادر تشبیہیں ڈھونڈھ کر پیدا کرتے ہیں۔ مرزا کا کلام خیال آفرینی، دقت پسندی، جدت بیان۔ شاعرانہ استدلال اور شدت مبالغہ میں اپنا جواب نہیں رکھتا۔ مرزا زبان کی صفائی۔ بندش کی چستی اور مناظر قدرت کی صحیح تصویر کھینچنے سے عاری نہیں ہیں۔ اُن کے یہاں بھی انسانی فطرت کے نمونے نظر آتے ہیں مگر یہ اُن کا خاص رنگ نہیں۔ یہ انیس کا حصہ ہے۔

مرزا دبیر کے بیٹے مرزا جعفر اوج نے اپنے باپ کے نقش قدم پر چل کر نام پیدا کیا اور پٹنہ، حیدرآباد اور رام پور میں ان کی خوب قدر و منزلت ہوئی۔

باب ۸

اُردو شعر و شاعری کا چوتھا دَور (دہلی میں)

تمہید سلطنت مغلیہ کی جڑ کھوکھلی ہو چکی تھی۔ دہلی میں ارباب کمال کا شیرازہ منتشر ہو چکا تھا۔ شعر و شاعری کا مرکز لکھنؤ ہوتا جاتا تھا۔ میرؔ و سوداؔ دہلی کو خیر باد کہہ چکے تھے۔ مصحفیؔ، جرأتؔ و انشاؔ نے لکھنؤ کی صحبتوں کو گرما رکھا تھا۔ لیکن یہ خیال کرنا غلط ہوگا کہ دہلی میں شعر و شاعری کا چراغ قطعی گُل ہو چکا تھا۔ نہیں دہلی میں اب بھی کوئی نہ کوئی صاحب کمال گزشتہ عظمت دہلی پر آنسو بہانے کے لئے موجود تھا۔ یوں تو حکیم ثناء اللہ خاں فراقؔ۔ حکیم قدرت اللہ خاں قاسمؔ شاگرد خواجہ میر دردؔ۔ میاں شکیباؔ شاگرد میرؔ۔ مرزا عظیم بیگ اور شیخ ولی اللہ محبؔ۔ شاگرد سوداؔ۔ حافظ عبدالرحمٰن خاں احسانؔ وغیرہم موجود تھے مگر ان سب کا حال تمہید میں بیان کر دینا ضروری ہے۔ اوّل تو یہ کہ شاہ نصیرؔ ذوقؔ جیسے مسلّم الثبوت استاد کے استاد تھے۔ دوسرے انھوں نے دکن پر وہی احسان کیا جو ولیؔ نے شمالی ہند پر کیا تھا۔ یعنی وہاں ذوق شاعری کو جو ایک عرصے سے سرد ہو چکا تھا گرمایا۔ تیسری خاص بات یہ ہے کہ نصیرؔ نے شعرائے لکھنؤ کے رنگ کو دہلی میں پھیلایا جس کا اثر ان کے شاگرد ذوقؔ کے کلام میں کہیں کہیں ملتا ہے۔

شاہ نصیر نصیر الدین نام۔ نصیرؔ تخلّص۔ شاہ غریب کے بیٹے تھے۔ چونکہ

رنگت کے سیاہ فام تھے۔ اس لیے گھرانے کے لوگ میاں کلو کہتے تھے وطن خاص دہلی تھا۔ شاہ غریب گوشۂ عافیت میں بیٹھے اپنے معتقد مریدوں کو ہدایت کرتے تھے۔ نصیر اُن کے اکلوتے بیٹے تھے۔ اس لیے بڑے ناز و نعم میں پرورش پائی۔ نصیر کی ابتدائی تعلیم نامکمل رہی۔ مگر شاعری نے اس کمی کو کماحقہٗ پورا کر دیا۔ آپ شاہ محمدی مائل کے شاگرد تھے۔

کثرتِ مشق اور لطفِ سخن کی بدولت شاہ عالم بادشاہ کے دربار میں رسائی پیدا کی اور کچھ دنوں ان کی قدردانی کے سایہ میں بسر اوقات کی۔

نصیر نے متعدد سفر کیے۔ خصوصاً لکھنؤ اور حیدرآباد کے۔ دو مرتبہ لکھنؤ تشریف لے گئے۔ اور چار مرتبہ حیدرآباد۔ اور ہر جگہ ان کی خاطر خواہ قدر و منزلت ہوئی۔ لکھنؤ میں ناسخ اور آتش کا عہد دیکھا اُن کے ساتھ مشاعروں میں شامل ہوئے۔ معرکوں میں غزلیں پڑھیں۔ اپنی مشاقی کا سکہ جمایا۔ ناسخ اور آتش جیسے مسلم الثبوت استادوں کی موجودگی میں اپنے شاگرد پیدا کیے۔ لیکن اُن معرکوں سے لکھنؤ کا رنگ کچھ کچھ ان پر بھی اثر کر گیا۔ حیدرآباد میں بڑی قدر ہوئی۔ سیکڑوں شاگرد ہوئے۔ چار مرتبہ وہاں گئے اور چوتھی مرتبہ ایسے گئے کہ پھر وہیں کی خاک دامنگیر میں پیوست ہو گئے۔ سنہ وفات ۱۲۵۴ھ ہے۔

شاہ صاحب نے خود اپنا دیوان مرتب نہیں کیا۔ ان کی وفات کے بعد اُن کے شاگرد نے اُن کے کلام کا مجموعہ مرتب کیا تھا۔ جس کو نواب صاحب رامپور نے خرید لیا تھا۔ مگر حیدرآباد میں ان کی غزلوں کا مکمل دیوان چھپ گیا ہے۔ اس میں صرف غزلیں ہیں اور کچھ نہیں۔

کلام میں شکوہ الفاظ کے ساتھ نئی نئی تشبیہیں اور استعارے پائے جاتے ہیں۔ زمینیں بھی نئی نئی اور سنگلاخ نکالی ہیں جن کو سرسبز کرنا بھی ان ہی کا کام ہے۔ زبان وہی ہے جو سید انشاؔ اور جرأتؔ کی۔ لکھنؤ کے اثر سے کہیں کہیں تصنع اور آورد سے کام لیا گیا ہے۔

اس تمہید کے بعد اب اس دور کے خاص خاص نمائندوں کے حالات پڑھئے۔

شیخ محمد ابراہیم ذوق

شیخ محمد ابراہیم نام۔ ذوقؔ تخلص۔ شیخ محمد رمضان کے بیٹے تھے جو نواب لطف علی خاں کے حرم کے دربان تھے۔ ذوقؔ ۱۷۸۹ء میں پیدا ہوئے۔ حافظ غلام رسول کے مکتب میں ابتدائی تعلیم پائی۔ انھیں شاعری کا چسکا تھا۔ ان ہی کی صحبت میں ذوقؔ کو بھی شعر و سخن کا ذوق پیدا ہوا۔ جب کچھ مشق ہوئی تو شاہ نصیر دہلوی کے شاگرد ہوگئے اور ان کے مشاعروں میں شامل ہونے لگے۔

شعر و سخن سے کچھ ایسی فطری مناسبت تھی کہ چندروزہ مشق سے شہر میں شہرت ہوگئی۔ رفتہ رفتہ مرزا ابوظفر کے دربار میں رسائی ہوگئی جو ان ایام میں ولی عہد تھے۔ اور شعر و سخن سے بھی ذوق رکھتے تھے۔ وہ اپنا کلام اصلاح کے لئے انھیں دینے لگے۔

انیس ۱۹ سال کی عمر میں ذوقؔ نے اکبر شاہ ثانی کی مدح میں ایک پُر زور قصیدہ لکھا جس کے صلے میں ان کو "خاقانیِ ہند" کا خطاب ملا۔ ابتداءً ظفر انھیں چار روپیہ ماہوار وظیفہ دیتے تھے۔ کچھ دنوں بعد پانچ روپیہ کر دیئے تھے۔ جب ظفر تخت نشین ہوئے تو اُن کی تنخواہ پچیس روپئے اور کچھ عرصے بعد سو روپئے

کردی اور خلعت اور تحفوں سے ہمیشہ سرفراز کرتے رہتے تھے۔ ایک گاؤں بھی جاگیر میں دیا تھا مگر اس سے زیادہ متمتع نہ ہو سکے۔ غدر سے دو ڈھائی سال قبل سنہ ۱۸۵۴ء میں وفات پائی۔ مرنے سے چند گھنٹے پیشتر یہ شعر کہا تھا:-

کہتے ہیں آج ذوق جہاں سے گزر گیا   کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے

غدر میں ان کا تمام کلام تلف ہو گیا۔ حافظ غلام رسول ویران نے جو ان کے شاگرد تھے محنت و کاوش سے ایک مختصر دیوان مرتب کر کے شائع کیا۔ اس کے بعد ذوق کے سعادت مند اور فخر استاد شاگرد مولانا محمد حسین آزاد نے ایک دوسرا مجموعہ مرتب کیا۔ مگر یہ بھی مختصر ہے۔ ذوق کو اگر فنا فی الشعر کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ ان کی تمام عمر شعر و شاعری میں بسر ہوئی۔ بات بات پر قصیدے لکھتے تھے۔ غزلوں کا تو کہنا ہی کیا ہے۔ اگر ان کا کلام ضائع نہ ہوتا تو تین چار ضخیم جلدیں بھی اسکی متحمل نہ ہو سکتیں۔ اب جو یہ مختصر مجموعہ نظر پڑتا ہے تو فلک کج رفتار کی ستم ظریفی پر رونا آتا ہے کہ کیا کیا جواہر پارے ہوں گے کہ یوں برباد ہو گئے۔

ذوق قصیدے کے بادشاہ ہیں۔ متقدمین میں سودا اور متوسطین میں ذوق ہیں۔ ان کے بعد اس صنف کی سرد بازاری ہو جاتی ہے۔ ذوق کا مرتبہ اس صنف میں سودا سے کسی طرح کم نہیں بلکہ زبان کی صفائی اور تراکیب کی چستی میں اکثر سودا سے آگے نکل جاتے ہیں۔

غزلیات میں ذوق کا رنگ مختلف وقتوں میں مختلف رہا ہے۔ کہیں خواجہ میر درد کا انداز ہے۔ کہیں جرأت کا رنگ ہے اور کہیں سودا کی جھلک نمایاں ہے اور پھر رفتہ رفتہ یہ تینوں رنگ مل کر ان کا ایک خاص رنگ بن گیا ہے۔ آزاد

فرماتے ہیں کہ ان کی غزل اخیر کو ایک گلدستہ گلہائے رنگا رنگ کا ہوتی تھی۔
دو تین شعر بلند خیال کے۔ ایک دو تصوف کے۔ دو تین معاملے کے۔

عام طور پر ان کے کلام میں برجستگی اور رنگینی پائی جاتی ہے۔ زبان نہایت صاف اور شستہ، طرز بیان منجھا ہوا۔ اور عام فہم، محاورہ، ضرب الامثال کا صرف ایسا برجستہ اور برمحل کرتے ہیں۔ کہ شعر کی دلآویزی بڑھ جاتی ہے عام طور پر کلام میں آمد ہے لیکن کہیں کہیں تصنع اور آورد سے بھی کام لیا ہے۔ اور یہ اُن کے استاد کا اثر ہے۔

ان تمام خوبیوں کے علاوہ کلام میں اخلاقی اور صوفیانہ مضامین نہایت سلیقے سے سجائے ہیں۔ حقائق و معارف کو باتوں باتوں میں نہایت صفائی سے اس طرح کہتے ہیں کہ الجھاؤ پیدا ہونے نہیں دیتے۔

نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:۔

ہنگامۂ سرگرم ہستیٔ ناپائدار کا ۔۔۔ چشمک ہے برق کی کہ تبسم شرار کا
آنا ہے گر آؤ کہ سینہ سے چل کے اب ۔۔۔ آنکھوں میں آکے ٹھہرا ہے دم انتظار کا
ہو پاک دامنوں کو خلش گر سے کیا خطر ۔۔۔ کھٹکا نہیں نگاہ کو مژگاں کے خار کا

اے ذوق ہوش گر ہے تو دُنیا سے دور بھاگ
اس میکدے میں کام نہیں ہوشیار کا

کیا غرض لاکھ خدائی میں ہوں دولت والے ۔۔۔ ان کا بندہ ہوں جو بندے ہیں محبت والے
رہے یوں شیشۂ و ساغر وہ مکدر دونوں ۔۔۔ کبھی مل بھی گئے دو دل جو کدورت والے
نہیں جز شمع مجاور مری بالینِ مزار ۔۔۔ نہیں جز کثرت پروانہ زیارت والے

کبھی افسوس ہے آنا کبھی رونا آنا
دلِ بیمار کے یہ دو ہیں عیادت والے

ایک قطعہ ملاحظہ ہو :۔

کہوں اے ذوق کیا حالِ شبِ ہجر — کہ تھی اِک اِک گھڑی سَو سَو مہینے
نہ تھی شب ڈال رکھا تھا اِک اندھیر — مرے بختِ سیہ کی تیرگی نے
شبِ غم شمع ساں ہوتی نہ تھی کم — اور آتے تھے پسینوں پر پسینے
یہی کہتا تھا گھبرا کر فلک سے — کہ او بے مہر بد اختر کمینے
کہاں میں اور کہاں یہ سب مگر تھے — مری جانب سے تیرے دل میں کینے
سو اِس ظلمت کے پردے میں کئے ظلم — ارے ظالم تری کینہ وری نے
عوض کس بادہ نوشی کے مجھے آج — پڑے یہ زہر کے سے گھونٹ پینے
حواس و ہوش جو مجھ سے قریں تھے — قرینے سے ہوئے سب بے قرینے
مری سینہ زنی کا شور سُن کر — پھٹے جاتے ہیں ہمسایوں کے سینے
اُٹھایا گاہ اور گاہے بٹھایا — مجھے بے تابی و بے طاقتی نے
کہا جب دل نے تو کچھ کھا کے سو رہ — بہت الماس کے توڑے نگینے
نہ ٹوٹا جان سے قالب کا رشتہ — بہت سی جان توڑی جانکنی نے
بہت دیکھا نہ دکھلایا ذرا بھی — طلوعِ صبح سے مُنہ روشنی نے
کہا جی نے مجھے یہ ہجر کی رات — یقیں ہے صبح تک دے گی نہ جینے
لگے پانی چوانے مُنہ میں آنسو — پڑھی یاسیں سرہانے بیکسی نے
مگر دن عمر کے تھوڑے سے باقی — لگا رکھے تھے میری زندگی نے

کہ قسمت سے قریب خانہ میرے اذاں مسجد میں دی بارے کسی نے
بشارت مجھ کو صبح وصل کی دی اذاں کے ساتھ یمن و فرخی نے
ہوئی ایسی خوشی اللہ اکبر کہ خوش ہو کر کہا یہ خود خوشی نے
مؤذن مرحبا بروقت بولا
تری آواز مکے اور مدینے

مرزا اسداللہ خاں غالب

اسداللہ خاں نام۔ مرزا نوشہ لقب نجم الدولہ دبیر الملک خطاب تھا۔ پہلے اسد تخلص تھا۔ پھر بہ مناسبت اسداللہ غالب غالبؔ اختیار کیا۔ والد کا نام عبداللہ بیگ تھا۔ غالب ۱۷۹۷ء میں آگرہ میں پیدا ہوئے۔ ابھی نو برس کے بھی نہ ہونے پائے تھے کہ باپ کے سایہ سے محروم ہو گئے۔ مرزا نصراللہ بیگ غالب کے حقیقی چچا انگریزی فوج میں رسالدار تھے۔ اُن کی ذات اور رسالے کی تنخواہ میں دو پرگنے نواح آگرہ میں مقرر تھے۔ اُنھوں نے بھتیجے کی پرورش کی۔

ابتدائی عمر آگرہ میں بسر ہوئی۔ شیخ معظم اور میاں نظیر اکبر آبادی سے تعلیم پائی۔ اس کے بعد ہرمزد نامی ایک ایرانی سے جو آتش پرست سے مسلمان ہوا تھا۔ فارسی کی تکمیل کی۔ اپنے چچا کے ہمراہ دہلی آئے جن کی شادی نواب فخرالدولہ جاگیردار لہارو کے خاندان میں ہوئی تھی۔ مرزا خود بھی نواب فخرالدولہ کے بھائی نواب الٰہی بخش معروف کی بیٹی سے منسوب ہوئے۔
چچا کے مرنے کے بعد اُن کے وارثوں کی پنشنیں سرکار نے فیروزپور

جو کہ کی ریاست میں مقرر کرادیں جس میں سے سات سو روپیہ سالانہ مرزا کو بھی غدر تک ملتا رہا۔ پچاس روپیہ ماہوار خلعت و خطاب کے ساتھ تاریخ خاندان تیموریہ کے لکھنے کے معاوضہ میں ابو ظفر بہادر شاہ نے مقرر کر دیے تھے۔ غدر کے بعد یہ تنخواہ بند ہو گئی اور بہادر شاہ سے تعلقات رکھنے کی پاداش میں پنشن بھی جاتی رہی۔ دو برس تک انھوں نے بڑی مصیبت میں کاٹے۔ آخر نواب یوسف علی خاں ناظم والی رامپور نے سو روپیہ ماہوار مقرر کر دی۔ لیکن یہ رام پور زیادہ نہ رہ سکے۔ واپس آ گئے اور تین سال کی جد و جہد کے بعد پنشن جاری ہوئی۔ اور کچھ فارغ البالی سے بسر ہونے لگی۔

سنہ ۱۸۳۰ء میں مرزا کلکتہ بھی گئے تھے۔ واپسی پر لکھنؤ بھی قیام کیا۔ واجد علی شاہ کی مدح میں قصیدہ لکھا۔ انھوں نے پانچ سو روپیہ سالانہ وظیفہ مقرر کیا جو انتزاع حکومت تک انھیں ملتا رہا۔

مرزا ۱۸۶۹ء میں راہی ملک بقا ہوئے اور درگاہ حضرت نظام الدین اولیاؒ (دہلی) کے متصل پیوند خاک ہوئے۔

مرزا شگفتہ مزاج تھے، ذہن و ذکاوت کے ساتھ قوت حافظہ بھی لاجواب رکھتے تھے۔ شوخی اور ظرافت مزاج میں بہت تھی۔ تحریر ہو یا تقریر کوئی بات ان کی لطافت و ظرافت سے خالی نہ ہوتی تھی۔ طبیعت میں فیاضی، سیر چشمی اور خودداری کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ کبھی کوئی کام ایسا نہیں کیا جو وضعداری کے خلاف ہو۔ مذہبی تعصبات سے آزاد تھے۔ ہندو مسلمانوں کے ساتھ یکساں محبت اور رواداری کا برتاؤ تھا۔ خود عقیدے کے اعتبار

سے مسلمان تھے۔ توحید اور رسالت پر پکا ایمان رکھتے تھے۔ صوفی منش انسان اور تفضیل حضرت علیؓ کے قائل تھے۔

یوں تو مرزا کی کل فارسی اور اردو تصانیف بارہ تک پہنچتی ہیں مگر یہاں ہمیں صرف اردو تصانیف سے تعلق ہے۔ سو وہ تین ہیں (۱) عود ہندی (۲) اردوئے معلیٰ۔ یہ دونوں آپ کے خطوط کے مجموعے ہیں۔ اور نثر میں ہیں۔ (۳) دیوان اردو۔

مرزا فارسی کے بڑے زبردست شاعر تھے۔ اور انھیں اس پر بجا طور پر ناز بھی تھا۔ اپنے اردو کلام کو فارسی کلام کے مقابلے میں بلند پایہ نہ سمجھتے تھے لیکن زمانے کے انقلاب اور اردو کی عالمگیری نے اُن کے فارسی کلام کو بھلا دیا۔ اور اردو کلام کو لوگوں نے حرزِ جان بنا یا۔

مرزا کے عہد شاہی کو تین ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے (۱) وہ دور جس میں فارسیت کا رنگ ان کی قوت متخیلہ پہ خوب چڑھا ہوا تھا۔ مرزا بیدل کی روش پر چلتے تھے۔ چنانچہ اس دور کے کلام کے متعلق کہا گیا ہے۔
* کلام میر سمجھے اور بیانِ میرزا سمجھے ٭ مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے
لوگوں نے اس ناپسندیدہ انداز اور بے راہ روی کی مذمت کی چنانچہ غالب فرماتے ہیں:۔

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل — سُن سُن کے اسے سخنورانِ کامل
آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمائش — گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

(۲) اس کے بعد ان کے کلام میں انقلاب واقع ہوتا ہے اور وہ رنگ

اختیار کیا جاتا ہے جو عام طور پر دیوان میں موجود ہے (۳)، لیکن آخر عمر میں کلام بہت سہل ہوگیا ہے۔ زبان کی صفائی اور سادگی اس قدر بڑھ گئی ہے کہ معلوم ہوتا ہے گویا باتیں کر رہے ہیں۔

لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ ان کے جیتے جی اور ایک عرصہ بعد تک بھی ان کے کلام کی خاطر خواہ قدر نہیں ہوئی۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کا آسان سے آسان کلام بھی اُس زمانے کے مذاق کے خلاف تھا۔ مگر اب امتداد زمانہ نے ثابت کر دیا ہے کہ غالبؔ صحیح راستہ پر تھے۔ اور غالبؔ نے جب کہا تھا۔

ع

شہرتِ شعرم بہ گیتی بعد من خواہد شدن

تو گویا حقیقت کی ترجمانی کی تھی۔

سب سے پہلے خصوصیت جو ان کے کلام میں ملتی ہے وہ ان کا ذوقِ فارسی اور ندرتِ بیان ہے۔ عام اور مبتذل تشبیہیں ان کے کلام میں کہیں نہیں ملتیں۔ جہاں تک ہو سکتا ہے نئی نئی تشبیہوں سے کام لیتے ہیں۔ مثلاً سانس کو موج سے، بے خودی کو دریا سے، گرداب کو شعلۂ جوالہ سے۔ وغیرہ۔

الفاظ کا انتخاب مرزا کے کلام میں لاجواب ہے۔ زیادہ سے زیادہ مضمون کو کم سے کم الفاظ میں ادا کرتے ہیں۔ ایسی صورت میں بھرتی کے الفاظ کی گنجائش کہاں۔ ایک ایک مصرع میں یہ خوبی ہے کہ اگر اس میں سے کسی لفظ کو نکال کر اس کے بجائے دوسرا ہم معنی لفظ رکھ دو تو معنی میں فرق

پڑ جائے گا۔

طرزِ ادا میں جدت ہے۔ معمولی سے معمولی مضامین کو لیتے ہیں لیکن ندرتِ بیان کے جادو سے اسے کہیں سے کہیں پہنچا دیتے ہیں۔ اگرچہ کلام میں حسن و عشق کو بہت دخل ہے لیکن گل و بلبل کے پھیکے اور بے مزہ افسانے نہیں ہیں۔ بلکہ انسانی فطرت کے عمیق ترین حقائق کے مرقعے تیار کئے گئے ہیں۔ دنیا کی سطحی چیزوں پر نظر ڈال کر مطمئن نہیں ہوتے بلکہ اُن کی شاعرانہ نگاہیں ہر چیز کی حقیقت تک پہنچتی ہیں۔ حیاتِ انسانی کے رموز کی ترجمانی جیسی غالب نے کی۔ اب تک کسی سے نہ بن پڑی۔ فلسفہ اور تصوف کا جہاں تک شاعری سے تعلق ہو سکتا ہے، آپ کے کلام میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔ وحدت الوجود کا طرح طرح سے ذکر کیا ہے۔ غالب کو ہر چیز میں اسی ذاتِ باری تعالیٰ کا جلوہ نظر آتا ہے۔ غالب کے آسان سے آسان کلام میں بھی یہ جملہ خصوصیات اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔

ایک خصوصیت مرزا کی یہ ہے کہ ان کے طرزِ ادا میں ایک خاص چیز ہے جو مومن کے سوا اور شعراء میں نہیں ملتی۔ ان کا کلام ایسا پہلو دار ہوتا ہے کہ بادی النظر میں اس سے کچھ اور معنی مفہوم ہوتے ہیں مگر غور کرنے کے بعد دوسرے معنی نہایت لطیف پیدا ہوتے ہیں۔ جس کی وجہ سے ان کا شعر ہمیشہ نیا لطف دیتا ہے۔

غالب میں ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اُن کے ہاں نہایت لطیف شوخی پائی جاتی ہے۔ اور ایسی شوخی جو دل میں تڑپ اور کیفیت پیدا کر دے سوز و گداز

بھی کلام میں ہے۔ مگر وہ بھی دل کی دردمندانہ کیفیت ہے نہ کہ آہ و بکا۔ اب نمونہ کلام ملاحظہ ہو:-

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا — کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا
کاوِ کاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ — صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا
جذبۂ بے اختیارِ شوق دیکھا چاہیے — سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا
آگہی دامِ شنیدن جس قدر چاہے بچھائے — مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا

بس کہ ہوں غالبؔ اسیری میں بھی آتش زیر پا
موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

دردِ منت کشِ دوا نہ ہوا — میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا
جمع کرتے ہوں کیوں رقیبوں کو — اک تماشا ہوا گلا نہ ہوا
ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں — تو ہی جب خنجر آزما نہ ہوا
کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب — گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا
ہے خبر گرم اُن کے آنے کی — آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا
کیا وہ نمرود کی خدائی تھی — بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا
جان دی دی ہوئی اُسی کی تھی — حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا
زخم گر دب گیا لہو نہ تھما — کام گر رُک گیا روا نہ ہوا
رہزنی ہے کہ دل ستانی ہے — لے کے دل دلستاں روانہ ہوا

کچھ تو پڑھیے کہ لوگ کہتے ہیں
آج غالبؔ غزل سرا نہ ہوا

ایک قطعہ ملاحظہ ہو:۔

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل
زنہار اگر تمھیں ہوسِ نائے ونوش ہے

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو
میری سنو جو گوشِ حقیقت نیوش ہے

ساقی بہ جلوۂ دشمنِ ایمان و آگہی
مطرب بہ نغمہ رہزنِ تمکین و ہوش ہے

یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط
دامانِ باغبان و کفِ گل فروش ہے

لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ
یہ جنّتِ نگاہ وہ فردوسِ گوش ہے

یا صبحدم جو دیکھئے آکر تو بزم میں
نے وہ سرور و شور نہ جوش و خروش ہے

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالبؔ صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

حکیم مومن خاں مومنؔ

محمد مومن خاں نام مومنؔ تخلّص۔ حکیم غلام نبی خاں کے بیٹے سنہ ۱۸۰۰ء میں پیدا ہوئے۔

مولانا شاہ عبدالقادر سے عربی پڑھی۔ اس کے بعد اپنے والد اور چچا سے طب کی کتابیں پڑھیں اور ان کے مطب میں نسخہ نویسی کرنے لگے۔ اسی دوران میں نجوم کا شوق پیدا ہوا۔ چنانچہ اس فن میں بھی کمال حاصل کیا لیکن نہ طب کی انتاد طبع کے موافق تھی اور نہ نجوم۔ عاشق مزاجی کے ساتھ شعر و سخن کی طرف میلان ہوا۔ ابتدا میں شاہ نصیرؔ کو اپنا کلام دکھایا پھر بطور خود مشق سخن کی۔

مزاج میں رنگینی اور طبیعت میں شوخی تھی۔ خوش وضع اور خوش پوشاک عاشق مزاج آدمی تھے لیکن دینداری سے بھی خالی الذہن نہ تھے۔ جوانی میں رشید احمد صاحب شہید کے مرید ہوئے۔ اور آخر وقت تک عقیدہ میں ان ہی کے پیرو رہے۔

تاریخ گوئی میں بڑا کمال پیدا کیا تھا۔ تعمیہ و تخرجہ سے وہ وہ تاریخیں کہی ہیں کہ تعریف نہیں ہوسکتی۔ مولانا شاہ عبدالعزیزؒ کی وفات کی تاریخ ملاحظہ ہو۔

دست بیداد اجل سے بے سروپا ہوگئے ‍ ‍ ‍ ‍ فقر و دیں، فضل و ہنر، لطف و کرم، علم و عمل

قصائد بھی کلیات میں موجود ہیں۔ درجہ میں بھی بلند ہیں لیکن انھوں نے صلہ کی امید پر ارباب دنیا کی مدح کبھی نہیں کی۔ دیوان میں مخمس، مسدس، ترجیع بند۔ مرثیہ وغیرہ سبھی کچھ موجود ہے۔ کلیات کئی بار چھپ چکا ہے اور ہر جگہ ملتا ہے۔

مومن نے متعدد سفر بھی کئے۔ رام پور بھی گئے۔ اور جہانگیر آباد بھی مگر کہیں قیام نہیں کیا۔ بقول میر۔

دل کے دھتے کوچے اوراق مصور تھے ‍ ‍ ‍ ‍ جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی

ان کے ذوق نظر سے ولی کی گلیاں کب چھوٹتی ہیں۔ آخر اسی خاک پاک سے ۱۸۵۱ء میں ملک بقا کو سدھارے اور دلی دروازے کے باہر حضرت شاہ عبدالعزیز علیہ الرحمہ کے مقبرے کے قریب دفن ہوئے۔

مومن بڑے پایہ کے شاعر اور مسلم الثبوت استاد ہوئے ہیں۔ انکی زبان میں

بڑی خصوصیت ان کا ذوق فارسی ہے۔ ایسی نئی اور انوکھی فارسی ترکیبیں بے تکلفی سے استعمال کرجاتے ہیں کہ خیال میں وسعت پیدا ہو جاتی ہے اور شعر کا حسن دو بالا ہو جاتا ہے۔

ان کے خیالات نہایت نازک اور مضامین عالی ہوتے ہیں۔ عاشقانہ جذبات و خیالات میں ندرت بیان سے وہ لطافتیں اور نزاکتیں پیدا کرتے ہیں کہ فرسودہ سے فرسودہ مضامین میں بھی جان پڑ جاتی ہے۔ تشبیہ و استعارہ کی رنگینی نزاکت خیال میں اور بھی رنگینیاں بھر دیتی ہے۔ جہاں صفائی پر اُترتے ہیں وہاں جرأت کا دھوکا ہوتا ہے اور جہاں بلند خیالی پر تلتے ہیں۔ وہاں اپنی نظیر آپ ہوتے ہیں۔

ان کے ہاں خاص طور پر یہ بات نمایاں ہے کہ اکثر موقعوں پر مضمون کے بعض اجزاء چھوڑ جاتے ہیں۔ جس سے ایک خاص لطف پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ وہ موقعے ہوتے ہیں جہاں سُننے والے کا ذہن خود بخود اس جزو کی طرف منتقل ہو سکتا ہے۔ یہ بڑا نازک پہلو ہے۔ ذرا سی بے اعتدالی سے کلام پیچیدہ ہو جاتا ہے۔ لیکن مومن نے اسے اس سلیقہ سے برتا ہے کہ کہیں پیچیدگی اور اُلجھاؤ پیدا نہیں ہوتا۔

ایک اور خاص انداز مومن کے ساتھ مخصوص ہے۔ وہ یہ ہے کہ کہیں کہیں آپ محبوب سے وہ بات کہتے ہیں جس میں بظاہر محبوب کا فائدہ ہوتا ہے۔ لیکن حقیقت میں خود عاشق کا فائدہ متصور ہوتا ہے۔ مثلاً

غیروں پہ کھل نہ جائے کہیں راز دیکھنا میری طرف بھی غمزۂ غماز دیکھنا

مومن اپنے تخلص کو مقطع میں اس طرح کھپاتے ہیں کہ لفظ مومن اپنے معنی

دینے لگتا ہے اور شعر کا جزوِ لاینفک بن جاتا ہے۔

اب کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

غیروں پہ کھل نہ جائے کہیں راز دیکھنا ۔۔۔ میری طرف بھی غمزۂ غماز دیکھنا
اُڑتے ہی رنگِ رُخ مرا نظروں سے تھا نہاں ۔۔۔ اس مرغِ پر شکستہ کی پرواز دیکھنا
دشنامِ یار طبعِ حزیں پر گراں نہیں ۔۔۔ اے ہم نفس نزاکتِ آواز دیکھنا
دیکھ اپنا حالِ زار منجم ہوا رقیب ۔۔۔ تھا سازگار طالعِ ناساز دیکھنا
بدکام کا مآل بُرا ہے جزا کے بعد ۔۔۔ حال سپہر تفرقہ انداز دیکھنا

ترکِ صنم بھی کم نہیں سوزِ جحیم سے
مومن غمِ مآل کا آغاز دیکھنا

ہم سمجھتے ہیں آزمانے کو ۔۔۔ عذر کچھ چاہیے ستانے کو
صبحِ عشرت ہے وہ نہ شامِ وصال ۔۔۔ ہائے کیا ہو گیا زمانے کو
برق کا آسمان پر ہے دماغ ۔۔۔ پھونک کر میرے آشیانے کو
شکوہ ہے غیر کی کدورت کا ۔۔۔ سو مرے خاک میں ملانے کو
کوئی دن ہم جہاں میں بیٹھے ہیں ۔۔۔ آسماں کے ستم اُٹھانے کو

چل کے کعبہ میں سجدہ کر مومن
چھوڑ اس بُت کے آستانے کو

آنکھوں سے حیا ٹپکے ہے انداز تو دیکھو ۔۔۔ ہے بوالہوسوں پر ستم ناز تو دیکھو
اس بُت کے لیے میں ہوسِ حور سے گزرا ۔۔۔ اس عشق خوش انجام کا آغاز تو دیکھو
چشمک مری وحشت پہ ہے کیا حضرتِ ناصح ۔۔۔ طرزِ نگہِ چشمِ فسوں ساز تو دیکھو

محبلس میں مرے ذکر کے آتے ہی اُٹھے وہ — بدنامیٔ عشاق کا اعزاز تو دیکھو

محفل میں تم اغیار کو دزدیدہ نظر سے — منظور ہے پنہاں نہ رہے راز تو دیکھو

اس غیرتِ ناہید کی ہر تان ہے دیپک — شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو

دیں پاکیِ دامن کی گواہی مرے آنسو — اس یوسفِ بے درد کا اعجاز تو دیکھو

جنت میں بھی مومن نہ ملا ہائے بتوں سے
جورِ اجلِ تفرقہ پرداز تو دیکھو

تبصرہ

اُردو شاعری کے اس چوتھے دور کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ایسا محض سہولت کو مدِ نظر رکھ کر ہی نہیں کیا گیا بلکہ اس کی ضرورت بھی تھی۔ شعرائے لکھنؤ اور شعرائے دہلی کے مطالعہ سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ دونوں مقامات کی شاہراہیں مختلف سمتوں میں جاتی ہیں۔ کیا بلحاظ زبان اور کیا بلحاظ رنگ شاعری حضرات لکھنؤ اور دہلی میں پورب پچھم کا فرق ہے۔ لہٰذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ نہایت اختصار کے ساتھ ان دونوں اسکولوں کی الگ الگ خصوصیات اور ان کا باہم فرق بتا دیا جائے۔ اسی ضمن میں اس مکمل دور کی خصوصیات اور اہمیت پر بھی روشنی پڑ جائے گی۔

لکھنؤ اور دہلی اسکولوں کی خصوصیات اور ان کا باہمی فرق سمجھنے کے لئے ان دونوں مقامات کے ملکی، سیاسی اور سوشل حالات کو ذہن نشین کرنا ضروری ہے۔ یہ تو سب جانتے ہیں کہ ملکی، سیاسی اور سوشل حالات

علم و فن ہی پر نہیں بلکہ مکمل حیات انسانی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ بہ الفاظ دیگر انسان مع اپنے جملہ علم و ہنر اعمال و کردار کے ان ہی سوشل حالات کا پر تو ہوتا ہے۔ افراد کا مذاق۔ ان کا میلان طبع۔ ان کی شاعری بلکہ اس شاعری کا ایک ایک لفظ ان ہی حالات، کیفیات اور ماحول کی کارفرمائی کا آئینہ ہے۔

شمالی ہند میں اردو شعر و شاعری کی ابتدا دلی کے دہلی آنے یعنی ۱۷۲۲ء سے ہوئی۔ ہندوستان میں خاندان مغلیہ کا چراغ۔ چراغ سحری بنا ہوا تھا۔ محمد شاہ کے عہد میں گو درخت ہرا بھرا نظر آتا تھا۔ لیکن جڑ کو دیمک چاٹ گئی تھی۔ رفتہ رفتہ وہ ہرا بھرا درخت بھی سوکھنا شروع ہوا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اکبر اعظم کی اولاد شاہ شطرنج بن کر رہ گئی۔ اور ان کی قلمرو سمٹ کر قلعہ معلیٰ دہلی میں سما گئی۔ آخری دو بادشاہ محض وظیفہ خوار تھے۔ ظاہر ہے کہ جب حکومت کا یہ حال ہو تو رعایا کا حال اس سے بھی ابتر ہوگا۔ دہلی اور گرد و نواح کا علاقہ گویا ایک جہاز تھا۔ آگے خطرناک بھنور اور پیچھے طوفان باد و باراں۔ ایسی حالت میں کہاں کی نیند اور کہاں کی عیش و عشرت نان شبینہ ہی کے لالے تھے۔

مشہور ہے کہ انسان رنج و غم کی حالت میں فلسفی اور مذہبی آدمی بن جاتا ہے۔ اس کی نگاہیں سطح سے گزر کر دل کی گہرائیوں میں اترنے لگتی ہیں۔ حیات اور اس کے لوازم پر غور و خوض کرنے کا اس میں مادہ پیدا ہو جاتا ہے۔

شعراء دہلی کو یہ فضا نصیب ہوئی۔ چنانچہ ان کا کلام۔ ان ہی

کیفیات کا حال ہے۔ صوفیانہ خیالات سے بھرا ہوا ہے۔ کلام میں سوز و گداز دل کی اصلی کیفیت کو ظاہر کرتا ہے۔ جو بات ہے دل سے نکلی ہوئی ہے اور اسی لئے اثر رکھتی ہے۔ مختصر یہ کہ وہ حقیقی معنوں میں شاعر ہیں۔ بعض شاعر ایسے بھی نظر آئیں گے جو ہنسنے اور ہنسانے کی کوشش کریں گے۔ مگر اُن کا ہنسنا زہر خندہ سے زیادہ نہیں۔

چوتھے دور کے شعراء ذوق۔ غالب، مومن اُس پُر آشوب عہد کے شعراء ہیں جس میں ہنگامۂ غدر نے رہی سہی شاہی بساط بھی اُلٹ دی تھی۔ ذرا ان شعراء کے کلام کا غور سے مطالعہ کرو۔ لفظ لفظ میں سوز و گداز اور حرف حرف میں درد مندانہ کیفیت موجود ہے۔ دماغ سوچنے کے، دل محسوس کرنے کے اور نگاہیں تہ میں بیٹھ جانے کی عادی ہیں۔ جو بات کہتے ہیں دل سے نکلی ہوئی اور اثر میں ڈوبی ہوئی۔ ان کا عشق سچا ہے۔

ان کا معشوق حسن ہے کوئی حسین نہیں۔ تعریف حسن کی ہے کسی حسین کی نہیں۔ غرض یہ کہ عشق و حسن کے ظاہری لوازمات پر ان کی نظر نہیں ٹھہرتی۔

میر و سودا کے عہد سے دہلی اُجڑنی شروع ہوئی۔ جسے دیکھئے لکھنؤ کی طرف کھنچا جاتا ہے۔ آخر لکھنؤ میں وہ کیا بات تھی کہ ہر کس و ناکس کا ملجا و ماوا بنا ہوا تھا۔ وہ یہ بات تھی کہ اودھ میں نسبتاً امن و امان کا دور دورہ تھا۔ والی فیاض اور علم و فضل قدردان تھے۔ دولت کی فراوانی تھی اور اسے بے دریغ خرچ کیا جاتا تھا۔

شاہان اودھ میں نواب سعادت علی خاں خود شاعر اور شاعروں کے قدردان تھے۔ ان کے بیٹے غازی الدین حیدر بھی شاعری کا ذوق رکھتے تھے۔ ان کے بیٹے نصیر الدین حیدر بھی شاعر تھے۔ مزاج میں لاابالی اور لہو لعب حد سے زیادہ تھا۔ مے نوشی حد اعتدال سے متجاوز ہوگئی تھی۔ دس برس اور پانچ روز سلطنت کی اور اس قلیل مدت میں محاصل ملک کے علاوہ بیس کروڑ روپیہ منجملہ اندوختہ نواب سعادت علی خاں کے صرف میں آیا۔ نصیر الدین حیدر کے بعد محمد علی شاہ اور ان کے بعد امجد علی شاہ اور سب سے آخر میں واجد علی شاہ بادشاہ ہوئے۔ انھوں نے تو ہر بات کی حد کردی۔ بیس سال کی عمر میں تخت نشین ہوئے۔ مصاحبوں نے کمسن اور ناتجربہ کار سمجھ کر ڈورے ڈالنے شروع کئے۔ اور آخر واجد علی شاہ کو جان عالم پیا کر کے چھوڑا۔ دو کروڑ روپیہ لگا کر قیصر باغ بنوایا۔ جو حقیقت میں عیش منزل اور عشرت کدہ تھا۔ ہزاروں مہ لقا رشک حور ارباب نشاط سے رشک ارم بنا ہوا تھا۔ اور واجد علی شاہ ان کے حسن و شباب کے تنہا مالک تھے۔ ان بے اعتدالیوں کا جو نتیجہ خود بادشاہ کے حق میں ہوا۔ وہ اس کتاب کے موضوع سے خارج ہے۔ البتہ جو نتیجہ اردو ادب کے لئے مرتب ہوا اس کا تذکرہ کرنا ضروری ہے۔

بادشاہوں کی حالت کا دھندلا سا نقشہ دیکھ چکے۔ خود سمجھ لو کہ رعایا کی کیفیت کیا ہوگی۔ بچہ بچہ اسی رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ عام عیش و عشرت بے فکری، فراوانی دولت، اس عہد کی خصوصیات ہیں۔

جہاں رنج و غم کی حالت میں انسان مذہبی اور فلسفی بن جاتا ہے وہاں خوشی، مسرت اور بے فکری کی حالت میں سبک خیال اور چھچھورا پن جاتا ہے۔ یاس عظیم آبادی کیا خوب فرماتے ہیں۔

بجز ارادہ پرستی خدا کو کیا جانے وہ بدنصیب جسے بخت نارسا نہ ملا

خیالات میں گہرائی نہ ہو اور ہزاروں مہ جبیں زود برو عشوہ فروش ہوں تو نگاہیں مرہوبات، انگیا اور ڈوپٹے میں اُلجھ کر نہ رہ جائیں تو کیا کریں آرزوئیں ہجر و فراق کی خوگر نہ ہوں اور جام وصال کا دور چل رہا ہو تو عشق بوالہوسی کا مترادف کیوں نہ بنے۔ کثرت وصال نے آتش دل کو سرد کر دیا ہو تو جذبات کہاں سے پیدا ہوں اور جب جذبات پیدا نہ ہوں تو انداز بیان میں صفائی، سادگی اور صداقت کیونکر پیدا ہو، ناچار تکلف اور تصنع سے کام لینا پڑتا ہے۔ مضمون کے تارے آسمان سے اتارنے پڑتے ہیں۔ موشگافیاں کی جاتی ہیں۔ کوہ کنی کرنی پڑتی ہے اور جوئے شیر کے عوض گھاس کا تنکا نکال کر لایا جاتا ہے۔ اور جب ان تکلفات لایعنی سے بھی کام نہیں چلتا اور اثر پیدا نہیں ہوتا تو پھبتی کے زور سے اور ضلع جگت کی مدد سے لوگوں کے دلوں پر کاوش جستجو اور دقت نظر کا سکہ بٹھایا جاتا ہے۔ آخر تسلیم گھبرا کر چلا اٹھتے ہیں ؎

میں ہوں اے تسلیم شاگرد نسیم دہلوی مجھ کو طرز شاعران لکھنؤ سے کیا غرض

لیکن ان تکلفات بارد سے زبان اردو نے خوب فائدہ اٹھایا خوب منجھ کر صاف ہوئی اور اس کی وسعت بڑھ گئی۔ اور انصاف تو یہ

ہے کہ دہلی کی نسبت لکھنؤ کی زبان میں زیادہ فصاحت، زیادہ بلاغت، زیادہ لطافت اور زیادہ وسعت پیدا ہوگئی۔ چنانچہ حسرت موہانی نے از راہ انصاف ایک شعر میں دہلی کی شاعری اور لکھنؤ کی زبان کی تعریف کی ہے ؎

ہے زبان لکھنؤ میں رنگ دہلی کی نمود   تجھ سے حسرت نام روشن شاعری کا ہوگیا

واضح ہو کہ لکھنؤ اور دہلی اسکولوں کا جو یہ فرق دکھایا گیا ہے وہ اب موجود نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ کاغذ کی ناؤ ہمیشہ نہیں چل سکتی۔ جب وہ بے اعتدالیاں حد سے بڑھ گئیں تو بقول حفیظ جالندھری ؎

تنزل کی میں انتہا چاہتا ہوں   کہ شاید یہی ہو ترقی کا زینہ

شعرائے لکھنؤ ہی میں سے چند برگزیدہ شعرا نے علم بغاوت بلند کیا اور ان سب بے عنوانیوں کا قلع قمع کرکے رکھ دیا۔ ان برگزیدہ شعراء کا تذکرہ آئندہ ادوار میں آتا ہے۔ آج لکھنؤ اور دہلی کی شاعری ایک ہے۔ البتہ زبان میں کچھ فرق ہے اور وہ بھی فروعی یعنی چند الفاظ کی تذکیر و تانیث اور چند الفاظ کے تلفظ کے متعلق۔

آخر میں اگر اردو کی مایۂ ناز صنف مرثیہ نگاری کی طرف اشارہ نہ کیا گیا تو بحث نامکمل رہ جائے گی۔

واضح ہو کہ شاہان اودھ اعتقاداً و عملاً امامیہ مذہب سے تعلق رکھتے تھے اور یہی وجہ ہے کہ لکھنؤ اور مضافات میں مذہب امامیہ کا زیادہ رواج تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لکھنؤ میں صنف مرثیہ نگاری کو بڑا فروغ

ہوا۔ فروغ ہی نہیں ہوا بلکہ یہ صنف ترقی کر کے باقی تمام اصناف پر فوقیت لے گیا۔ برخلاف اس کے دہلی میں مرثیہ کا سراغ نہیں ملتا۔ غالب نے کوشش کر کے ایک مرثیہ لکھا مگر انصاف کہتا ہے کہ شعرائے دہلی خواہ امامیہ مذہب ہی سے تعلق رکھتے ہوں اور میدان کے مرد نہیں۔

مرثیہ کی عالمگیری اور ہر دل عزیزی نے لکھنؤ کی غزل پر ایک خاص اثر ڈالا۔ جو اسی زمانے تک محدود نہیں رہا۔ بلکہ آج کل بھی پایا جاتا ہے۔ وہ یہ کہ سوز و گداز کو جو غزل کی جان تھی آہ و بکا اور نالہ و فریاد میں تبدیل کر دیا۔ بعض شعراء کے کلام پر مرثیت چھا گئی۔ علالت، موت، آہ و زاری اور ماتم کے مضامین اس کثرت سے بندھے کہ خاص خاص الفاظ اور اصطلاحیں زبان زد خاص و عام ہو گئیں۔ مثلاً عشق کو مرض کہا گیا ہے۔ اور اضطراب شوق کو نزع، نزع کے بعد موت کا آنا لازمی ہے اور موت پر ماتم کرنا ضروری۔ نتیجہ یہ نکلا کہ غزل کی صاف اور شیریں زبان میں وہ وہ الفاظ آ گئے جو غالباً مرثیہ ہی کے لئے موزوں تھے۔ مثلاً نوحہ، ماتم، میت، جنازہ، تربت۔ گور غریباں، لوح مزار وغیرہ۔

اگلے صفحہ پر بطور خلاصہ دہلی و لکھنؤ اسکولوں کی خصوصیات کا نقشہ پیش کیا جاتا ہے۔

دیکھو صفحہ ۱۲۵

بہ لحاظ	دہلی اسکول	لکھنؤ اسکول
زبان	صاف، سادہ، رواں، بے تکلف	پُر تکلف۔ تصنع، آورد، صنائع و بدائع، اظہار علم و فضل
شاعری	جذبات و احساسات اثر تصوف و فلسفہ اخلاق پُر اثر × عشق حسن کی تعریف	مضمون آفرینی، خیال بندی، بے اثری۔ × اخلاق شاعرانہ استدلال اور تمثیل میں ڈوبا ہوا۔ ہوس لوازمات
صنف شاعری	×	مرثیہ (جذبات نگاری۔ کردار نویسی۔ اخلاق۔ منظر نگاری رزمیہ بیانات۔ مسلسل روایات)
خدمت زبان	زبان کی نزاکت، خوشنما فارسی ترکیب محاورات و ضرب الامثال	زبان کی صحت۔ اصول کی پابندی متروکات قواعد تذکیر و تانیث

باب ۹

اُردو شعر و شاعری کا پانچواں دَور

تمہید گذشتہ ابواب میں متعدد بار اشارۃً عرض کیا جا چکا ہے کہ غدر ۱۸۵۷ء سے بہت قبل دہلی کی حالت بہت خراب ہو چکی تھی۔ تاہم خاندان مغلیہ کے آخری چشم و چراغ اپنی ہمت سے زیادہ ارباب ہنر کی قدر و منزلت کرتے تھے۔ بہادر شاہ اگرچہ پنشن خوار تھے۔ لیکن شعراء کی پرورش کرتے رہتے تھے۔ ہنگامۂ غدر نے ان رہے سہے قدردانوں کو بھی نیست و نابود کر دیا۔

دہلی سے اجڑنے والوں کا ملجا و ماویٰ لکھنؤ تھا۔ لیکن ۱۸۵۶ء میں انتزاع سلطنت اودھ کے بعد لکھنؤ کی بھی وہ حالت نہ رہی نتیجہ یہ نکلا کہ دہلی اور لکھنؤ کے شعرا خانماں برباد اِدھر سے اُدھر پھرنے لگے۔ انگریزی حکومت کے ارباب حل و عقد زبان اُردو اور اُس کے ادب کی قدر و قیمت کیا سمجھ سکتے تھے۔ لے دے کے چند دیسی ریاستیں تھیں۔ جہاں شعر و سخن کی اس گئی گذری حالت میں بھی قدر کی جاتی تھی۔ چنانچہ دہلی اور لکھنؤ کے شعرا نے رامپور، حیدرآباد، جے پور، ٹونک اور دیگر ریاستوں کا رخ کیا۔ اور کسی نہ کسی طرح تنگی ترشی سے زندگی کے بقیہ ایام گزار دیئے۔

شعرائے دہلی شعرائے دہلی جو غدر کے بعد تلاش معاش میں سرگردان

اِدھر اُدھر بکھرے۔ تین ہیں (۱) ظہیر (۲) انور (۳) داغ۔

شعرائے لکھنؤ لکھنؤ کے شعراء کی ایک بڑی تعداد تو مٹیا برج کلکتہ میں واجد علی شاہ کے ہمراہ تھی۔ باقی چند اِدھر اُدھر منتشر ہوگئے۔ جن میں سے بحرؔ، منیرؔ، قلقؔ، امیرؔ اور امیر نواب صاحب رامپور کی ادب نوازی کے سایہ میں رامپور پہنچے۔

قبل اس کے کہ اس دور کے دو خاص نمائندوں یعنی داغ دہلوی اور امیر لکھنوی کا تذکرہ کیا جائے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ظہیر اور انور کا مختصر تذکرہ اس تمہید میں کر دیا جائے کیونکہ یہ دو ہستیاں وہ ہیں جنھوں نے ٹونک اور جے پور میں مذاق شاعری کو عام کرکے وہاں شعراء کی ایک جماعت پیدا کر دی۔

ظہیر سید ظہیر الدین نام۔ ظہیر تخلص۔ خلف سید جلال الدین حیدر۔ خوشنویس دہلی کے رہنے والے اور ذوق کے شاگرد تھے۔ غدر کے بعد مختلف مقامات پر قسمت آزمائی کرنے کے بعد رامپور پہنچے اور چار سال وہاں قیام کیا۔ اس کے بعد دہلی واپس آئے۔ یہاں ایک کمپنی میں ایک معمولی آسامی پر آپ کا تقرر ہوگیا۔ لیکن کچھ عرصے کے بعد "جلوۂ طور" بلند شہر کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ اسی دوران میں مہاراجہ شو دیان سنگھ والئ الور نے آپ کو طلب کیا۔ چار سال آپ وہاں رہے۔ لیکن کسی وجہ سے وہ مقام بھی راس نہ آیا۔ غلام مصطفیٰ خاں شیفتہ کی سفارش سے جے پور پولیس میں آپ کسی آسامی پر مامور ہوگئے۔ جہاں

انیس سال تک آپ رہے۔ مہاراجہ رام سنگھ والئی جے پور کے مرنے کے بعد آپ ٹونک گئے اور چودہ سال وہیں مقیم رہے۔ آخر میں آپ حیدرآباد پہنچے مگر قسمت نے یاوری نہ کی اور امیدواری کی دوران ہی میں راہی ملک بقا ہوئے۔ تاریخ وفات سنہ ۱۹۱۱ء ہے۔

ظہیر بڑے پایہ کے شاعر تھے۔ اگرچہ ذوق کے شاگرد تھے۔ لیکن اُن کے کلام میں مومن کا رنگ زیادہ ہے۔ اُن کے تین دیوان شائع ہو چکے ہیں چوتھا دیوان ان کے خاندان میں محفوظ ہے۔

انور سید شجاع الدین نام۔ اُمراؤ مرزا عرف انور تخلص۔ ظہیر کے چھوٹے بھائی اور ذوق کے شاگرد تھے۔ ذوق کی وفات کے بعد غالب کو بھی کلام دکھایا ہے۔ طبیعت نہایت دقت پسند اور مضمون خیز پائی تھی۔ طرز مومن کے پورے پورے مقلد اور غالب کے استعارہ بالکنایہ کی خوش اسلوب ترکیب کے پیرو تھے۔ الغرض ذوق، غالب اور مومن کے جداگانہ طرزوں کو سموکر ایک خاص رنگ ایجاد کیا تھا

دستبرد غدر سے پریشان ہو کر جے پور جا رہے تھے آخر وہیں ۲۸ سال کی عمر میں انتقال کیا۔ یوں تو انور کی استادی کا سکہ جے پور میں اب تک رائج ہے اور رہے گا۔ لیکن ان کے فخر استاد شاگرد مولانا اشفاق رسول جوہر گذشتہ سال سنہ ۱۹۲۵ء میں فوت ہوئے۔ خاکسار راقم الحروف نے حضرت جوہر کا کلام خود اُن ہی کی زبانی سنا تھا۔ ایک شعر ہدیۂ ناظرین ہے:۔

جدھر جھک گئی وہی کعبہ ہوا جبیں اپنی قبلہ نما ہو گئی۔

اور بہت پُر گو شاعر تھے لیکن ان کا کلام بہت کچھ ضایع ہو گیا۔ لالہ شری رام دہلوی مؤلف "خمخانۂ جاوید" نے ایک دیوان مرتب کر کے شائع کیا تھا۔ جس کے متعلق مؤلف فرماتے ہیں کہ اُن کے کلام کا آٹھواں حصہ بھی نہیں ہے۔ اسی طرح مولانا جوہر مرحوم نے بھی ایک مجموعہ کلام انور کا شائع کیا تھا۔ تبرک کے طور پر ایک شعر انور کا ملاحظہ ہو:۔

نہ ہم سمجھے نہ آپ آئے کہیں سے ۔۔۔ پسینہ پونچھیے اپنی جبیں سے

داغ دہلوی نواب مرزا خاں داغ دہلوی ۱۸۳۱ء میں پیدا ہوئے ابھی عمر کے چھ سات سال ہی گزرے تھے کہ سایۂ پدری سے محروم ہو گئے۔ ان کی والدہ نے بہادر شاہ کے بیٹے مرزا فخرو سے نکاح کر لیا۔ اس طرح قلعہ معلیٰ دہلی سے آپ کا مستقل تعلق ہو گیا اور اس تعلق کی بدولت جو خصوصیت اور آسانیاں تعلیم میں آپ کو نصیب ہوئیں وہ عام طور سے عام لوگوں کو میسر نہیں آسکتیں۔ سپاہ گری کے جملہ فنون کے علاوہ شعر و سخن کا شوق طبیعت میں پیدا ہوا قلعہ معلّٰی میں شاعری کی گرم بازاری تھی۔ آپ کی خداداد ذہانت اور ہونہار طبیعت کا رجحان اس طرف زیادہ رہا۔ ذوق بادشاہ اور ولی عہد کے استاد تھے۔ داغ بھی اُن ہی کے شاگرد ہوئے۔ اُس وقت آپ کا سن گیارہ بارہ برس کا تھا۔

ہنگامہ غدر سے دس ماہ پیشتر ولی عہد مرزا فخرو کا انتقال ہو گیا۔ اور پھر غدر نے عیش و عشرت کی نشاط کو تہ کر دیا۔ اس انقلاب کے بعد مرزا معہ اپنے قبائل کے رامپور چلے گئے۔ اور نواب یوسف علی خاں سے کے

سایۂ عاطفت میں پناہ گزیں ہوئے۔ نواب صاحب اپنی حیات تک بطور مہمان نوازی سلوک کرتے رہے اُن کے بعد نواب کلب علی خاں نے بھی وہی قدر دانی کی اور مرزا صاحب کو اپنی مصاحبت میں رکھا اور بطور مصاحب خاص کارخانہ جات اصطبل و گاڑی خانہ وغیرہ سپرد کیا۔ ۲۴ سال تک مصاحبت کے ساتھ اُن خدمات کو نہایت خوبی سے انجام دیتے رہے۔

رامپور میں نواب یوسف علی خاں ناظم کے زمانہ سے شعر و سخن کی گرم بازاری تھی۔ غالب۔ حیا۔ بحر۔ قلق۔ عروج۔ اسیر۔ منیر۔ تسلیم۔ جلال۔ امیر مینائی وغیرہ ہم سب نامی شعراء ریاست کے دعاگو تھے اور بجز غالب مرحوم سب ہی یہیں قیام رکھتے تھے۔ مشاہیر امراء کے ہاں اور خاص نواب صاحب کی طرف سے مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ سرکاری مشاعروں کا اہتمام و انتظام مرزا داغ صاحب ہی کے سپرد ہوتا تھا اور مشاعرے میں ان کی غزل پر لوگوں کی نگاہیں رہا کرتی تھیں۔

چالیس سال کے قیام کے بعد آپ نے رامپور کو خیرباد کہا۔ مختلف شہروں کی سیر و سیاحت کے بعد حیدرآباد پہنچے۔ تین سال کی امید واری کے بعد میر محبوب علی خاں نظامِ دکن کے استاد مقرر ہوئے۔ ایک ہزار روپیہ ماہوار وظیفہ مقرر ہوا۔ اور ورود حیدرآباد کے وقت سے اس تاریخ تک ایک ہزار روپیہ ماہوار کے حساب سے مرحمت فرمایا گیا۔ گویا نقصانات کی تلافی بھی شاہانہ الطاف کی بدولت ہوگئی۔ علاوہ اس مقررہ وظیفے کے وقتاً فوقتاً جو عطیات شاہی ہوئے ان کی تفصیل بیکار ہے۔ آخر اٹھارہ برس حیدرآباد میں باعزت و آبرو بسر کرکے ۱۷ فروری ۱۹۰۵ء کو آٹھ روز مرض فالج میں مبتلا رہ کر دارِ فانی سے انتقال فرمایا۔

مرزا صاحب کے تین دیوان اور ایک مثنوی مطبوعہ موجود ہیں اور چوتھا دیوان یادگار داغ بھی تیار تھا۔ چاروں دیوانوں میں "گلزار داغ" اور "آفتاب داغ" زمانۂ قیام رامپور کے چھپے ہوئے ہیں۔ ان دیوانوں میں اکثر وہی غزلیں ہیں جو رام پور کے مشاعروں میں کہی گئی تھیں "مہتاب داغ" حیدرآباد کے قیام کا نتیجہ ہے۔ مثنوی " فریاد داغ" زمانۂ قیام رامپور میں کہی گئی "یادگار داغ" نامی چوتھا دیوان مرزا داغ کی وفات کے بعد لاہور سے چھپ کر شائع ہوا۔

مرزا داغ غزل گوئی کے مسلم الثبوت استاد اور اپنے طرز میں بے مثل شاعر تھے۔ جملہ اصناف سخن پر قادر تھے۔ اُن کے کلام کا خاص رنگ سہل ممتنع ۔ فصاحت ۔ روزمرہ کی صفائی، شوخی مضمون اور بیان کی ندرت ہے۔ زبان صاف شستہ اور بندش برجستہ بایں ہمہ مضمون میں شوخی اور تیکھاپن اس درجہ ہے کہ شعر بے مثل ہوجاتا ہے اور دل میں چٹکی لئے بغیر نہیں رہتا۔ حسن داد کے دل فریب نظارے اختلاط کی نوک جھونک کے مضمون جس صفائی اور نفاست سے اُن کے دیوانوں میں پائے جاتے ہیں وہ ان ہی کا حصہ ہے۔ چونکہ کلام میں معاملہ بندی ۔ شباب اور سرمستی کی تصویریں جا بجا ہیں۔ لہٰذا کہیں کہیں یہ تصویریں عریاں بھی ہوگئی ہیں۔ اور کہیں کہیں شوخی حد سے تجاوز کرکے ابتذال کی حد تک پہنچ گئی ہے

مرزا صاحب کی شہرت خاص و عام اور قبول و دوام کا ثبوت اس امر سے ملتا ہے کہ ہندوستان کے گوشے گوشے میں شعراء کی کثیر تعداد آپ کے تلمذ سے مستفید ہوئی اور جس قدر اچھے شاعر آپ نے ملک میں پیدا کئے۔ اسکی نظیر نہیں

میں نہیں آئی۔ کل شاگردوں کی تعداد ڈیڑھ ہزار کے قریب ہے۔ جن میں سے بعض ارشد تلامذہ کے نام یہاں درج کئے جاتے ہیں۔ بیخود بدایونی۔ احسن مارہروی۔ نوح ناروی۔ نسیم بھرت پوری۔ بیخود دہلوی۔ آغا شاعر دہلوی۔ آزاد۔ حیرت۔ باغ سیفعلی۔ جگر مرادآبادی۔ ڈاکٹر اقبال۔ سائل دہلوی وغیرہم۔ بطور نمونہ چند متفرق اشعار ملاحظہ ہوں۔

رخ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں
اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا اِدھر پروانہ آتا ہے

تو تمہاری طرح تم سے کوئی جھوٹے وعدہ کرتا
تمہیں منصفی سے کہہ دو تمہیں اعتبار ہوتا

ترے وعدہ پر ستمگر ابھی اور صبر کرتے
اگر اپنی زندگی کا ہمیں اعتبار ہوتا

یہ مزہ تھا دل لگی کا کہ برابر آگ لگتی
نہ تجھے قرار ہوتا نہ مجھے قرار ہوتا

خاطر سے یا لحاظ سے میں مان تو گیا
جھوٹی قسم سے آپ کا ایمان تو گیا

دیکھا ہے بتکدے میں جو اے شیخ کچھ نہ پوچھ
ایمان کی تو یہ ہے کہ ایمان تو گیا

شاگردان داغ دہلوی

بیخود دہلوی سید وحیدالدین نام۔ بیخود تخلص۔ خاص دہلی کے رہنے والے داغ کے شاگرد بلکہ جانشین اور اس رنگ کے استاد ہیں۔ داغ ان کی زباندانی اور مہارت فن کا اعتراف کیا کرتے تھے داغ کی زبان ان کی زبان ہے۔ فصاحت روزمرہ کے ساتھ خیال بندی کی طرف زیادہ میلان ہے۔ بڑے خلیق، ملنسار زندہ دل

اور پابند وضع شخص ہیں۔ مگر فی الحال پیرانہ سالی کے ساتھ مٹیا محل دہلی میں گوشہ نشین ہیں اور مشاعروں میں شاذونادر ہی رونق افروز ہوتے ہیں۔ دیوان شائع ہو چکا ہے۔ نمونۂ کلام یہ ہے :-

نگاہ غیر کی جانب خطاب ہے مجھ سے ۔۔۔ تری قسم کا یقین اب مزور میں نے کیا
تمنا سی شاطرنہ دیکھی نہ دیکھیں ۔۔۔ تصور میں نقشے جماتی ہے کیا کیا
نہ دیکھا تھا جو بزم دشمن میں دیکھا ۔۔۔ محبت تماشے دکھاتی ہے کیا کیا
ٹوٹنے سے اور پیدا دل میں جوہر ہو گیا ۔۔۔ قیمتی شیشہ ہمارا بال پڑ کر ہو گیا
کیا اسی کا نام الفت ہے کہ جب دیکھا اسے ۔۔۔ خود بخود اک جوش پیدا دل کے اندر ہو گیا
ناپ لیجئے اپنے گیسو کی درازی قد سے آپ ۔۔۔ اب تو یہ فتنہ قیامت کے برابر ہو گیا
آنکھ کہتی ہے کہ اب برباد کرتے ہیں تجھے ۔۔۔ منہ سے یہ ارشاد ہے دل میں ترا گھر ہو گیا

سائل دہلوی ابوالمعظم نواب سراج الدین احمد خاں المتخلص بہ سائل دہلوی خاندانی وقار کے ساتھ ذاتی قابلیت کے مالک ہیں۔ نواب مرزا خاں داغ دہلوی کے داماد اور ان ہی کے شاگرد رشید ہیں۔ ۶۷/۶۸ سال کی عمر ہے اور لال کنواں واقع دہلی میں اقامت گزیں ہیں۔ سائل حسن صورت اور وجاہت شخصی کے ساتھ وضعداری، اخلاق اور خلوص کی صفات سے متصف ہیں۔ راقم الحروف آپ کی خدمت میں اکثر حاضر ہوتا رہتا ہے۔ نہایت شگفتہ طبیعت پائی ہے اور زباںنداق تو خاص آپ کا حصہ ہے۔ اردوئے معلیٰ کے اِنے گنے نام لیوا بزرگوں میں آپ کا دم غنیمت ہے

ان چند بزرگوں کے بعد دلّی کا نام ہی رہ جائے گا۔

سائل صاحب کو جملہ اصناف سخن پر قدرت حاصل ہے۔ مگر غزل میں مسلّم الثبوت استاد ہیں۔ محاورہ کی خوبی روزمرّہ کی صفائی سلاست اور روانی آپ کی زبان کی خصوصیات ہیں۔ آپ کی غزل حدودِ غزل سے باہر نہیں نکلی۔ حُسن و عشق کے علاوہ فلسفیانہ اور صوفیانہ مضامین کو اس میں دخل نہیں۔ کلام میں شوخی کی نمکینی اور شگفتگی کی شیرینی عجیب لطافت پیدا کردیتی ہے۔ مبتذل اور عامیانہ مضامین سے آپ کا کلام پاک ہوتا ہے۔ البتہ کہیں کہیں ایسے الفاظ لے آتے ہیں جو اکثر عوام ہی کی زبان سے سنے جاتے ہیں۔

سائل، مومن کی طرح مقطع میں اپنے تخلص کو خوب کھپاتے ہیں۔ اس طرح کہ مقطع اور تخلص دونوں میں جان پڑجاتی ہے۔ کلام ہنوز شائع نہیں ہوا۔ اگر کبھی ہوا تو کئی جلدوں میں ہوگا۔ نمونہ یہ ہے۔

عارض بھی سُرخ سُرخ ہیں لب لال لال بھی ۔۔۔ شانِ جمال بھی ہے نمایاں جلال بھی

توبہ بھی کرنی پڑتی ہے پی کر اسے مدام ۔۔۔ نام اسکا بس بھی ہے عرق انفعال بھی

فصلِ گُل اب آگئی وحشت کا ساماں دیکھیے ۔۔۔ سنگِ طفلاں دیکھیے خارِ بیاباں دیکھیے

دعویٔ آہن گدازی میرا اگر باور نہیں ۔۔۔ تیر کچھ دل میں چبھو کر اُن کے پیکاں دیکھیے

کیوں کسی سے پوچھیے خستہ سری کا ماجرا ۔۔۔ قفل کھلوا کر درو دیوار زنداں دیکھیے

ہمیں کہتی ہے دنیا زخم دل زخم جگر والے ۔۔۔ ذرا تم بھی تو دیکھو تم بھی ہو آخر نظر والے

اہلِ محشر دیکھ لوں قاتل کو تو پہچان لوں ۔۔۔ بھولی بھولی شکل تھی اور کچھ بھلا سا نام تھا

آغا شاعر قزلباش دہلوی

محلہ گنو نالہ واقع دہلی میں اقامت گزیں ہیں۔ داغ کے رنگ کو چمکانے والے شاعر اور شاعر گر استاد ہیں۔ کلام میں شوخی کی انتہا نہیں، لیکن اس کے ساتھ ہی کہیں کہیں عامیانہ پن بھی پایا جاتا ہے۔ محاوروں کے نظم کرنے کا بہت شوق ہے اور یہی شوق بعض اوقات عامیانہ محاوروں کے استعمال پر بھی مجبور کر دیتا ہے۔ کلام شائع نہیں ہوا۔ نمونہ یہ ہے:-

پی پلاکر اُسے رحمت کی قسم دیتے ہیں
کیسے بندے ہیں کہ اللہ کو دم دیتے ہیں

اُن کے ہتھوں میں نہ آجائے گا بندہ نواز
مفت کا آپ کو اغیار بھرم دیتے ہیں

داغ لیتے ہو جو دل پر تو ذرا ٹھنڈک سے
مُہر کے واسطے کاغذ کو بھی نم دیتے ہیں

جب مرے ہونٹوں سے لعل شکریں جھوٹے ہوئے
لفظ جو دشنام کے نکلے وہ سب ٹوٹے ہوئے

بزم دشمن سے اب آئے ہو مزے لوٹے ہوئے
ہوش میں آؤ کہیں جڑتے ہیں دل ٹوٹے ہوئے

وائے ناکامی کہ گلشن میں خزاں آنے لگی
دو ہی دن گذرے تھے ہم کو قید سے چھوٹے ہوئے

نوح ناروی

محمد نوح نام، نوح تخلص۔ موضع نارہ ضلع الہ آباد کے رئیس اور حضرت داغ دہلوی کے جانشین ہیں۔ الہ آباد اور اطراف میں ایک بڑی جماعت شعراء کی آپ کے دامنِ فیض میں پرورش پا رہی ہے۔ چنانچہ منشی سکھدیو پرشاد بسمل الہ آبادی آپ کی استادی کو تسلیم کر رہے ہیں۔

حضرت نوح کے کلام میں فصاحت، صفائی اور سلاست تو وہی ہے جو

حضرت داغ کے کلام میں ہے۔ لیکن شوخی اور تیکھا پن نہیں۔ غزلیات میں فلسفیانہ اور صوفیانہ پیچیدگیاں تو نہیں لیکن خیالات میں کچھ عمق ضرور ہے بعض اوقات الفاظ اور جملوں کو دُہرا کر شعر میں لطف پیدا کر دیتے ہیں۔ مجموعہ کلام چھپ چکا ہے۔ نمونۂ کلام یہ ہے :۔

شوق کہتا ہے کہ برقِ حسنِ جاناں دیکھئے ۔۔۔ دیکھنا مشکل ہو لیکن تابِ امکاں دیکھئے

عالمِ جوشِ جنوں کے دونوں منظر ایک ہیں ۔۔۔ ہاتھ میں دامن کہ دامن میں گریباں دیکھئے

ہو اگر ذوقِ نظر تو کیا ہے جلوؤں کی کمی ۔۔۔ لاکھ پردوں میں ضیائے شمع عرفاں دیکھئے

دل اُلجھ کر رہ گیا کھل کر یہ میں کہتا نہیں ۔۔۔ احتیاطاً آپ اپنی زلف پیچاں دیکھئے

ہر برس معمول اپنا یہ جنوں میں ہو گیا ۔۔۔ اس طرف آئے بہار اُس سمت زنداں دیکھئے

بری شامت جو آئی بڑھ کے قدموں پر جبیں رکھ دی
جہاں سے تیغ قاتل نے اُٹھائی تھی وہیں رکھ دی

امیر مینائی — منشی امیر احمد نام۔ امیر تخلص۔ خلف مولوی کرم محمد نصیر الدین حیدر کے عہد حکومت میں ۱۸۲۸ء میں بمقام لکھنؤ پیدا ہوئے۔ آپ کا نسبی سلسلہ بہت ہی قریب حضرت مخدوم شاہ مینا صاحب نوّر اللہ مرقدہٗ سے ملتا ہے جن کا مزار مقدس لکھنؤ میں زیارت گاہ خاص و عام ہے یہی وجہ ہے کہ امیر کے نام نامی کے ساتھ مینائی لکھا جاتا ہے آپ کو صرف خاندانی فضیلت ہی حاصل نہ تھی بلکہ اپنی ذات سے خود بھی صاحب زہد و تقویٰ، صوفی مشرب، خدا پرست، درویش صفت، منکسر المزاج آدمی تھے۔

خاندانِ چشتیہ صابریہ کے سجادہ نشین حضرت امیر شاہ صاحب سے بیعت رکھتے
تھے اور بعد میں خرقۂ خلافت سے بھی سرفراز ہوئے تھے۔

آپ کی تعلیم دارالعلوم فرنگی محل لکھنؤ میں ہوئی۔ فہم سلیم و ذہانت فطری
کی امداد سے عربی و فارسی میں کامل دستگاہ حاصل کی۔ اس کے علاوہ طب،
جفر، نجوم وغیرہ میں بھی معلومات بہم پہنچائی تھی۔

جس عہد میں امیر نے ہوش سنبھالا وہ عہد شاعری کا نہایت سرگرم
زمانہ تھا۔ چنانچہ آپ کی طبیعت بھی شعر و سخن کی طرف مائل ہوئی۔ سید مظفر علی
خاں اسیر سے شرفِ تلمذ حاصل کیا۔ استاد کے فیض، ناسخ کی بلند پروازی اور
آتش کی آتش بیانی نے اُن کی نوخیز طبیعت میں عاشقانہ رنگ پیدا کیا۔ صبا،
وزیر، رند، خلیق کی نغمہ سرائیوں اور انیس و دبیر کی معرکہ آرائیوں نے آپ
کی رہنمائی کی شہرت روز افزوں ترقی کرتی گئی۔ حتیٰ کہ واجد علی شاہ اختر
کے دربار میں باریابی ہوئی اور حسب الحکم دو کتابیں "ارشاد السلطان"
اور "ہدایت السلطان" تصنیف کر کے خلعت فاخرہ اور انعام و اکرام حاصل کیا۔

الحاقِ اودھ کے بعد نواب یوسف علی خاں والیٔ رامپور نے آپ کو
طلب فرمایا اور عدالت دیوانی میں معزز آسامی پر مامور کیا۔ اُس وقت
سے آپ کی مستقل سکونت بجائے لکھنؤ کے رامپور میں منتقل ہو گئی۔

یوسف علی خاں کے بعد نواب کلب علی خاں نے شعر و سخن کی جو قدردانی
فرمائی۔ اُس کا تذکرہ کیا جا چکا ہے۔ رامپور میں شعرائے باکمال کا جمگھٹا تھا اور
تغزل کا گلشن لہلہا رہا تھا۔ امیر اس فضا میں چالیس بیالیس سال تک

اپنی شاعری کا ڈنکا بجاتے رہے۔ مرزا خاں داغ ۔ مدت سے حیدرآباد میں
فارغ البالی سے بسر اوقات کر رہے تھے ۔ چنانچہ انھوں نے اپنے قدردان اور
دوست حضرت امیر مینائی کو بھی وہیں طلب کیا۔ امیر کو بھی شوق تھا چنانچہ
گئے۔ لیکن وہاں پہنچتے ہی علالت نے آگھیرا۔ ایک ماہ اور نو روز بیمار رہ کر
راہی ملک بقا ہوئے۔ سال وفات سنہ ۱۹۰۰ء ہے۔

امیر نے متعدد تصانیف یادگار چھوڑیں، ان میں دو کتابوں کا نام
اوپر آچکا ہے۔ باقی مشہور تصانیف یہ ہیں:۔ دو مثنویاں "نور تجلی" اور
"ابر کرم" اور چار مسدس "صبح ازل" "شام ابد" لیلۃ القدر، ذکر شاہ انبیا
چھ واسوخت ۔ دو دیوان "مراۃ الغیب" اور "صنم خانۂ عشق" ان کے
علاوہ امیر نے ایک لغت بھی لکھنی شروع کی تھی اور اس کا نام "امیر اللغات"
رکھا تھا۔ صرف دو جلدیں جن میں صرف الف اور بے کی تقطیع شامل ہے۔
لکھی جاسکی تھیں کہ دست قضا و قدر نے ان کے ہاتھ سے قلم چھین لیا۔ یہ دونوں
جلدیں جس قابلیت، تحقیق و جستجو سے لکھی گئی ہیں اور جس قدر مفید ہیں، اس سے
پتہ چلتا ہے کہ اگر یہ عظیم الشان کام پایۂ تکمیل کو پہنچ جاتا تو زبان
اردو کی کیسی مہتم بالشان خدمت ہوتی۔

امیر کی شاعرانہ عظمت کا سکہ لوگوں کے دلوں میں بیٹھا ہوا ہے۔
ان کا ابتدائی کلام لکھنؤ اسکول کی شاعری کا اچھا نمونہ ہے۔ وہی خشک اور
پھیکی تشبیہات وہی بے کیف استعارات وہی ظاہری حسن کی تعریف و توصیف
وہی تصنع اور وہی آورد۔ غرض ان کا پہلا دیوان "مراۃ الغیب" اسی قسم

کی شاعری سے پُر ہے۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ کہیں کہیں نزاکت اور رنگینی سے کلام میں دلکشی پیدا ہو جاتی ہے۔

دوران قیام رامپور میں مرزا داغ کے رنگ میں کہنے لگے تھے۔ دوسرا دیوان "صنم خانۂ عشق" اسی دور کی یادگار ہے۔ اس دیوان کا خاص رنگ فصاحت اور ترنم ہے۔ شوخی بھی ایک حد تک پائی جاتی ہے جو کہیں کہیں متانت سے دور بھی جا پڑی ہے۔ تصوف کی ہلکی سی چاشنی بھی موجود ہے لیکن غالب رنگ اُن کے کلام کا حُسن و عشق ہی ہے۔ خیالات میں عمق، جذبات میں شدت اور احساسات میں رنگینی پائی جاتی ہے۔

امیر کی زبان عام طور پر صاف اور سلیس اور بول چال اور محاورات کے لحاظ سے لکھنؤ کی ٹکسالی زبان کا اعلیٰ نمونہ ہے۔

امیر کو دیگر اصناف سخن خصوصاً قصیدہ پر بھی قدرت کامل حاصل تھی۔ نعتیہ غزلیات و قصائد بھی خوب لکھتے تھے۔ آپ کے بعض خطوط بھی شائع ہوئے ہیں جن میں لطف زبان کے ساتھ ساتھ طرز بیان نہایت دلکش اور بے ساختہ ہے۔

چند اشعار بطور نمونہ ملاحظہ ہوں۔

نہ ہوگا بند جب تک نقد جاں باقی ہے قالب میں
سخی کے گھر کا دروازہ ہے چاک اپنے گریباں کا

جگر کو دوں کہ دل کو دوں بتا اے ناوک قاتل
کہ دو پیاسوں میں ہے یہ ایک قطرہ آب پیکاں کا

وہ زخمی ہیں تڑپ کیسی چھڑکتا گر نمک قاتل
وہاں زخم سے ہر جوم لیتے منھ نمک داں کا

کہیں ضبط فغاں سے عشق کے آثار چھپتے ہیں
لب خاموش سے پیدا ہے صدمہ درد پنہاں کا

مگر اُڑتی ہوئی پریاں پھنسانے کا ارادہ ہے
ہوا پر جال پھیلایا ہے کیوں زلف پریشاں کا

ہاتھ رکھ کر مرے سینہ پر جگر تھام لیا
تم نے اس وقت تو گرتا ہوا گھر تھام لیا

ترے بندے دل سے کرتے ہیں یہ بُت دعویٰ خدائی کا
تماشا دیکھتا ہوں تیری شانِ کبریائی کا

خدا نے ان بتوں کو کچھ نئی طینت عنایت کی
خمیر ان کا بنا ہے کھینچ کے جوہر بے وفائی کا

اک دل ہمدم مرے پہلو سے کیا جاتا رہا
سب تڑپنے تلملانے کا مزہ جاتا رہا

کھو گیا دل کھو گیا رہتا تو کیا ہوتا امیر
جانے دو اک بے وفا جاتا رہا جاتا رہا

شاگردانِ امیر مینائی لکھنوی

ریاض خیر آبادی منشی سید ریاض احمد نام۔ ریاض تخلص خلف منشی طفیل احمد۔ خیر آباد کے رہنے والے تھے۔
ابتدائی تعلیم خیر آباد کے مدرسہ عربیہ میں ہوئی۔ مگر ابھی فارغ التحصیل نہیں ہوئے تھے کہ شاعری کا چسکا پڑ گیا پہلے اسیر سے تلمذ اختیار کیا تھا۔ بعد میں امیر سے

اصلاح لی۔ خیرآباد سے اردو شعر و سخن کا ایک رسالہ "گل کدۂ ریاض" نامی جاری کیا۔ کچھ مدت کے بعد "ریاض الاخبار" نکالا۔ لیکن لکھنؤ کی فضا پسند تھی۔ چنانچہ "ریاض الاخبار" کے دفتر کو وہیں اٹھا لائے۔ یہ اخبار پندرہ سولہ برس تک نہایت کامیابی کے ساتھ چلتا رہا۔ اس کے بعد آپ نے سرکاری ملازمت اختیار کرلی۔ سپرنٹنڈنٹ پولیس گورکھپور کے سررشتہ دار ہوگئے۔

ان ہی ایام میں نواب کلب علی خاں مرحوم نے ان کی تیزی طبع اور خوش فکری کی شہرت سن کر رام پور طلب کیا۔ مگر آپ وہاں کچھ زیادہ قیام نہیں کرسکے۔ اخبار کے ساتھ ساتھ ایک چھوٹا سا ضمیمہ "فتنہ" و "عطر فتنہ" کے نام سے ان ہی ایام میں نکالنے لگے۔ اس میں چلبلے مضامین اور منتخب اشعار درج ہوتے تھے۔ گورکھپور میں پندرہ برس فارغ البالی سے گذارنے کے بعد آپ پھر لکھنؤ چلے آئے۔ راجہ محمود آباد ان کی بہت قدردانی کرتے تھے۔

ریاض نے سال گذشتہ ۱۹۳۵ء میں اس دنیائے فانی سے عالم جاودانی کی طرف کوچ فرمایا۔

ریاض کی زباندانی مسلم ہے۔ اغلاط سے کلام پاک ہوتا ہے اور وہ ایک طرز خاص کے موجد سمجھے جاتے ہیں۔ قبول عام کا یہ عالم ہے کہ ان کے جیتے جی ان کے اکثر اشعار ضرب الامثال کے طور پر لوگوں کی زبانوں پر چڑھے ہوئے تھے۔

مزاج میں لاأبالی پن اور وارفتگی جو رندانہ مزاجی کا لازمہ ہے زیادہ تھی۔ اور یہی وجہ ہے کہ کلام میں شوخی اور بے چینی حد سے زیادہ ہے مگر لطف یہ کہ کہیں ابتذال اور عامیانہ پن نہیں آنے پاتا۔ زبان میں صفائی اور فصاحت بدرجۂ کمال موجود ہے سچے عشق کی تصویریں۔ اُن کے کلام میں کم ہیں۔ معاملہ بندی، ہنسی ٹھٹھول، جلی کٹی، واعظوں پر پھبتی، رندانہ بے تکلفی کے مضامین اُن کے کلام میں بڑے دلکش پیرایہ میں ملتے ہیں۔ خمریات یعنی شراب و کباب کے مضامین جس کثرت سے ریاض کے ہاں ملتے ہیں اور کسی شاعر کے کلام میں نہیں ملتے۔ اس کے ساتھ ہی یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ تصوّف اور اخلاق کے رنگ کی بھی کہیں کہیں جھلک نظر آتی ہے۔ نازک خیالی کی بھی کمی نہیں۔ اگرچہ تخیل کا میلان قدرتی طور پر رندانہ حسن پرستی، معاملہ اور رنداق کا پہلو لئے ہوئے ہے مگر ادھر شعبوں میں بھی طبیعت بند نہیں۔

اب کلام سے لطف اُٹھایئے۔

پری اُڑنے میں زلفِ عنبریں معلوم ہوتی ہے
یہ کالی شکل بھی کتنی حسیں معلوم ہوتی ہے

چلی بھی تیغ تو کس ناز سے رک رک کے تھم تھم کر
یہ کچھ اُن سے زیادہ نازنیں معلوم ہوتی ہے

ارے ساقی ذرا میری شرابِ تلخ تو لانا
مئے کوثر تو بالکل انگبیں معلوم ہوتی ہے

مئے چرانے میں ہمیں ہے یہ طولی کیسا
ہر اٹھالا ئے سبو آج اچھوتا کیسا

جائیے جایئے ہم حشر میں ملنے کے نہیں
آئیے آئیے اب وعدۂ فردا کیسا

قرض لایا ہے کوئی بھیس بدل کر شاید
مے فروشوں کا ہے واعظ سے تقاضا کیسا

جب یہ مل جائیں کلیجے سے لگا لے ان کو
ان حسینوں سے کسی بات کا شکوہ کیسا

کوئی منہ چوم لے گا اس نہیں پر
شکن رہ جائے گی یوں ہی جبیں پر

پاک صاف ایسی ہے جس نے پی فرشتہ بن گیا زاہد و یہ حور کے دامن میں ہے تھائی ہوئی

حضرت جلیل مانکپوری

حافظ جلیل حسن نام، جلیل تخلص۔ خلف مولوی حافظ عبدالکریم مرحوم۔ مانکپور کے رہنے والے اور امیر مینائی مرحوم کے شاگرد رشید اور جانشین ہیں۔ بیس سال کی عمر میں حضرت امیر مرحوم کے شاگرد ہوئے۔ اور عرصہ دراز تک دفتر امیر اللغات کے سکریٹری رہے۔ امیر مینائی کے ہمراہ حیدر آباد دکن گئے اور اُن کے بعد وہیں قیام کیا۔ امیر مرحوم کی وفات کے بعد مرحوم کے بعض تلامذہ مثلاً حضرت ریاض، مضطر و تسلیم وغیرہ نے آپ کو مرحوم کا جانشین قرار دیا۔ چنانچہ اب وہ اسی لقب سے مشہور ہیں۔ اکثر تلامذہ امیر مرحوم آپ سے مشورہ کیا کرتے تھے۔ فارسی کی استعداد فاضلانہ ہے اور عروض و قوافی میں خاص دخل رکھتے ہیں۔ سلطنت آصفیہ نے بجا طور پر آپ کی قدردانی کی ہے اور آپ کو "فصاحت جنگ" کا خطاب دیا ہے۔

جلیل مسلّم الثبوت اُستاد ہیں۔ کلام کا پایہ بہت بلند ہے۔ سادگی زبان و صفائی زبان کے ساتھ ساتھ بلند پروازی اور نازک خیالی دو متضاد صفتیں آپ کے کلام میں جمع ہوئی ہیں۔ اگرچہ اکثر اشعار رعایت لفظی اور محاورہ بندی سے باہر نہیں ہوتے۔ تاہم بندش کی چستی اور بیان کی سلاست اس رنگ کو دلچسپ بنا دیتی ہے۔ اخلاقی اور صوفیانہ مضامین بھی ان کے کلام میں ملتے ہیں لیکن یہ ان کا خاص رنگ نہیں۔ خاص رنگ حسن عشق کا اظہار اور جذبات نگاری ہے۔ لیکن اس رنگ میں بلاغت، متانت، خوش مذاقی اور بلند خیالی کو نہیں چھوڑتے۔ زبان کی سلاست اور

روزمرہ کی صفائی کا یہ عالم ہے کہ ہر خاص و عام آپ کے کلام سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو :۔

جب ترے عشق کا پھندہ مری گردن میں رہا — پھر برابر ہے قفس میں کہ نشیمن میں رہا
لوگ آرام کی خاطر رہے دنیا میں خراب — اور آرام چھپا گوشۂ مدفن میں رہا
چاک دامانیٔ یوسف تو کوئی بات نہ تھی — ہائے وہ چاک زلیخا کے جو دامن میں رہا

رات دل سے مرے اس درد کے نالے نکلے — گھر سے اپنے وہ کلیجے کو سنبھالے نکلے
پھر سر چرخ دھواں دھار گھٹائیں آئیں — پھر ہوا کھانے حسیں گیسوؤں والے نکلے
نازو انداز نے تنہا انھیں چلنے نہ دیا — ساتھ سب گوشۂ دامن کو سنبھالے نکلے

جلال لکھنوی

حکیم سید ضامن نام۔ جلال تخلص۔ خلف حکیم اصغر علی لکھنؤ کے رہنے والے۔ سادات عظام میں سے تھے۔ خاندان میں کئی پشت سے طبابت کا سلسلہ جاری تھا۔ جلال کے والد اپنے وقت کے مشہور طبیب تھے۔

جلال ۱۸۳۴ء میں بمقام لکھنؤ پیدا ہوئے۔ نواب آصف الدولہ کے مدرسہ میں تعلیم پائی لیکن کتب درسیہ کی تکمیل نہ ہونے پائی تھی کہ شعر و سخن کا شوق دامنگیر ہوا۔ ابتدا میں امیر علی خاں ہلال شاگرد رشک کو اپنا کلام دکھایا۔ کچھ عرصے کے بعد ہلال نے خود انھیں اپنے استاد رشک کا شاگرد کرا دیا۔ جب رشک سفر عراق کے لئے روانہ ہوئے تو جلال برق سے مشورہ کرنے لگے۔

جلال ہمیشہ فنا فی الشعر رہے اور قلیل مدت میں کامل شہرت حاصل کرلی۔ جب ان کا شہرہ رامپور پہنچا تو نواب کلب علی خاں نے انھیں طلب کیا یہ وہاں پہنچے مگر نواب صاحب کی عمر نے وفا نہ کی اور ... ماہ بعد ان کا انتقال ہوگیا۔ نواب کلب علی خاں کی قدردانی و سخن فہمی کے سایہ میں جلال فارغ البالی سے رامپور میں قیام پذیر رہے۔ امیر مینائی۔ داغ اور جلال میں اکثر صحبتیں گرم رہتی تھیں۔ مشاعروں میں شریک ہوتے تھے اور ہم طرح غزلیں کہہ کر اپنے اپنے رنگ کی داد لیتے تھے۔ ان تینوں اساتذہ میں کمال اتحاد و یگانگت تھی۔ داغ کو رامپور چھوڑنے کے بعد ان کی جدائی کا کمال افسوس تھا، چنانچہ فرماتے ہیں ؎

اے داغ ہے دکن سے بہت دور لکھنؤ   ملے امیر اب و سید جلال سے

نواب کلب علی خاں کے انتقال کے بعد ریاست مانگرول کاٹھیاواڑ کے قدرداں رئیس کے اصرار پر جلال کئی برس وہاں بھی قیام پذیر رہے۔ آخر عمر میں لکھنؤ آرہے تھے اور وہیں بتاریخ ۲۰ اکتوبر ۱۹۰۹ء آپ نے انتقال فرمایا۔

جلال نے چار دیوان یادگار چھوڑے (۱) "شہید شوخ طبع" (۲) "کرشمہ جات سخن" (۳) "مضمون ہائے دلکش" (۴) "نظم نگارین" ان کے علاوہ کئی رسالے لغت و عروض وغیرہ پر آپ نے تصنیف فرمائے تھے۔

جلال کے مسلم الثبوت استاد ہونے میں کسی کو کلام نہیں۔ علمی قابلیت کے علاوہ آپ کو فن سخن میں محققانہ اور مجتہدانہ رتبہ حاصل تھا۔ اور تمام اصناف سخن پر قدرت کامل رکھتے تھے۔ ناسخ مرحوم کے

خاندان شاعری کے آخری یادگار اور لکھنؤ کی ٹکسالی زبان اور لکھنؤ اسکول کی شاعری کے آخری نمائندے تھے۔

جلال کا کلام گلہائے رنگارنگ کا گلدستہ ہے کہیں تشبیہہ ہے کہیں خیال گوئی کسی جگہ عاشقانہ رنگ ہے کہیں محض معاملہ بندی لیکن ہر جگہ زبان کی صحت اور قواعد کی پابندی کا اس حد تک خیال رکھا گیا ہے کہ عام طور پر ان کا کلام پھیکا اور بے نمک ہو گیا ہے۔ اگرچہ لوازمات حسن کی تعریف و توصیف سے ان کا کلام اکثر پاک ہے۔ تاہم علوئے خیال اور صداقت جذبات کی نمایاں کمی محسوس ہوتی ہے۔ کلام کا بڑا حصہ پست اور عامیانہ ہے۔ شاعرانہ حیثیت سے جلال کو امیر مینائی اور داغ کے مقابلے میں پیش نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن زبان و محاورات کے صحیح استعمال اور قواعد کی پابندی سے جو خدمات زبان کی آپ نے کی ہیں، ان کا تقاضا ہے کہ آپ کو اس دور میں نمایاں جگہ دی جائے

بطور نمونہ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

آرزو ہے کہ بلا کر اسے دل میں رکھئے
صاحب خانہ جو بن جاتا ہے مہمان ہو کر

نزع میں اس لئے کھولے ہوئے بال آئے ہیں وہ
روح عاشق کی جو نکلے تو پریشاں ہو کر

قتل عالم کو کیا پھر بھی نہ ٹھہرے قاتل
بھولے بن کر کہیں چھوٹے کہیں ناداں ہو کر

کلیجہ کوئی تھام کر رہ گیا ہے
ادھر جانے والے ادھر دیکھ لینا

فلک ترتے ہوں گے جیالوں کی صورت
دکھائے گی جو چشم تر دیکھ لینا

تماشا مری بے قراری کا آکر
شب وعدہ تم رات بھر دیکھ لینا

آرزو لکھنوی سید انور حسین نام آرزو تخلص خلف میرزا ذاکر حسین ۱۲۸۹ھ ۱۸۷۲ء میں بمقام لکھنؤ پیدا ہوئے۔ پانچ سال کی عمر سے سلسلۂ تعلیم شروع ہوا۔ عربی و فارسی مشہور علمار سے پڑھی۔ بارہ برس کی عمر سے شعرِ سخن کا شوق ہوا۔ حکیم ضامن علی جلال لکھنوی سے علم عروض حاصل کیا اور انھیں سے اصلاح سخن لینے لگے۔ پہلے اُمید تخلص اختیار کیا تھا۔ بعد میں آرزو ہوگئے۔ استاد کی توجہ ذاتی قابلیت اور کثرتِ مشق سے تھوڑے عرصے میں اُستادی کا مرتبہ حاصل کرلیا۔

. . . .

آرزو جلال لکھنوی کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں اور لکھنؤ اسکول کی اُس شاعری کی یادگار ہیں جس پر رامپور کے زمانے میں دہلی اسکول کی شاعری کا رواج ہو چکا تھا۔ آپ کو جملہ اصناف سخن پر قدرت کامل حاصل ہے۔ لیکن آپ کی شاعرانہ جدو جہد کا خاص میدان غزل ہے۔ زبان صاف و شیریں ہے۔ ہندی الفاظ اور فقرے نہایت لطف سے استعمال ہوئے ہیں۔ محاورات اور ضرب الامثال کو بھی التزاماً نظم کرتے ہیں لیکن کمال یہ ہے کہ برجستگی قائم رہتی ہے۔ رعایت لفظی جو لکھنؤ اسکول کی امتیازی خصوصیت ہے۔ آپ کے کلام میں موجود ہے کہیں کہیں تصنع اور آورد کا شائبہ بھی پایا جاتا ہے۔ غزلیات میں عام طور پر ایک دردانگیز یاس پائی جاتی ہے جو غالباً امیر کی تقلید کا اثر ہے۔ شوخی۔ ادا بندی اور

نوک جھونک کا عنصر بھی موجود ہے لیکن متانت اور سنجیدگی کے قوانین کے خلاف ورزی کہیں نہیں پائی جاتی۔

آرزو صاحب نے حال ہی میں غزل کے لئے ایک خاص زبان ایجاد کی ہے اور اس کا نام خالص اُردو رکھا ہے۔ اس میں عربی و فارسی الفاظ اور تراکیب کا دخل نہیں۔ تاہم فصاحت سے گرنے نہیں پاتی۔ ظاہر ہے کہ اس خالص اُردو کا میدان کسی قدر تنگ ہوگا۔ اگرچہ زبان عام فہم ہے۔ ہندی داں حضرات بھی اس سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہ زبان کچھ مفید بھی ثابت ہو سکتی ہے اور سوائے غزل کے چند اشعار کے کچھ اور کام بھی اس سے لیا جا سکتا ہے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:۔

جانچ کر تاب نظر کو روئے جاناں دیکھئے
دیکھ سکئے کوندتی بجلی تو یاں ہاں دیکھئے

چوٹ دل پر کھا کے حالِ کاہشِ جاں دیکھئے
کیجئے پیدا نظر پھر دیدہ پنہاں دیکھئے

جان کی راحت سے بڑھ کر دو گرہ کپڑا نہیں
دیکھئے اب دل کی الجھن یا گریباں دیکھئے

آپ مٹ جائیں ہم مگر دل سے
داغِ اُلفت نہیں مٹانے کے

جیسے ہم صورت آشنا ہی نہیں
صدقے اس منہ چھپا کے جانے کے

خالص اُردو

رس ان آنکھوں کا ہے کہنے کو ذرا سا پانی
سینکڑوں ڈوب گئے پھر بھی ہے اتنا پانی

چاہ میں پاؤں کہاں آس کا میٹھا پانی
پیاس بھڑکی ہوئی ہے اور نہیں ملتا پانی

کس نے بھیگے ہوئے بالوں سے یہ جھٹکا پانی
جھوم کر آئی گھٹا ٹوٹ کے برسا پانی

ہاتھ جل جائیگا چھالا نہ کلیجے کا چھوؤ — آگ مُٹھی میں دبی ہے نہ سمجھنا پانی
رس ہی رس جن میں ہے پھر بیل ذراسی بھی نہیں — مانگتا ہے کہیں ان آنکھوں کا مارا پانی

تسلیم منشی احمد حسین نام عرف امیر اللہ تسلیم تخلص۔ خلف مولوی عبد الصمد فیض آباد کے رہنے والے تھے۔ مگر مدتوں لکھنؤ رہے۔ اس وجہ سے لکھنوی مشہور رہیں۔ تسلیم ۱۸۲۰ء میں موضع منگلسی نواح فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد مع اہل و عیال لکھنؤ آ رہے تھے اور وہیں نواب محمد علی شاہ کے فوجی دفتر میں ملازم ہو گئے تھے۔ والد کے انتقال کے بعد تسلیم اُن کی جگہ ۳۰ روپیہ مشاہرہ پر ملازم ہو گئے۔

تسلیم کو عربی و فارسی میں کامل دستگاہ تھی۔ خوشنویسی میں بھی کمال حاصل تھا۔ چنانچہ شاہی ملازمت کے بعد آپ نولکشور پریس میں بحیثیت کاتب ۲۰ روپیہ مشاہرہ پر ملازم ہو گئے تھے۔ شاعری میں آپ نسیم دہلوی کے شاگرد تھے اور اُن سے اس قدر عقیدت و ارادت تھی کہ اُن کے رنگ شاعری اور اپنی شاگردی کو فخر کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ چنانچہ فرمایا ہے :-

میں ہوں اے تسلیم شاگرد نسیم دہلوی — مجھ کو طرزِ شاعرانِ لکھنؤ سے کیا غرض

غدر کے بعد آپ رامپور پہنچے اور ۳۰ روپیہ ماہوار تنخواہ پر ملازم ہو گئے۔ نواب کلب علی خاں کے انتقال کے بعد آپ ٹونک پہنچے اور وہاں سے منگرول۔ مگر کہیں قسمت نے یاوری نہیں کی۔ آخر نواب حامد علی خاں نے پھر انھیں رامپور طلب کیا اور ۴۰ روپیہ وظیفہ مقرر کر دیا۔ آخر اسی طرح عسرت اور تنگی کی زندگی بسر کر کے اور ضعیفی کے شداید برداشت کر کے ۱۹۱۱ء میں راہی

ملکِ عدم ہوئے۔

تسلیم کے تین دیوان شائع ہو چکے ہیں۔ (۱) نظم ارجمند (۲) نظم دل افروز (۳) دفتر خیال۔

دیوانوں کے علاوہ آپ نے آٹھ مثنویاں بھی لکھی ہیں:۔ نالۂ تسلیم شام غریباں۔ صبح خنداں۔ دل و جان۔ نغمۂ بلبل۔ شوکت شاہ جہاں۔ گوہر انتخاب۔ تاریخ رامپور۔

تسلیم کی غزلیات کا خاص جوہر۔ صفائی، فصاحت، سادگی اور شوخی ہے۔ جذبات میں صداقت اور جوش پایا جاتا ہے۔ مثنوی میں تسلیم کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ روانی اور صفائی کے ساتھ جذبات کی رنگینی عجب بہار دکھاتی ہے۔ بطور نمونہ پسند اشعار غزلیات کے ملاحظہ ہوں۔

خاک ہونے سے خاک ہاتھ آیا — جب میں تیرا ہی نقش پا نہ ہوا

ہم نے کعبہ میں بھی نہ سجدہ کیا — جس جگہ تیرا نقش پا نہ ہوا

برسوں لبیک خواں رہا تسلیم — تی حج کعبہ کبھی قضا نہ ہوا

پر خدا جانے بت پرستی میں — کیا مزا تھا کہ پارسا نہ ہوا

قیامت کی ہے بیتابی سرشک چشم گریاں میں

کبھی پہلوئے مژگاں میں کبھی آغوش داماں میں

ہوا میں زندہ جاوید ہو کر قتل اے قاتل

بجھی تھی کیا تری شمشیر موجِ آبِ حیواں میں

تو مدفن کھلی آنکھیں تو اس دنیا کو یہ سمجھے
نظر آتی تھیں کچھ شکلیں ہمیں خواب پریشاں میں

ڈراتا کیوں ہے اے تسلیم واعظ مجھ کو دوزخ سے
مرا حصہ نہیں ہے کیا خدا کے فضل و احساں میں

حسرت موہانی عام طور پر حسرت موہانی کو موجودہ دَور کا شاعر کہا جاتا ہے اور غالباً یہ محض اس لئے کہ حسرت اپنی عمر اور سیاسی خیالات کے لحاظ سے موجودہ عہد کے نامور اور معزز شخص ہیں لیکن ہمیں محض ان کی شاعری سے سروکار ہے اور ان کی شاعری زبان حال سے کہتی ہے کہ مجھے موجودہ دَور سے کوئی تعلق نہیں مجھے دیکھو تو دورِ تسلیم کی عینک سے دیکھو۔ خاکسار نے حسرت کے کلام کا بغور مطالعہ کیا۔ چند اشعار جن میں سیاسی جذبات کی ترجمانی کی گئی ہے۔ انھیں چھوڑ کر باقی تمام کلام کا تقاضہ ہے کہ حسرت موہانی کو اس دَور میں جگہ دی جائے جس دور میں ان کے استاد حضرت تسلیم رونق افروز ہیں۔ بہر حال زمانہ کچھ بھی کہے ناچیز کی یہی رائے ہے۔

حسرت تخلص ہے مولانا سید فضل الحسن صاحب کا۔ آپ ۱۸۷۵ء میں بمقام موہان (ضلع اناؤ) پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی پھر علی گڑھ پہنچ کر بی۔ اے کا امتحان پاس کیا۔ اسی فضا میں آپ کی ذہنی نشوونما ہوئی۔ شاعری کا شوق ابتدا سے ہے۔ حضرت تسلیم سے تلمذ حاصل تھا۔ مدتوں تک

آپ کا رجحان علمی و ادبی خدمات کی طرف رہا۔ مگر جب سے سیاسی معاملات میں دلچسپی لینے لگے ہیں۔ اس طرف پوری توجہ نہیں رہی۔ اور سیاسی خدمات کے ساتھ ساتھ ادبی مصروفیت بھی جاری ہے۔

حسرت کا سلسلۂ شاعری مومن دہلوی سے ملتا ہے۔ اس لئے حسرت میں وہ تمام خوبیاں ملتی ہیں۔ جو دہلی اسکول کی شاعری سے مخصوص ہیں۔ خود فرماتے ہیں۔ ؎

ہے زبانِ لکھنؤ میں رنگ دہلی کی نمود — تجھ سے حسرت نام روشن شاعری کا ہو گیا

آپ کا شمار ساتذہ میں ہے۔ آپ قدماء کی تقلید کا دم بھرتے ہیں۔ اور اُن ہی راستوں پر چل کر فخر کرتے ہیں۔

حسرت کی زبان وہی ہے جو اُن کے اُستاد اور دادا اُستاد کی جس کی خصوصیات روانی، بے تکلفی، شستگی۔ اور بانکپن ہیں۔ مومن کی طرح آپ کو نازک اور معنی خیز فارسی تراکیب کا خاص شوق ہے اور اُن کو اس برجستگی سے استعمال کرتے ہیں کہ شعر میں لطف پیدا ہو جاتا ہے۔

عام طور پر جیتا جاگتا اور مجازی عشق آپ کی شاعری کی روح رواں ہے۔ حُسن میں دلکشی ناز و انداز، غنج و دلال۔ نخوت و بے نیازی، شوخی اور لگاوٹ ہے۔ عشق میں والہانہ شیفتگی، دیوانگی جوش، اور شدید جذبات ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہر شعر سراپا اثر میں ڈوبا ہوا ہوتا ہے۔ اشعار میں سادگی، جوش، اصلیت، نزاکت اور بانکپن کے امتزاج سے وہ چیز پیدا ہوتی ہے جسے تڑپ کہئے یا تاثیر۔ یا شاعرانہ انبساط کہ کر اس کے مفہوم کو ادا کیجئے۔

حسرت کے کلام میں کہیں کہیں روحانیت کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔ اس کے علاوہ سیاسی جذبات کی ترجمانی بھی کی ہے۔ مسلسل غزلیات بھی دواوین میں موجود ہیں۔ عام طور پر زمین کا انتخاب لاجواب ہے۔ نئی نئی زمینیں اور چھوٹی چھوٹی بحریں اور ان میں روانی اور شگفتگی خاص حسرت کا حصہ ہے۔ بطور نمونہ چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

حُسن بے پروا کو خودبین و خودآرا کر دیا   کیا کیا میں نے کہ اظہارِ تمنا کر دیا
سب غلط کہتے ہیں لطفِ یار کو وجہِ سکوں   دردِ دل اس نے تو حسرت اور دونا کر دیا

قدموں پہ ان کے رکھ کے سر رفعِ ملال کر دیا   ہمتِ عذر خواہ نے آج کمال کر دیا
دور رہیں ان کی بزم سے جیتے رہے تو کیا رہے   آہ وہ زندگی جسے غم نے وبال کر دیا

وصل کی بنتی ہیں ان باتوں سے تدبیریں کہیں   آرزوؤں سے پھرا کرتی ہیں تقدیریں کہیں
بے زبانی ترجمانِ شوق بے حد ہو تو ہو   ورنہ پیشِ یار کام آتی ہیں تقریریں کہیں
التفاتِ یار تھا اک خوابِ آغازِ وفا   سچ ہوا کرتی ہیں ان خوابوں کی تعبیریں کہیں

تیری بے صبری ہے حسرت خام کاری کی دلیل
گریۂ عشاق میں ہوتی ہیں تاثیریں کہیں

تبصرہ

زبان اصلاح زبان کے لئے دورِ چہارم خاص طور پر ممتاز نظر آتا ہے۔ لیکن دورِ پنجم بھی کچھ کم اہمیت نہیں رکھتا۔ دورِ چہارم کی بچی کھچی ناہمواریاں دورِ پنجم میں ہموار ہوئیں۔ یہ آئے ہے، جائے ہے وغیرہ ذوق و غالب

کے ہاں بلکہ داغ کے ابتدائی کلام میں بھی موجود ہے۔ لیکن دور پنجم کا آخری زمانہ اس قسم کے قدیم روزمرہ محاورات سے قطعی پاک نظر آتا ہے۔

اس دور کی سب سے زیادہ اور نمایاں خصوصیت صفائی، سادگی، بے تکلفی ہے۔ امیر مینائی، جلال، تسلیم اگرچہ لکھنؤ کے شاعر ہیں لیکن ان کی زبان میں بھی روانی، سلاست اور بے تکلفی کا دریا بہتا ہوا نظر آتا ہے۔

اصناف سخن اس دور کا بڑا کارنامہ غزل ہے۔ یوں تو اس دور میں قصیدہ بھی ہوا اور مثنوی بھی لیکن غزل سب پر بھاری ہے۔

موضوع سخن بازاری حسن و حسن فروشش اور عشق و بوالہوسی اس دور کا موضوع سخن ہے۔ بلند قسم کے عشق کی تصویریں اس دور میں کم ملتی ہیں۔ بلکہ برخلاف اس کے اکثر اشعار ایسے ملتے ہیں جن کو بداخلاقی کا محرک کہنا نازیبا نہیں۔ اس دور کی شاعری روحانی جذبات کو ترقی نہیں دیتی معاملہ بندی حسن و عشق کی عریاں تصویریں ہنسی ٹھٹھول۔ نوک جھونک۔ رندانہ بے تکلفی، واعظوں پر پھبتی۔ رقیبوں کی کم بختی۔ غرض اس محدود دائرے سے شعراء نے کسی مقام پر باہر قدم نہیں رکھا۔

اسلوب بیان بے تکلفی اس دور کا خاص اسلوب ہے۔ اگرچہ امیر اور جلال کے ابتدائی کلام میں تکلف اور آورد کی جھلک پائی جاتی ہے لیکن آخر زمانے کے تقاضے سے مجبور ہو کر وہ بھی صفائی اور بے تکلفی کی طرف رجوع ہو گئے تھے۔ خوشنما اور پرمعنی فارسی تراکیب بھی اس دور میں نظر آتی ہیں اور یہ خاص حسرت موہانی کا حصہ ہے۔

باب ۱۰

دورِ جدید

تمہید گذشتہ ادوار کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ چند مثنویوں، مرثیوں اور نظیر اکبر آبادی کے کلام کو چھوڑ کر اب تک اردو ادب کا کارنامہ غزل ہی تھا۔ ہر دور میں اسی صنف کا پلّہ بھاری رہا ہے۔ اس صنف کو میر۔ مومن۔ غالب جیسے شاعروں نے آسمان تک پہنچا دیا اور دیگر اساتذہ اور خوش فکر شعراء نے غزل کو اس انداز سے کہا کہ شاعرین کے لئے بجز اس کے کہ اُن ہی راستوں پر چلیں اور اُگلے ہوئے نوالے چبائیں۔ اور کوئی چارہ کار نہیں رہا۔ ہر بات کی ایک حد ہوتی ہے۔ اوّل تو غزل کا میدان ویسے ہی تنگ اتنے گنے شعراء میں بھی۔ ردیف و قافیہ کی قید اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ حُسن و عشق کا محدود دائرہ آخر کہاں سے اتنی گنجائش آتی کہ شعراء اپنے جذبات، احساسات اور خیالات کی ترجمانی خاطر خواہ کر سکیں۔

تیسرے دور میں نظیر اکبر آبادی مجتہدانہ انداز سے اُٹھتے ہیں اور غزل کو چھوڑ کر اپنا راستہ الگ نکالتے ہیں۔ ان کے کلام میں تنوّع ہے گوناگوں مضامین سے شاعری کے میدان کو وسعت دیتے ہیں۔ مگر ان کا رنگ مقبول نہیں ہوتا اوّل تو وہ اُستاد بن کر اپنے شاگردوں کے ذریعہ پروپگنڈا

نہیں کرتے۔ دوسرے نئی چیز کے لئے زبان وقواعد کی قیود توڑ دیتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگ باگ ان کے رنگ سے متنفر ہوجاتے ہیں۔

چوتھے دور میں مرثیہ نگاری کو فروغ ہوتا ہے۔ جذبات وفطرت اور منظر نگاری کردار نویسی موسمی اور مقامی کیفیات، رزمیہ نمونے غرض کیا ہے جو ان مرثیوں میں نہیں۔ انھیں اگر اردو ادب کا شاہکار کہا جائے تو بیجا نہیں لیکن افسوس کہ یہ صنف شاعری محض مذہبی بن کر رہ گئی۔ بجز ایک خاص طبقۂ شعرار کے اور کسی نے اس طرف توجہ نہیں کی۔ اس کے علاوہ چونکہ مراثی کی بنیاد خاص معتقدات پر ہے۔ اس لئے یہ عام طور پر مفید ثابت نہ ہو سکے۔

غدر ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان کی فضا ہر حیثیت سے بدل جاتی ہے۔ حکومت ایسی قوم کے ہاتھ میں جاتی ہے جس کو ہندوستانیوں اور ہندوستانیوں کے علم وادب سے قطعی دلچسپی نہیں۔ اردو شاعری کا مایۂ ناز جوہر روحانیت اس قوم کی روح رواں مادہ پرستی ایسی حالت میں انھیں اردو غزل کی کیا خاک قدر ہوسکتی تھی بلکہ یوں کہئے کہ نو وارد اسے سمجھنے کی اہلیت ہی نہیں رکھتے تھے۔ اور سچ بات تو یہ ہے کہ محکوم قوم کی شاعری حاکموں کو کیا پسند آتی۔

انگریز اپنے ہمراہ اپنا لٹریچر لے کر آئے تھے۔ اُن کی نثر، نظم، ڈراما اصل یا ترجمہ ہو کر ملک میں پھیلا۔ اس نئی چیز نے لوگوں کے دلوں میں امنگ پیدا کی اپنا ادب ان چیزوں سے خالی پایا۔ شوق پیدا ہوا کہ اپنے ادب کو بھی ان گلہائے رنگا رنگ سے باغ وبہار کیجئے۔ چنانچہ ایک جماعت ایسے شعرار کی پیدا ہوگئی جنھوں نے انگریزی لٹریچر سے متاثر ہو کر اردو میں طرح طرح کی

راہیں نکالیں۔ اگرچہ یہ شعرا اس سے قبل خود پایہ کے غزل گو تھے۔ لیکن انگریزی اثر سے انھیں غزل بے مزہ معلوم ہونے لگی۔ چنانچہ انھوں نے غزل کو چھوڑ کر خیالات کے تسلسل کے لئے مثنوی کو لیا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ نہ صرف ایک گراں قدر ذخیرہ اردو ادب میں مہیا کردیا۔ بلکہ اردو شعر و سخن کی فضا میں ایک انقلاب عظیم برپا کردیا۔

جو شعرا انگریزی لٹریچر سے متاثر ہوئے اور جنھوں نے اردو ادب میں انقلاب پیدا کیا اُن میں آزاد اور حالی سب کے پیش رو ہیں۔ ان کے بعد اسمٰعیل، سرور جہاں آبادی۔ اقبال و چکبست کا نمبر آتا ہے۔ اکبر الہ آبادی کا شمار بھی اُن ہی مصلحین ادب میں ہو سکتا ہے۔ چنانچہ اس باب میں ان ہی حضرات کا تذکرہ کیا جائے گا۔

آزاد دہلوی | محمد حسین نام۔ آزاد تخلص۔ خلف مولوی محمد باقر خاص دہلی کے رہنے والے تھے ۱۸۳۲ء یا ۱۸۳۳ء میں پیدا ہوئے آپ کے والد ذوق کے دلی دوست تھے۔ چنانچہ انھوں نے آزاد کو ان کے حوالے کیا۔ آزاد نے اُن ہی کے سایۂ عاطفت میں ابتدائی تعلیم پائی اور نکات عروض و فن سخن حاصل کیا۔ ابتدائی تعلیم کے بعد دہلی کالج میں داخل ہو گئے۔ اور اس درسگاہ سے علوم مروجہ تحصیل کئے۔

شاعری کا چسکا ابتدا سے تھا اس پر ذوق سا اُستاد نصیب ہوا۔ ان کے ہمراہ آپ کو اکثر معرکے کے مشاعروں میں شرکت کا موقع ملا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بہت جلد شعر و سخن سے کامل مناسبت پیدا ہو گئی۔

ہنگامہ غدر میں مولوی محمد باقر صاحب شہید ہوئے۔ گھر بار لٹ گیا۔ استاد ذوق کا انتقال پہلے ہی ہو چکا تھا۔ اُن کے کلام کو آزاد چھاتی سے لگائے بیٹھے تھے۔ افسوس کہ اسی ہنگامہ میں وہ بھی غارت ہو گیا۔ جب دلی میں کوئی یار و مددگار نہ رہا تو تلاش روزگار میں لاہور پہنچے اور وہاں سررشتہ تعلیم میں پندرہ روپیہ ماہوار پر ملازم ہو گئے۔ لیکن اپنی ذاتی قابلیت کی بدولت روز بروز ترقی کرتے رہے اور "اتالیق پنجاب" کے سب اڈیٹر مقرر ہوئے۔ سررشتہ تعلیم نے آپ سے "قصص الہند" اور مختلف ریڈریں لکھوائیں۔ جو بہت مقبول ہوئیں گورنمنٹ ہی کے ایما سے آپ نے کابل اور بخارا کا بھی سفر کیا۔ آخر میں گورنمنٹ کالج لاہور میں عربی کے پروفیسر مقرر ہو گئے تھے۔

آزاد فارسی کے عالم تبحر اور عربی کے اچھے عالم تھے۔ بھاشا اور ہندی کے نکات اور خوبیوں سے پورے آگاہ اور انگریزی لٹریچر کی خصوصیات سے واقف تھے فارسی ایسی سلیس اور با محاورہ بولتے تھے اور لب و لہجہ ایسا تھا کہ اُن میں اور اہل ایران میں تمیز کرنا غیر ممکن تھا۔

آزاد جب لاہور پہنچے تو اس وقت دہلی اور لکھنؤ کی ٹکسالی شاعری کی سرا بازاری ہو چکی تھی۔ علوم مغربی لوگوں کے پیش نظر تھے۔ انھیں اپنی شاعری حسن و عشق کے جھوٹے افسانوں اور مبالغہ آمیز کیفیتوں سے بھری ہوئی نظر آتی تھی چنانچہ ان حالات سے متاثر ہو کر آزاد نے اردو میں ایک نئے طرز یا نیچرل شاعری کی بنیاد ڈالی۔ اور بعد میں کرنل ہالرائڈ ڈائریکٹر سررشتہ تعلیم پنجاب کے ایما سے ۱۸۷۴ء میں ایک مشاعرہ قائم کیا۔ جو ہندوستان میں اپنی نوعیت کے لحاظ سے بالکل

شمس العلماء مولوی محمد حسین صاحب آزاد دہلوی

نیا تھا۔ اور جس میں بجائے مصرعہ طرح کے کسی مضمون کا عنوان شاعروں کو دیا جاتا تھا۔ یہ مشاعرہ ہر مہینے میں ایک بار انجمن کے مکان میں منعقد ہوا کرتا۔ آپ نے پہلے کئی نظمیں خود لکھیں اور کئی مضامین اس ایجاد کی حمایت میں لکھے۔

اردو نثر و نظم پر جو احسانات حضرت آزاد نے کیے۔ وہ تاریخ ادب میں ہمیشہ سنہرے حرفوں میں لکھے جائیں گے۔ ان احسانات اور ادبی خدمات کے صلے میں گورنمنٹ نے آپ کو سنہ [illegible]ء میں شمس العلماء کا خطاب مرحمت فرمایا۔

آخری عمر میں حضرت آزاد کی صحت جواب دے چلی تھی۔ کچھ تو دماغی مصروفیت کچھ صاحبزادی کے انتقال کا صدمہ غرض ۱۸۸۹ء میں جنون کے آثار پیدا ہوئے رفتہ رفتہ یہ مرض پختہ ہو گیا۔ اور آخر دم تک ان کا ساتھ نہ چھوڑا۔ آخر اسی حالت میں ۲۲ جنوری سنہ ۱۹۱۰ء کو قید ہستی سے آزاد ہو گئے۔

نثر میں جو کارنامے آپ کی یادگار رہیں۔ ان کا تذکرہ آئندہ آتا ہے۔ یہاں آپ کی شاعری سے سروکار ہے۔ سطور بالا میں عرض کیا جا چکا ہے کہ آزاد نے ذوق کے سایۂ عاطفت میں پرورش پائی۔ انہی کے فیض صحبت سے آپ نے غزل سرائی میں شہرت حاصل کی۔ لیکن افسوس ہے کہ ان کا قدیم کلام دستبرد زمانہ اور کچھ آپ کی بے نیازی کی بدولت ضائع ہو گیا۔ نظم آزاد میں آپ کی کچھ غزلیں موجود ہیں جن میں سے زیادہ تر عالم اختلال کی حالت میں لکھی گئی تھیں۔ عالم جنون میں آپ کا شغل "الہیات" تھا۔ اسی کا ذکر اذکار آپ کی زبان پر رہتا تھا۔ چنانچہ ان غزلوں میں بھی تصوف و حقیقت کی چاشنی پائی جاتی ہے لیکن شاعری میں آزاد کی اہمیت ان غزلوں کی بنا پر نہیں بلکہ ان کی جدید نظموں کی بنا پر

بہرصورت آپ اردو میں نیچرل شاعری کے بانی ہیں۔ چونکہ حضرت آزاد سے پیشتر اس قسم کی شاعری کے نمونے موجود نہیں تھے۔ اس لئے ان نظموں میں شاعری کی تمام خوبیاں پیدا نہیں ہو سکیں۔ اکثر مقامات پر بندش چست نہیں ہے۔ اور بعض مقامات پر تعقید کا عیب بھی موجود ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ آپ کے منظوم کلام میں جوش صداقت اور سادگی بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔ لطیف و نازک تشبیہات و استعارات آپ کی زبان کے جوہر ہیں۔ شگفتگی، لطافت اور ترنم آپ کے طرز بیان کی خوبیاں ہیں۔ آپ نے متعدد مثنویاں تصنیف فرمائی ہیں۔ جن میں شب قدر، صبح امید، گنج قناعت، داد انصاف اور خواب امن بہت بلند پایہ ہیں۔

حالی شمس العلماء مولوی خواجہ الطاف حسین نام حالی تخلص ۱۸۳۷ء میں بمقام پانی پت پیدا ہوئے۔ وہاں سات سو برس سے قوم انصار کی ایک شاخ آباد چلی آتی ہے۔ خواجہ صاحب کو اسی قوم سے تعلق تھا۔ جب آپ نو برس کے ہوئے تو آپ کے والد خواجہ ایزد بخش نے انتقال کیا۔ چنانچہ آپ اپنے بہن بھائیوں کی سرپرستی میں تعلیم و تربیت پانے لگے۔ اول آپ نے قرآن حفظ کیا۔ اس کے بعد ایک بزرگ سید جعفر علی سے دو چار فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں اور حاجی ابراہیم حسین انصاری سے عربی پڑھی۔ ابھی تعلیم مکمل نہ ہونے پائی تھی کہ آپ کی شادی کر دی گئی۔ اس وقت آپ کی عمر ۱۷ سال کی تھی۔ گھر کا سب بوجھ آپ کے بھائی پر تھا۔ اس لئے سب کی یہ خواہش ہوئی کہ آپ کو نوکری تلاش کرنی چاہیئے۔ مگر آپ

مولانا الطاف حسین حالی پانی پتی
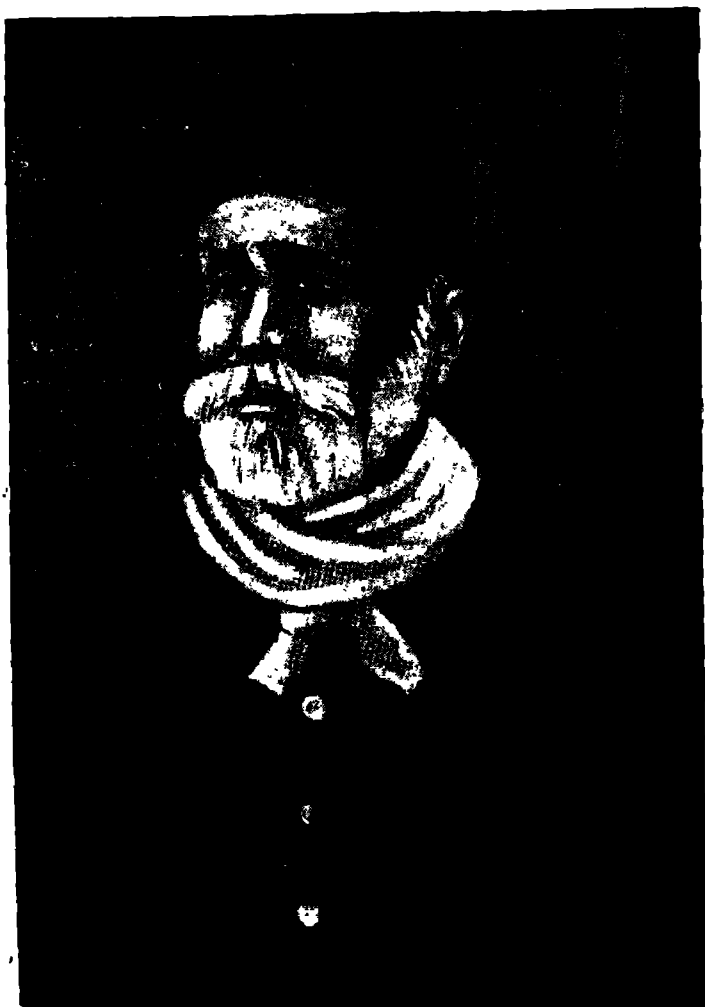
تعلیم کا شوق تھا۔ اس لیے آپ گھر والوں سے روپوش ہو کر دلی چلے آئے
اور یہاں آپ نے عربی پڑھنی شروع کی۔ ابھی کتب متداولہ پوری طرح
عبور نہیں ہوا تھا کہ ۱۸۵۵ء میں پانی پت جانا پڑا۔ وہاں بطور خود بعض
کتابوں کا مطالعہ کرتے رہے۔

۱۸۵۶ء میں آپ کو ضلع حصار میں ایک قلیل تنخواہ کی آسامی صاحب
کلکٹر کے دفتر میں مل گئی۔ لیکن ہنگامۂ غدر میں ملازمت چھوڑ کر آپ وطن چلے آئے
اور چار برس بیکاری کی حالت میں گزارے لیکن اس بیکاری کے زمانے میں
اکتساب علم کا سلسلہ جاری رہا۔

قیام دہلی کے دوران میں آپ کی رسائی مرزا غالب تک ہو گئی تھی۔
چنانچہ ان کی صحبت میں شعر و سخن کا شوق پیدا ہوا اور ان کی ہمت افزائی
سے آپ شعر کہنے لگے تھے۔ غدر کے بعد ۱۸۶۳ء میں نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ
سے شناسائی ہوئی۔ چنانچہ آپ آٹھ برس تک بطور مصاحب ان کے
ہمراہ رہے۔ شیفتہ فارسی اور اردو کے اچھے شاعر تھے۔ مگر شاعرانہ
جوش و خروش کچھ سرد ہو چلا تھا۔ خواجہ صاحب کی موجودگی سے ان کا
افسردہ شوق تازہ ہو گیا۔ ادھر خواجہ صاحب کا میلان طبعی بھی چمک اٹھا
اگرچہ آپ غالب سے مشورہ کیا کرتے تھے لیکن درحقیقت مرزا کے
مشورہ و اصلاح سے آپ کو چنداں فائدہ نہیں ہوا۔ جو کچھ فائدہ ہوا وہ
شیفتہ کی صحبت سے ہوا۔

نواب شیفتہ کی وفات کے بعد پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو میں ایک آسامی

آپ کو مل گئی جس میں آپ کو یہ کام کرنا پڑتا تھا کہ جو ترجمے انگریزی سے اردو میں ہوتے تھے اُن کی عبارت آپ درست کر دیتے تھے۔ تقریباً چار برس آپ نے یہ کام لاہور میں رہ کر کیا۔ اس سے انگریزی لٹریچر کے ساتھ فی الجملہ مناسبت پیدا ہو گئی۔ اور نامعلوم طور پر آہستہ آہستہ مشرقی لٹریچر اور خاص کر عام فارسی لٹریچر کی وقعت دل سے کم ہونے لگی۔ جس زمانے میں آزاد نے لاہور میں ایک نئے طرز مشاعرہ کی بنیاد ڈالی تھی اسی زمانے میں حالی نے چار مثنویاں ایک "برسات" پر دوسری "امید" پر تیسری "رحم و انصاف" پر اور چوتھی "حب وطن" پر لکھیں۔

چار برس لاہور میں رہ کر آپ واپس دہلی آئے۔ اور اینگلو عربک اسکول میں مدرس مقرر ہوئے۔ قیام دہلی کے دوران میں سر سید سے ملاقات ہوئی اور اُن ہی کے ایما سے آپ نے مشہور و معروف مسدس "مد وجزر اسلام" تصنیف کیا۔ ۱۸۸۶ء میں آسمان جاہ مدار المہام حیدرآباد علی گڑھ آئے۔ سر سید نے آپ کا تعارف اُن سے کرایا۔ نواب صاحب نے ازراہ قدردانی پچھتر روپیہ ماہوار آپ کا وظیفہ مقرر کر دیا۔ آپ ایک مرتبہ علی گڑھ کالج کا ایک وفد لے کر حیدرآباد تشریف لے گئے وہاں آپ کا وظیفہ پچھتر روپے سے ایک سو روپیہ کر دیا گیا۔ ۱۹۰۴ء میں ادبی جذبات اور علم و فضل کے صلے میں آپ کو شمس العلماء کا خطاب سرکار انگریزی سے ملا۔ حیدرآباد سے وظیفہ مقرر ہونے کے بعد آپ نے ملازمت ترک کر دی تھی۔ چنانچہ عمر کے آخری سال پانی پت میں بسر ہوئے۔ جہاں آپ ادبی خدمات انجام دیتے رہے۔

آخر ۱۹۱۴ء میں داعی اجل کو لبیک کہا۔

مولانا حالی نے نظم و نثر میں متعدد بلند پایہ تصانیف یادگار چھوڑی ہیں۔ تصانیف نثر کا ذکر آئندہ ہوگا۔ یہاں صرف آپ کی منظوم تصانیف سے سروکار ہے جہاں تک غزل کا تعلق ہے۔ آپ بلند پایہ غزل گو ہیں۔ دو ایک دیوان مطبوعہ آپ کی یادگار ہے۔ غزل میں غالب کی اصلاح اور شیفتہ کی ہم نشینی نے بڑی بڑی خوبیاں پیدا کر دی ہیں۔ آپ کے جذبات میں شدت ہے۔ انھیں سادگی اور لطیف کنایہ کے ساتھ اس طرح کہتے ہیں کہ اثر کی انتہا قائم نہیں رہتی۔ مثلاً

جو جان سے در گزرے وہ چاہے سو کر گزرے
گر آج نہ تم آتے کیا جانئے کیا ہوتا

رموز عشق و محبت کو اس صفائی اور سادگی سے بیان کرتے ہیں کہ دل پر ایک کیف اثر چھا جاتا ہے۔ بے تکلفی اور سہل ممتنع اور پُر کیف ترنم آپ کی غزلیات کی امتیازی خصوصیات ہیں۔

جدید رنگ کی نظموں میں چار مثنویاں "برسات" پر "امید" پر رحم و انصاف" پر "حب وطن" پر اور "مسدس حالی (مد و جزر اسلام "شکوہ ہند وغیرہ زیادہ مشہور ہیں۔ ان کے علاوہ چھوٹی چھوٹی متعدد نظمیں، مجموعہ نظم حالی" میں شامل ہیں۔

ان جدید نظموں کا خاص جوہر سادگی، روانی، تسلسل، ہمواری اور یک رنگی ہے۔ منظر نگاری، واقعہ نگاری، سیرت نگاری، فلسفہ، قومیت

جذبۂ ہمدردی، اخلاق وغیرہ کے نہایت دلکش نمونے ان نظموں میں پائے جاتے ہیں۔ کہیں کہیں یہ نظمیں خشک اور بے کیف ہو گئی ہیں لیکن عام طور پر ان میں اعلیٰ شاعری کی وجدانی کیفیات موجود ہیں۔

انگریزی لٹریچر سے متأثر ہو کر مولانا نے جو غزلیات لکھیں اُن کا مرتبہ کچھ زیادہ بلند نہیں ہے۔ سب سے زیادہ خامی جو ان غزلوں میں محسوس ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ ان میں غزل کا فطری لب و لہجہ قائم نہیں رہ سکا ہے۔ اس کے علاوہ سلاست و شگفتگی بھی قائم نہیں رہ سکی ہے۔ بہرحال جدید رنگ کا ابتدائی نمونہ ہونے کی حیثیت سے یہ غزلیں اہمیت رکھتی ہیں۔ نمونہ کے طور پر ایک غزل ملاحظہ ہو۔

نہ عیش کی خسروی رہے گی نہ صولتِ بہمنی رہے گی
رہے گی اے منعمو تو باقی دیئے کی کچھ روشنی رہے گی

رہے گی کس طرح راہ ایمن کہ رہنما بن گئے ہیں رہزن
خدا نگہباں ہے قافلوں کا اگر یہی رہزنی رہے گی

قبولیت کی کرو نہ پروا جو چاہو مقبول عام ہونا
جو ڈال دو گے حُسنِ ظن کا تو تم سے یاں بدظنی رہے گی

بگاڑ مذہب نے جو ہیں ڈالے نہیں وہ تا حشر مٹنے والے
یہ جنگ وہ ہے جو صلح میں بھی یونہی ٹھنی رہے گی

صفائیاں ہو رہی ہیں جتنی دل اتنے ہی ہو رہے ہیں میلے
اندھیرا چھا جائے گا جہاں میں اگر یہی روشنی رہے گی
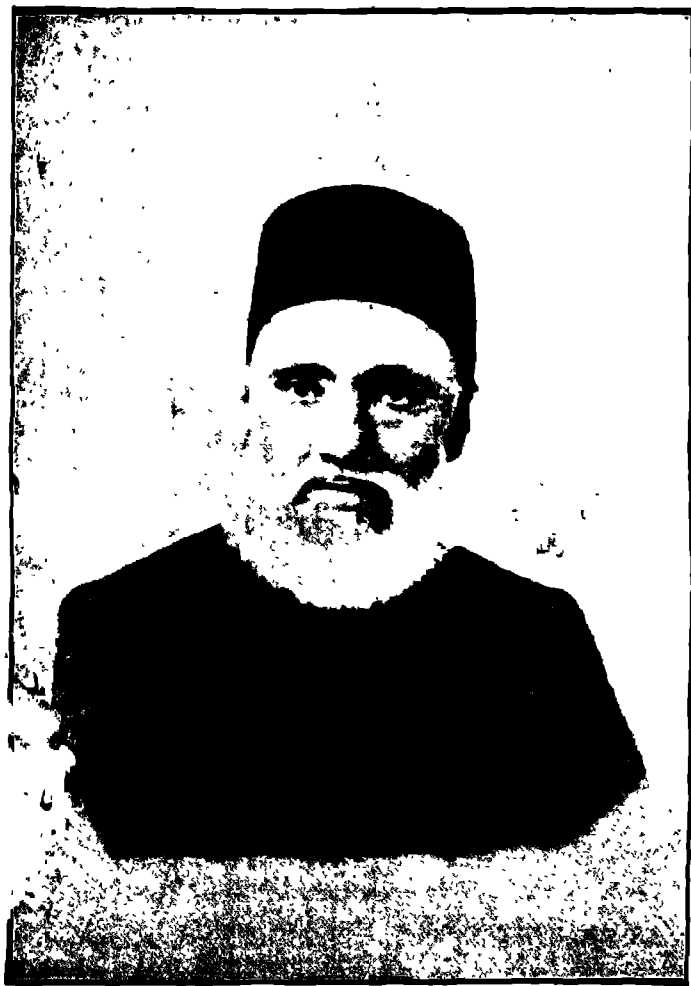
مولوی محمد اسمعیل میرٹھی

جو چھوڑے میراث کچھ نہ خالی تو اس سے دل تنگ ہوں وارث
رہیں گے ہر حال میں غنی وہ جو زینت اُن کی غنی رہے گی

اسمٰعیل

مولوی محمد اسمٰعیل ۱۲ نومبر ۱۸۴۴ء کو میرٹھ میں پیدا ہوئے ۱۶ سال کی عمر میں محکمہ تعلیم میں ملازم ہوئے۔ کچھ مدت بعد فارسی کے ہیڈ مولوی مقرر ہوگئے اور سہارن پور اور میرٹھ اسکولوں میں یہی خدمت کو انجام دیتے رہے ۱۸۶۷ء میں سنٹرل نارمل اسکول آگرہ میں منتقل ہوئے۔ جہاں بارہ سال رہنے کے بعد ۱۸۸۹ء میں بحسن و خوبی پنشن لی اور میرٹھ واپس چلے آئے حسن خدمات کے صلے میں گورنمنٹ نے خاں صاحب کا خطاب عطا فرمایا۔ آپ پنشن لینے کے بعد اپنے وطن میں ادبی خدمات انجام دیتے رہے۔ تا آنکہ یکم نومبر ۱۹۱۷ء کو پیک اجل آپہنچا اور آپ اس کے ہمراہ راہی ملک بقا ہوئے۔

آزاد کی طرح مولانا اسمٰعیل نے بھی بچوں کے لئے چھوٹی چھوٹی ریڈریں تصنیف کیں جنھیں گورنمنٹ نے منظور کیا۔ یہ ریڈریں مدت تک مدرسوں میں جاری رہیں اور اب بھی کہیں کہیں پڑھائی جاتی ہیں۔ یہ ریڈریں نہایت سلیس اور با محاورہ اردو میں لکھی گئی تھیں اور بچوں کے ذہنی رجحانات اور دلچسپی کو مدِّ نظر رکھ کر لکھی گئی تھیں اور یہی وجہ ہے کہ وہ بہت مقبول ہوئیں اُن میں جو نظمیں تھیں وہ بھی مولانا ہی کی تصنیف کردہ تھیں جو اپنی سادگی اور صفائی کے ساتھ اخلاقی حیثیت سے بہت مفید ہیں۔ اگرچہ یہ نظمیں بچوں کے لئے لکھی گئی تھیں لیکن اب زمانے نے ثابت کر دیا ہے کہ یہ بچوں، جوانوں، بوڑھوں سب کے لئے یکساں طور پر سامان دلچسپی مہیا کرتی ہیں۔ مولانا کو دیہاتی منظر نگاری

کا خاص ملکہ حاصل ہے۔ انگریزی نظموں کا ترجمہ نہایت حسن وخوبی کے ساتھ کیا ہے۔ ہندی الفاظ کو نہایت بے تکلفی سے استعمال کرتے ہیں۔ آپ کا کلام قومی اصلاح سے خالی نہیں۔ کلیات میں غزل، رباعی، قصیدہ وغیرہ اصناف بھی ملتی ہیں اور اُن میں بھی آپ کا رتبہ کسی طرح کم نہیں۔ لیکن آپ کی شہرت زیادہ تر آپ کی چھوٹی چھوٹی نظموں کی بنا پر ہے۔

اکبر الہ آبادی

سید اکبر حسین رضوی نام۔ اکبر تخلص۔ الہ آباد کے رہنے والے ۱۶ / نومبر ۱۸۴۶ء کو بمقام بارہ بنکی ضلع الہ آباد پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم سرکاری اسکولوں میں پائی۔ ۱۸۶۶ء میں مختارکاری کا امتحان پاس کیا۔ اور نائب تحصیلدار مقرر ہو گئے۔ ۱۸۷۰ء میں ہائی کورٹ کے مسل خواں اور ۱۸۸۰ء میں وکالت کا امتحان پاس کرکے منصف ہو گئے۔ ۱۸۸۸ء میں سب آرڈینٹ جج اور ۱۸۹۴ء میں عدالت خفیفہ کے جج مقرر ہوئے۔ گورنمنٹ نے حسن خدمات کے صلے میں خان بہادری کا خطاب عطا فرمایا۔ ۱۹۰۳ء میں پنشن کی اور ادبی اور علمی زندگی بسر کرتے رہے۔ آخر ۱۹۲۱ء میں انتقال کیا۔

اکبر کو شعر وسخن کا ابتدا ہی سے شوق تھا۔ چنانچہ حضرت وحید الہ آبادی کے شاگرد خواجہ آتش سے مشورہ سخن کیا کرتے تھے۔ ابتدائی کلام پر قدامت اور تقلید کا رنگ چھایا ہوا ہے۔ مقررہ مضامین کو سیدھے سادے الفاظ میں ادا کرتے ہیں۔ اس دور کے کلام میں بجز اس کے کہ صفائی اور سادگی ہے۔ اور کوئی خوبی نہیں۔ البتہ آیندہ

ترقی کے آثار پائے جاتے ہیں۔

رفتہ رفتہ آپ کی غزل میں ایک تبدیلی واقع ہوتی ہے۔ چونکہ مزاج میں شوخی اور طبیعت میں ظرافت ابتدا سے تھی۔ اس لئے غزلوں میں بھی یہی رنگ نمایاں ہونے لگا۔ تقلیدی اثر کم اور اس کی جگہ ایک خاص رنگ رونما ہوتا گیا۔ اخلاقی، سیاسی، روحانی، مذہبی، اصلاحی عناصر ابھرنے شروع ہوئے لیکن ظرافت اور طنز کے پیرایہ میں۔ آخری دور میں یہی ان کا رنگ ہو گیا۔

تین کلیات آپ کی یادگار ہیں۔ دو آپ کی زندگی ہی میں شائع ہوگئے تھے۔ تیسرا آپ کی وفات کے بعد شائع ہوا۔

پیر مشقی کے عہد کی غزلیات بہت بلند پایہ ہیں۔ لطف زبان اور روانی کے ساتھ مضمون آفرینی اور نازک خیالی عجیب لطف دیتی ہے۔ عاشقانہ رنگ کے اشعار میں جدت ادا اور ندرت بیان سے جان ڈال دیتے ہیں۔ سوز و گداز کی بھی کمی نہیں۔ زمین غزل میں نو بہ نو سیاسی، مذہبی اور سوشل مضامین کا اضافہ کیا ہے اور ان مضامین کو اس لطف سے نظم کرتے ہیں کہ طبیعت پر ذرا گراں نہیں گزرتے۔ مثلاً

دل مرا جس سے بہلتا کوئی ایسا نہ ملا — بت کے بندے ملے اللہ کا بندہ نہ ملا
بزم یاراں سے پھری باد بہاری مایوس — ایک سر بھی اسے آمادۂ سودا نہ ملا
گل کے خواہاں تو نظر آئے بہت عطر فروش — طالب زمزمۂ بلبل شیدا نہ ملا
واہ کیا راہ دکھائی ہے ہمیں مرشد نے — کر دیا کعبہ کو گم اور کلیسا نہ ملا

تنویر ملا

رنگ چہرے کا تو کالج نے بھی قائم رکھا　　رنگ باطن میں مگر باپ سے بیٹا نہ ملا
سید اٹھے جو گزٹ لیکے تو لاکھوں لائے　　شیخ قرآن دکھاتا پھرا پیسا نہ ملا
ہوشیاروں میں تو اک اک سے سوا ہے اکبر　　مجھ کو دیوانوں میں لیکن کوئی تجھ سا نہ ملا

اکبر کی شہرت عام طور پر ان کی ظرافت کی بنا پر ہے۔ اگرچہ آپ مصلح قوم ہیں۔ مذہبی واعظ ہیں، صوفی ہیں، فلسفی ہیں۔ مغرب کی کورانہ تقلید کے دشمن ہیں۔ قدیم تہذیب کے حامی ہیں۔ لیکن آپ کی اصلاح، آپ کا وعظ اور آپ کی نصیحت، ظرافت، بذلہ سنجی اور طنز لطیف کے نہایت باریک پردوں میں چھپی ہوئی ہے۔ آپ گمراہوں کے دل و جگر میں چٹکیاں لیتے ہیں۔ اُن کی دُکھتی ہوئی رگ کو نصیحت کے نشتر سے چھیڑتے ہیں۔ مگر اپنی ظرافت کی رنگینی سے انھیں رو ٹھنے اور بگڑنے نہیں دیتے بلکہ خفت آمیز ہنسی ہنسا دیتے ہیں۔

ظرافت ایک کیفیت ہے۔ اس کا تجزیہ نہیں ہوسکتا اور نہ یہ بتایا جاسکتا ہے کہ ظرافت کیونکر پیدا کی جاسکتی ہے۔ تاہم اکبر کے کلام میں چند موٹی موٹی باتوں سے اُن کی ظرافت کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ نئی اور انوکھی تشبیہات جن پر پھبتی کا اطلاق ہوسکتا ہے۔ محاوروں کا کوئی خاص استعمال، الفاظ کے عجیب و غریب معنی، غیر زبانوں کے الفاظ اور ان کا انوکھا استعمال، عامیانہ اور مبتذل الفاظ کو خوبی سے استعمال کرنا۔ مثلاً گٹ پٹ، فالتو وغیرہ۔ غرض یہ چند امور ہیں جن سے ظرافت پیدا ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ خاص خاص مطالب ادا کرنے کے لئے اکبر نے خاص خاص الفاظ ایجاد کئے ہیں اور ان کا استعمال نہایت خوبی اور لطف کے ساتھ کرتے ہیں۔ مثلاً مس، شیخ، سید، اونٹ، گاسے

گرجا، مندر، مسجد، کالج، برہمن، لالہ، بدھو، جمن، کلو، مٹو، ریل وغیرہ یہ لفظ اسے
آپ وہ کام لیتے ہیں جو متعدد جملوں سے بھی پوری طرح نہیں نکل سکتا۔
اب ان کے کلام سے لطف اُٹھائیے!

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بیبیاں — اکبر زمیں میں غیرتِ قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو اُن سے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا — کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کی پڑ گیا

ہر چند کہ کوٹ بھی ہے پتلون بھی ہے — بنگلہ بھی ہے پاٹ بھی ہے صابون بھی ہے
لیکن یہ میں تجھ سے پوچھتا ہوں ہندی — یورپ کا تری رگوں میں کچھ خون بھی ہے

اگرچہ تسکینِ طبعِ ملت ہے حبِ قومی میں آہ کرنا
مفید تر ہے مگر دلوں کو رجوع سوئے الٰہ کرنا
کہے کوئی شیخ سے یہ جا کر کہ دیکھیے آ کے بزمِ سید
یہ رونق اور یہ چہل پہل ہو تو کیا بُرا ہے گناہ کرنا

سدھاریں شیخ کعبے کو ہم انگلستان دیکھیں گے
وہ دیکھیں گھر خدا کا ہم خدا کی شان دیکھیں گے
نہایت مغربی سے ہیں تعارف کی تمنائیں
میں دیکھوں گا انھیں اور وہ مرا ایمان دیکھیں گے

باغوں میں تو بہار درختوں کی دیکھ لی — کالج میں آ کے کانووکیشن کو دیکھیے
لیموں کے کاغذی تو بہت دیکھے آپ نے — اب کاغذی ترقی پلیشن کو دیکھیے

سرور جہان آبادی

منشی درگا سہائے نام، سرور تخلص، خلف حکیم پیارے لال صاحب ۱۸۷۳ء میں بمقام جہان آباد ضلع پیلی بھیت پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم وطن ہی میں حاصل کی۔ سید کرامت حسین بہار سے فارسی پڑھی اور اُن ہی سے مشورۂ سخن کیا۔ اُردو مڈل پاس کرنے کے بعد انگریزی کا شوق ہوا۔ دو سال کے عرصے میں انگریزی مڈل بھی پاس کیا۔ شعر و فن کا چرچا جاری تھا۔ شروع میں وحشت تخلص تھا بعد میں سرور اختیار کیا۔

مشق سخن جاری تھی اور آپ کا کلام رسائل میں شائع ہونے لگا تھا کہ دفعتاً آپ کی بیوی اور کچھ دنوں کے بعد اکلوتے بیٹے کا انتقال ہو گیا۔ ان حادثوں نے آپ کی طبیعت میں انقلاب عظیم برپا کر دیا۔ غم غلط کرنے کے لئے دُختِ رز کو منہ لگایا اور اس سے اس قدر یارانہ بڑھایا کہ مدتوں مست و بیخود پڑے رہتے تھے آخر اس کثرت نے نہال زندگی میں گھن لگا دیا۔ اور آپ ۱۹۱۰ء میں ۳۷ سال کی عمر میں مرگ باشی ہوئے۔

سرور کی نظموں کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ایک "خمخانۂ سرور" مطبوعہ "زمانہ پریس" کانپور" دوسرا "جامِ سرور" مطبوعہ" انڈین پریس الہ آباد" ان دونوں مجموعوں میں "حب وطنی" سیاسی، تاریخی، اخلاقی وغیرہ نظمیں شامل ہیں۔

سرور کے کلام میں صداقت، جذبات، جوش، سادگی اور سوز و گداز کے عناصر بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ کلام مبالغہ سے پاک اور حقیقت و اصلیت سے مزین ہے نظموں میں تغزل کے رنگ سے تاثیر پیدا کی گئی ہے۔ پردیسی چیزوں کے

دوش بدوش دیسی چیزوں کو بھی ممتاز جگہ دی ہے۔ مثلاً کوئل، بھونرا، ہنس، سارس، مرغابی، گنگا، جمنا، دمن، پدمنی وغیرہ۔ وطنی نظموں میں عقیدت، محبت اور جوش وخروش کا دریا اُبلتا نظر آتا ہے۔

پنڈت برج نرائن چکبست

بزرگوں کا وطن لکھنؤ ہے۔ مگر آپ ۱۸۸۲ء میں بمقام فیض آباد پیدا ہوئے۔ چند سال بعد لکھنؤ چلے آئے اور وہیں آپ کا نشو ونما ہوا۔ ۱۹۰۵ء میں کیننگ کالج سے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ اور ۱۹۰۸ء میں وکالت کا امتحان پاس کرکے وکالت شروع کردی۔ آپ کا شمار لکھنؤ کے ممتاز وکیلوں میں تھا۔
۱۲ فروری ۱۹۲۶ء کو ایک مقدمہ کی پیروی میں آپ رائے بریلی گئے تھے۔ سہ پہر کو لکھنؤ لوٹنے کے لئے اسٹیشن پر آئے۔ دماغ پر فالج گرا اور زبان بند ہوگئی۔ حتی الوسع دوڑ دھوپ ہوئی مگر علاج کارگر نہ ہوا۔ آخر اسٹیشن ہی پر سات بجے شام کو انتقال کیا۔ آپ کے بڑے بھائی پنڈت مہاراج نرائن چکبست آپ کی لاش کو لکھنؤ لے گئے۔

شاعری کا شوق آپ کو بچپن سے تھا۔ نو برس کی عمر سے شعر وسخن کا شغل جاری تھا۔ اساتذہ میں آتش، غالب اور انیس کے کلام کے آپ شیدا تھے۔ چنانچہ آپ کی غزل پر آتش اور مسدس پر انیس کی تقلید کا اثر نمایاں ہے۔

آپ کا مجموعہ کلام "صبح وطن" انڈین پریس الہ آباد نے شائع کیا ہے۔ جس میں آپ کی نظمیں، مسدس، غزلیات وغیرہ شامل ہیں۔

چکبست کی زبان لکھنؤ کی ٹکسالی زبان ہے۔ سلاست، چستی، بندش،

اور حسن ترکیب آپ کی خصوصیات زبان ہیں۔

غزلیات میں حسن و عشق کے افسانے بہت کم ہیں۔ اخلاقی مضامین کی کثرت ہے۔ فلسفۂ زندگی و موت کے مضامین اکثر پائے جاتے ہیں۔ اور حب وطنی کے جذبات کو بھی غزلوں میں سلیقہ سے جگہ دی ہے۔ سادگی ۔ بے تکلفی اور جوش آپ کی غزلیات کی خصوصیات ہیں۔

نظموں میں زیادہ تر مسدس ہیں۔ اس پر انیس کی تقلید کا رنگ غالب ہے۔ زبان اور طرز ادا نہایت صاف اور رواں ہے۔ مسدسوں کو چار حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ (۱) حب قومی ۔ (۲) حب وطنی (۳) سیاسی ۔ (۴) احباب اور دیگر لیڈروں کے مراثی۔

مسدسوں میں صداقت جذبات کے علاوہ جوش پایا جاتا ہے۔ فلسفیانہ خیالات سے انھیں بھاری بھرکم نہیں کرتے۔ بلکہ سادگی سے جذبات کا اظہار کرتے چلے جاتے ہیں۔ جہاں کہیں پند و نصیحت کا موقع آپڑتا ہے۔ وہاں واعظ خشک نہیں ہونے پاتے بلکہ شاعرانہ لطافت ہر جگہ قائم رکھتے ہیں۔ سیاسی مسدسوں میں اپنی رائے کا نہایت آزادی سے اظہار کرتے ہیں اور سادگی ادا کے جادو سے حرف حرف میں تاثیر بھر دیتے ہیں۔

ڈاکٹر سر شیخ محمد اقبال

اقبال کی ولادت ۱۸۷۶ء میں ہوئی۔ وطن مالوفہ سیال کوٹ ہے۔ لاہور کالج میں تعلیم پا کر ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ ڈگری حاصل کرنے کے بعد گورنمنٹ کالج میں پروفیسر ہو گئے۔ ۱۹۰۵ء میں تکمیل علم کے

لئے انگلستان گئے۔ وہاں فلسفے کے ڈاکٹر اور قانون کے بیرسٹر ہو کر ۱۹۰۸ء میں
ہندوستان واپس آئے۔

ابتدائے سن تمیز سے آپ کی طبیعت شاعری کی طرف مائل تھی۔ حضرت
داغ دہلوی کی اُستادی کا ہندوستان میں ہر طرف ڈنکا بج رہا تھا۔
اقبال نے بھی اُن ہی سے رجوع کیا۔ اور بذریعہ خط و کتابت اُن سے،
اصلاح لینی شروع کی۔ ابتدا میں غزل کہا کرتے تھے۔ اُن میں داغ
کی اصلاح کی بدولت صفائی اور سلاست کا جوہر موجود ہے۔ لیکن
اقبال کی ذہانت اور جدت پسند طبیعت غزل کے محدود دائرے میں کب
رک سکتی تھی۔ چنانچہ انھوں نے نظمیں لکھنی شروع کیں۔

۱۸۹۹ء میں دوستوں کے اصرار سے انجمن حمایت اسلام کے سالانہ
جلسہ میں آپ نے "نالۂ یتیم" کے عنوان سے ایک قابل قدر نظم پڑھی۔ اس
نظم نے اس شہرت کی بنیاد رکھ دی جو اب اطراف ہند اور بیرونجات میں
پھیلی ہوئی ہے۔

انگریزی لٹریچر کے ماہر اور فلسفی ہونے کے علاوہ آپ کو غور و فکر اور
تلاش و جستجو کا ذوق ابتدا سے ہے اُردو کی تقلیدی شاعری کو چھوڑ کر آپ
نے جدید رنگ کی نظمیں لکھیں۔ انگریزی نظموں کے نہایت کامیاب ترجمے
کئے۔

نظموں کے تین مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ (۱) بانگ درا۔ (۲) بال
جبریل (۳) ضرب کلیم۔ یہ مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔

اقبال کا کلام ہندوستان ہی میں نہیں، بلکہ ایران، افغانستان، انگلستان وغیرہ ممالک میں بھی قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ گورنمنٹ نے خاطر خواہ آپ کی قدردانی فرمائی۔ اور "سر" کے معزز خطاب سے سرفراز کیا۔

انگریزی لٹریچر کے زیر اثر اردو میں اگر نو بہ نو خیالات و اسالیب کا اضافہ ہو سکتا ہے۔ تو کلام اقبال اس کا بہترین نمونہ ہے۔ اگرچہ بعض پرستاران دہلی و لکھنؤ نے ان کی زبان پر چند اعتراضات کئے ہیں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان کے علوئے خیال، قومی ہمدردی، اخلاقی و معاشرتی اصلاح علمی بیداری قومی مذہبی اور سیاسی ہمت افزائی کے سب قائل ہیں۔

اقبال کے کلام کا خلاصہ یا روح رواں ذیل کا شعر ہے:-

یقیں محکم، عمل پیہم۔ محبت فاتح عالم
جہاد زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

اسی یقین عمل اور محبت کو آپ عجیب عجیب انداز سے فلسفیانہ رنگ میں رنگ کر پرجوش الفاظ میں پیش کرتے ہیں۔ جگنو کو، ستاروں کو چاند اور شبنم کو مخاطب کر کے کس کس بلند اور شاندار طریقے سے پیچیدہ مسائل کو حل کرتے ہیں۔ بادۂ حُبّ قوم و مذہب سے ہمیشہ سرشار رہتے ہیں اور نئے نئے انداز سے مسلمانوں کے افسردہ دلوں میں جوش و خروش پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ خود ہی خدا سے شکوہ کرتے ہیں کہ اے خدا تو اپنے بندوں سے بے التفاتی برت رہا ہے اور خود ہی شکوہ کا جواب دیتے ہیں اور سب الزام بندوں کے سر رکھتے ہیں۔ مسدس حالی کے بعد اگر اس پایہ کی کوئی نظم لکھی گئی ہے

تو وہ اقبال کا "شکوہ" و "جواب شکوہ" ہے۔

آخر میں یہ عرض کر دینا مناسب ہے کہ نادر تشبیہات، لطیف استعارات اور فارسی تراکیب اقبال کی زبان کی خصوصیات ہیں۔ بندش چست ہوتی ہے۔ فارسی تراکیب کے باوجود روانی و سلاست قائم رہتی ہے اور [illegible] کی وجہ سے خوشگوار ترنم پیدا ہو جاتا ہے۔ نمونہ کے طور پر ایک نظم ملاحظہ ہو۔

زندگی

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی — ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیمِ جاں ہے زندگی
تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ — جاوداں، پیہم دواں، ہر دم جواں ہے زندگی
اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے — سرِ آدم ہے، ضمیرِ کن فکاں ہے زندگی
زندگانی کی حقیقت کوہکن کے دل سے پوچھ — جوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں ہے زندگی
بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب — اور آزادی میں بحرِ بیکراں ہے زندگی
آشکارا ہے یہ اپنی قوتِ تسخیر سے — گرچہ اک مٹی کے پیکر میں نہاں ہے زندگی
قلزمِ ہستی سے تو ابھرا ہے مانندِ حباب — اس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی

تبصرہ

زبان واضح ہو کہ دورِ جدید دورِ نجم کا معاصر ہے۔ ایک طرف دورِ نجم کی غزل سرائی ہو رہی تھی۔ دوسری طرف دورِ جدید کی نیچرل شاعری کے نغمے بلند ہو رہے تھے۔ علاوہ ازیں دورِ جدید کے نمائندے آزاد اور حالی خود بلند پایہ

غزل گو اور اساتذہ کی آنکھیں دیکھے ہوئے تھے۔ اگر ان نمایندوں کی غزل سے سروکار رکھا جائے اور انھیں تاریخ ادب میں جگہ دی جائے تو یہ دورِ پنجم کی بزم ہی کے مستحق ثابت ہوں گے۔ اس لئے زبان کی اصلاح کے لحاظ سے دورِ جدید کو دورِ پنجم سے کسی طرح علیحدہ کرکے نہیں دکھایا جا سکتا۔ اور نہ لسانی اصلاح کے متعلق کوئی رائے پیش کی جا سکتی ہے۔ جو اصلاحیں دورِ پنجم میں ہوئیں۔ اُن ہی اصلاحوں سے دورِ جدید میں کام لیا گیا۔ ہاں اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ دورِ جدید کے شعرا نے جدید رنگ کی شاعری سے زبان میں نوبہ نَو مضامین ادا کرنے کی صلاحیت پیدا کردی اور آیندہ شعرا کے لئے روشوں کو خار دار جھاڑیوں سے پاک و صاف کر دیا۔ نئی پود ان ہی راستوں پر چل کر کارہائے نمایاں دکھائے گی۔

جو زبان جدید شاعری کے لئے استعمال میں آئی اُس میں اور قدیم غزل کی زبان میں ایک خاص فرق محسوس ہوتا ہے۔ اور وہ یہ کہ حالی اور اکبر الہ آبادی نے خاص خاص انگریزی الفاظ بے تکلفی سے نظم میں استعمال کئے۔ ہندی الفاظ بھی کافی تعداد میں استعمال ہوئے۔ سرور جہان آبادی نے مقامی اشیاء اور دیسی تلمیحات کو لطف کے ساتھ نظم کیا ہے۔

اصنافِ سخن غزل دورِ جدید کے لئے تقویم پارینہ ہے۔ غزل کو چھوڑ کر باقی تمام اصنافِ سخن اس دور میں خوب پھلی پھولیں۔ جن میں سے مسدس، مثنوی اور رباعی کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ "اردو کی مایۂ ناز نظم" "مد و جزر اسلام" مسدس میں لکھی گئی۔

"شکوہ" "جواب شکوہ" مسدس میں لکھا گیا۔ چکبست کی تمام قابل قدر نظمیں مسدس میں ہیں۔ حالی اور آزاد کی تمام قومی اور نیچرل نظمیں مثنوی میں ہیں۔ اقبال کی بہت سی چھوٹی چھوٹی نظمیں مثنوی ہی میں ہیں۔ اکبر الہ آبادی نے زیادہ تر رباعی اور قطعہ اور متفرق اشعار لکھے ہیں۔

موضوع سخن

موضوع سخن کے لحاظ سے دور جدید بڑا گراں قدر سرمایہ اپنے دامن میں لئے بیٹھا ہے۔ فلسفہ، اخلاق، نیچر، تجرد، صفات انسانی، تاریخی روایات، حب وطن، حب قوم، مذہب، معاشرت، سیاست، محبت، اتحاد، بے تعصبی، رواداری، قدیم تہذیب کی حمایت مغرب کی کورانہ تقلید، کی بیخ کنی، جوش عمل وغیرہ سیکڑوں عنوانات پر عجیب عجیب انداز سے خیالات و جذبات کا اظہار کیا گیا ہے۔ اور اس دور میں مسلسل اور مستقل نظموں کا بڑا زبردست ذخیرہ جمع ہو گیا۔ تخلیقی شاعری کے علاوہ اس دور میں انگریزی اور دیگر زبانوں سے منظوم تراجم بھی ہوئے۔ جو ہر طرح قابل قدر اور مفید ہیں۔

اسالیب بیان

اسالیب کے لحاظ سے بھی یہ دور گذشتہ تمام ادوار پر سبقت لے گیا ہے۔ جوش، صداقت، اصلیت، بے تکلفی، ترنم اور ہمواری تمام شعراء کی مشترک خصوصیات ہیں۔ ان کے علاوہ اکبر کی ظرافت ملیح اور طنز لطیف، اقبال کا فلسفیانہ انداز بیان، چکبست کی صاف سلیس اور ترنم ریز طرز ادا، آزاد کی سادہ رنگینی، حالی کی دلنشیں اور مصلحانہ سادگی و روانی، غرض گوناگوں

اسالیب بیان آپ کو اس دور میں دکھائی دیں گے۔ قدم قدم پر تنوع نظر آئیگا اور ہر جگہ گلہائے رنگا رنگ جنت نگاہ بنے ہوں گے۔

خامی

اس دور میں کہیں کہیں خامیاں بھی نظر آئیں گی۔ سطور بالا میں عرض کیا جا چکا ہے کہ اس دور میں موضوع سخن کی فراوانی ہے یہ موضوع اردو اور شعرائے اردو دونوں کے لئے بالکل نئے تھے۔ ابتدائی دور تھا۔ ابتدائی کوششیں تھیں۔ اس لئے کہیں کہیں انداز بیان میں خشکی اور بے رنگی آگئی ہے اور محاسن شاعری نمایاں نہیں ہو سکے ہیں۔ زبان و محاورہ کی بھی کہیں کہیں لغزشیں نظر آئیں گی۔ لیکن یہ خامیاں ایسی نہیں ہیں کہ اس دور کی جاذبیتوں کے مقابلہ میں انھیں کچھ بھی اہمیت دی جائے۔

نتیجہ

پرستاران طرز قدیم اس دور کی شاعری کو خواہ کسی نظر سے دیکھیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان لوگوں کے لئے جو قدیم رنگ شاعری سے مطمئن نہیں تھے۔ اس شاعری نے سرمایۂ نشاط پیدا کر دیا ہے۔ اب وہ اطمینان کا سانس لیتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ الحمدللہ اب ہماری شاعری اس قابل ہو چلی ہے کہ ہم اس کو دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کی شاعری کی محفل میں بطور نمائندہ پیش کر سکتے ہیں۔ اور وہ لوگ اس خیال میں حق بجانب بھی ہیں۔

باب ۱۱
دورِ حاضرہ کے شعرائے صاحبِ طرز

گذشتہ تمام ادوار کی طرح دورِ حاضرہ میں بھی خوشگوار شعرا کی کمی نہیں۔ لکھنؤ، دہلی اور ہندوستان کے گوشے گوشے میں اچھا خاصا کہنے والے شعرا موجود ہیں۔ لیکن اگر تمام خوشگو شعرا کا تذکرہ بیان کیا جائے تو یہ کتاب ادبی تاریخ کی حیثیت سے گر کر محض تذکرہ بن جائے گی۔ اس لئے خاکسار راقم الحروف تمام شعرا اور ان کے معتقدین سے معافی کا خواستگار ہے۔ ناچیز صرف اُن ہی شعرا کا تذکرہ اس دور میں کرے گا جنھیں دنیائے ادب صاحب طرز مانتی ہے۔ اور جو خاکسار کے نزدیک صاحب طرز ہی نہیں بلکہ اپنی استادی یا اپنے کلام کے اثر سے ملک میں مقلدین کی ایک جماعت پیدا کر رہے ہیں)

صفی لکھنوی علی نقی نام صفی تخلص۔ خلف رشید مولانا سید فضل حسین ۲ رجوری ۱۸۶۲ء کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ دس بارہ سال کے سن تک فارسی و عربی کی تکمیل کرتے رہے۔ اس کے بعد نارمل اسکول میں انگریزی شروع کی۔ اور سال بھر کے بعد کیننگ کالجیٹ اسکول میں داخل ہو کر انٹرنس تک باقاعدہ تعلیم حاصل کی۔ ۱۸۸۳ء

ین محکمہ دیوانی میں آپ کا تقرر ہوا۔ مختلف مقامات اور مختلف عہدوں پر رہ کر ۱۹۲۳ء میں چہل سالہ خدمات کے بعد پنشن پائی۔

حضرت صفی فی زمانہ لکھنؤ میں مسلم الثبوت اُستاد مانے جاتے ہیں بیسیوں موزوں طبع آپ کے دامن تربیت میں پرورش پاکر شاعر اور اُستاد ہوگئے۔ آپ کا کلام ابھی شائع نہیں ہوا۔ ابتدائی کلام کہیں نظر سے نہیں گزرا۔ البتہ آپ کی نظمیں اور غزلیں مختلف رسائل میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ مشاعروں میں بھی آپ اپنا کلام سناتے ہیں۔ خاکسار نے الہ آباد کے مشاعروں میں اکثر آپ کا کلام سنا ہے۔ اُن ہی مطبوعہ اور مشاعروں میں سنی ہوئی نظموں اور غزلوں سے جو خاکسار نے آپ کے کلام کے متعلق رائے قائم کی ہے۔ وہ سطور ذیل میں پیش کرتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ حضرت صفی نے لکھنؤ اسکول کی شاعری کے دامن کو بدنامی کے دھبے سے پاک کیا۔ اس میں تو کوئی شک نہیں کہ جس قدر کلام آپ کا منظر عام پر آچکا ہے۔ اس میں نہ مبالغہ کا عیب ہے نہ رعایت لفظی کی بھرمار۔ ضلع جگت اور ابتذال جو لکھنؤ اسکول کی شاعری کی خصوصیت ہوگئی تھی۔ اس کا شائبہ بھی آپ کے کلام میں نہیں لیکن مکمل کلام پر مجموعی رائے قائم کرنے کے لیے ابھی آپ کے کلام کی اشاعت تک انتظار کرنا پڑے گا۔

سادگی آپ کی غزلیات کا خاص جوہر ہے۔ زبان اور طرز بیان دونوں میں سادگی، صفائی اور دلکشی ہے۔ عاشقانہ مضامین کو نہایت

موثر طریقے پر نظم کرتے ہیں۔ محاورات، روزمرہ اور تشبیہات کا لطف بھی ہر جگہ برقرار رہتا ہے۔ فلسفۂ زندگی اور موجودہ عہد کے اہم مسائل پر بھی آپ نہایت خوبی سے روشنی ڈالتے ہیں۔ اور لطف یہ کہ تغزل کا سررشتہ ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔ کلام کی پختگی آپ کی کہنہ مشقی اور اُستادی کو مسلم کرتی ہے۔

نظمیں زیادہ تر شیعہ کانفرنس کے سالانہ جلسوں کے سلسلے میں لکھی گئی ہیں۔ بعض نظمیں عام دلچسپی کی بھی ہیں۔ آپ کی نظموں کا عام جوہر پر جوش سادگی ہے۔ دوسرا جوہر دلکشی ہے۔ آپ نے دو چار نظمیں مختلف مقامات کے تاریخی اور جغرافیائی حالات پر لکھی ہیں۔ جو باوجود اپنے خشک موضوع کے دلکش اور پُر لطف ہیں۔ اُن نظموں میں الفاظ کے ذریعہ سے جو تصویریں تیار کی گئی ہیں وہ ہر لحاظ سے داد کے قابل ہیں۔

ایک غزل بطور نمونہ ملاحظہ ہو۔

سیر گلشن دیکھئے سیر بیاباں دیکھئے
دل ہو قابو میں تو سب کچھ دیکھئے ہاں دیکھئے

اپنی اپنی گا رہے ہیں دونوں شیخ و برہمن
طے بھی ہوتی ہے یہ بحث کفر و ایماں دیکھئے

حق شناسی نام اسی کا ہے کہ دل بھر آئے جب
دیر کو برباد یا مسجد کو ویراں دیکھئے

نقش بینائی سمجھئے فرق اگر آئے نظر
ایک ہی صورت کے ہیں گبر و مسلماں دیکھئے

دیر اُسی کو جانئے کعبہ اُسی کو مانئے
پوجئے وہ دل جسے ہمدرد انساں دیکھئے

دل کے اندر آیئے کیجئے حریم جاں کی سیر
زلزلوں نے جس کو ڈھایا ہے وہ ایواں دیکھئے

تا کجا مستیٔ نظارۂ باغ و بہار
چشم عبرت سے ذرا گور غریباں دیکھئے

مُہر برلب دیکھئے محفل کی محفل زیر خاک
بیکسی کو ان خزانوں کا نگہباں دیکھئے

حال اپنا اب یہ ہے بیداریِ احساس سے	سوتے سوتے جس طرح خواب پریشاں دیکھئے
ذرے ذرے کو زمینِ دل کے ہے اک اضطراب	کب خدا جانے ٹھہرتا ہے یہ طوفاں دیکھئے
انقلاباتِ جہاں کی فکر ہی کیا ہے صفی
جو دکھائے گردشِ گردونِ گرداں دیکھئے

ظریف لکھنوی سید مقبول حسین نام۔ ظریف تخلص۔ جناب صفی لکھنوی کے چھوٹے بھائی اور محض لکھنؤ ہیں۔ عمر ایسی ہی کوئی پچاس پچپن کے قریب ہو گی۔ آپ کی شاعری کا رنگ آپ کے تخلص سے ظاہر ہے۔ شاعری کا شوق ابتدا سے تھا۔ لیکن طبیعت کی شوخی اور چلبلے پن نے ظرافت کی طرف مائل کیا۔ ابتداً محض ہنسی ٹھٹھول سے سروکار تھا۔ دو چار شعر اس رنگ کے ملاحظہ ہوں:—

یہ چلم دکھا کے بولے میاں مجنوں ساربان سے
بھئی ایک کش لگا لو چلے آتے ہو کہاں سے

دیکھنا ہو آپ کو گر حُسن یورپ کی بہار
چاہے شملم دیکھئے چاہے چیقندر دیکھئے

اُن سے بچئے آپ جو بوسے کے طالب ہیں حضور
مصحفِ رُخ چاٹ جائیں گے یہ جھینگر دیکھئے

نرہے یا مادہ عجب ترکیب ہے اس نام کی	کچھ حقیقت ہی نہیں کھلتی ہے سیتا رام کی

بعض اوقات انسانی خامیوں کو کسی خاص انداز سے منظر عام پر لانا ہنسنے ہنسانے کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ جن لوگوں پر کھلا حملہ کیا جاتا ہے۔ اُن کے دل پر خواہ کچھ بھی گذرے۔ شاعر کو اس سے سروکار نہیں ہوتا۔ اگر وہ لوگ کھسیانی ہنسی ہنس کر خود بخود اپنی خامیوں کی اصلاح کرلیں تو شاعر کی توقعات سے زیادہ اس کی ظرافت کا نتیجہ نکل آیا۔ اب اگر آپ چاہیں تو شاعر کو ادبی، مذہبی، سیاسی، مصلح کہہ لیجیے۔ آپ کو اختیار ہے۔ شاعر کے مدِنظر تو محض ہنسنا ہنسانا تھا۔ ظریف صاحب کی شاعری کا دوسرا انداز یہ ہے جو سطور بالا میں عرض ہوا اس رنگ کے بھی دو چار شعر ملاحظہ ہوں۔

لیڈری سستی ہوئی ہر چیز مہنگی ہوگئی ایک ہی آنہ میں مل جاتا ہے لیڈر[1] دیکھیے

داڑھی مونچھیں صاف ہیں مثلِ قلندر دیکھیے ما وہ رو ہیں مغربی تہذیب کے نرد دیکھیے

دہن غائب کمرِ معدوم پیرِ حسن کا دعویٰ حسین اگر ایسا ہو تو عجائب گھر کے قابل ہے

ظریف صاحب کی غزلوں کا عام رنگ یہی ہے لیکن اب انھوں نے طولانی نظمیں مسدس وغیرہ کی شکل میں لکھنی شروع کردی ہیں۔ جو حقیقت میں بلند پایہ اور قابل قدر ادبی کوششیں ہیں۔ آپ کی طولانی نظموں میں "سفرنامۂ عراق" "گول میز کانفرنس" "میونسپل الکشن" "شہر آشوب" وغیرہ نہایت کامیاب اور مفید ہیں۔

---

[1] روزانہ انگریزی اخبار جو الہ آباد سے نکلتا ہے۔

ظریف صاحب کے موجودہ کلام کو دیکھ کر آپ کو سچے مصلح ہونے میں شک نہیں رہتا۔ آپ کی طوالی نظموں میں خندۂ دنداں نما کم ہے۔ تبسم زیر لب ضرور ہے۔ لیکن وہ بھی سامعین کے چہروں پر غور و فکر کے آثار پیدا کر دیتا ہے۔ آپ ادبی، اخلاقی، مذہبی، سوشل، سیاسی خامیوں کو اس انداز سے بیان کرتے ہیں کہ دلوں میں تاثیر کے نشتر اتر جاتے ہیں۔

آپ کی طبیعت ہمہ گیر ہے۔ مطالعۂ فطرت قدم قدم پر نمایاں ہے۔ آپ کا موضوع سخن زیادہ تر انسان ہے۔ شہری دیہاتی، پردیسی غرض جس شخص کو لیتے ہیں۔ اس کی تصویر نگاہوں کے سامنے پیش کر دیتے ہیں۔ آپ کو سیرت نگاری میں کمال حاصل ہے۔ اُردو زبان پر جو قدرت حاصل ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ اُردو کے علاوہ پوربی زبان کو نہایت پُرلطف طریقے سے نظم کرتے ہیں۔ اُن کے دیہاتی اشخاص جب اپنی پوربی زبان میں ہلکی ہلکی اور جہالت کی باتیں کرتے ہیں تو محفل ادب میں ایک عجیب کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔

زبان میں لطف محاورہ روزمرّہ کی صفائی اور بندش کی چستی ہر جگہ جلوہ فرما ہے۔ ابتذال اور عامیانہ پن سے التزاماً گریز کرتے ہیں لیکن دیہاتی اشخاص کی زبان کے سبک اور سوقیانہ الفاظ کو روا رکھتے ہیں۔ اس سے بجائے عیب کے کلام میں اصلیت اور حُسن پیدا ہو جاتا ہے۔

عزیز لکھنوی مرزا محمد ہادی نام۔ عزیز تخلص۔ لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔ بزرگوں کا وطن شیراز تھا۔ شیراز سے کشمیر اور شاہان اودھ کے دورِ حکومت میں کشمیر سے لکھنؤ آئے۔ مرزا صاحب ۱۸۸۲ء میں پیدا ہوئے۔ سات برس کی عمر تھی کہ سایۂ پدری سے محروم ہو گئے۔

ابتدائی تعلیم نہایت ذوق و شوق سے حاصل کی۔ اس کے بعد اساتذہ کا کلام ہمیشہ نظر سے گزرتا رہا جس سے آپ کا علم و فضل رفتہ رفتہ ترقی کرتا رہا آخر دم تک تعلیم و تعلّم کا سلسلہ جاری رہا۔ آخر پچھلے سال ۱۹۳۵ء میں انتقال فرمایا۔

شاعری کا شوق ابتدا سے تھا۔ حضرت صفی سے استفادہ سخن کیا اور طبعی رجحان اور کثرت مشق سے بہت جلد مرتبہ استادی حاصل کر لیا۔ آپ کی استادی مسلم ہے۔ مرزا جعفر علی خاں آثر لکھنوی اور شبیر حسن خاں جوش ملیح آبادی جیسے خوش گو شعرا نے آپ کے دامن تربیت میں پرورش پائی ہے۔

آپ کا مجموعہ غزلیات "گلکدہ" کے نام سے شایع ہو چکا ہے۔ غزلیات کے علاوہ آپ کے قصائد بھی شایع ہوئے ہیں۔ دونوں صنفوں پر آپ کو قدرت کامل حاصل ہے۔

"گلکدہ" کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے لکھنؤ اسکول کی شاعری کی خصوصیات سے گریز کیا ہے۔ آپ کا کلام عام طور پر فرسودہ اور صوفیانہ مضامین سے پاک ہے۔ لوازم حسن کی تعریف و توصیف بھی کہیں نہیں ملتی۔

آپ متقدمین میں میرؔ اور متوسطین میں غالبؔ کے دلدادہ ہیں اور اُن ہی کی تقلید کرتے ہیں۔ غالبؔ سے آپ نے متانت کی اور انداز بیان میں بھی اُن ہی سے استفادہ کیا۔ میرؔ سے سوز و گداز لیا۔ لیکن مرثیہ کی ہر دل ... ی ات متاثر ہو کر سوز و گداز کو آہ و بکا میں تبدیل کر دیا۔ آپ کے کلام میں مرض نزع، موت، نوحہ، ماتم، گور غریباں وغیرہ کے مضامین اس کثرت سے ہیں کہ تمام کلام پر گویا مرثیت چھائی ہوئی ہے۔

زبان خاص لکھنؤ کی ٹکسالی زبان ہے۔ صفائی اور سلاست کی انتہا نہیں۔ لیکن غالبؔ کی تقلید میں فارسی تراکیب کا استعمال زیادہ کرتے ہیں۔ جن میں دو چار مقامات کو چھوڑ کر عام طور پر صفائی اور چستی پائی جاتی ہے۔

چند متفرق اشعار بطور نمونہ ملاحظہ ہوں۔

انجام درد یہ ہے وہ آغاز درد تھا	اب نیلگوں ہے چہرہ مگر پہلے زرد تھا
بھولتا ہی نہیں عالم تری انگڑائی کا	اپنے مرکز کی طرف مائلِ پرواز تھا حسن
وہ مرا پہلے پہل داخلِ زنداں ہونا	دیکھ کر ہر در و دیوار کو حیراں ہونا
قضا کیا ہے وِلی جذبات کا حد سے گزر جانا	وصالِ دائمی کیا ہے شبِ فرقت میں مر جانا
یادگار حسن و عشق اک داغ دل پر رہ گیا	شمع بجھ کر رہ گئی پروانہ جل کر رہ گیا
اٹھتے ہیں نیند سے جب سر پہ آفتاب آیا	مریضِ ہجر کی ایسوں کو قدر کیا ہوگی

اصغرؔ گونڈوی اصغر حسین نام۔ اصغرؔ تخلص ہے۔ اصلی وطن گورکھپور کے ضلعے میں ہے۔ لیکن ایک مدت تک گونڈہ میں مقیم رہے۔ اس لئے گونڈوی مشہور ہیں۔ آپ یکم مارچ ۱۸۸۴ء کو پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم د
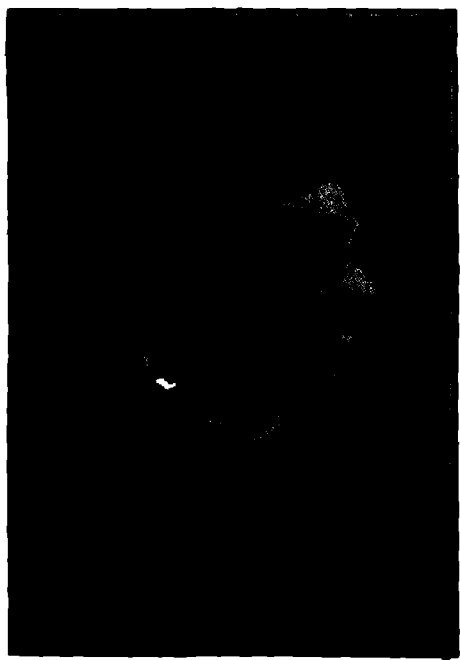
مولانا اصغر حسین اصغر

اپنے
دیکھ
وصا
شمع
مرابع

اصغر

گونڈوی

تربیت معمولی اور غیر مستقل طور پر ہوئی۔ کچھ دنوں انگریزی مدرسوں میں بھی
تعلیم پائی۔ تاہم اس تھوڑی سی مدت میں فطری صلاحیت کی وجہ سے
اتنی استعداد پیدا ہو گئی کہ انگریزی کی ادبی کتابوں کا کافی لطف اٹھا
سکتے ہیں اور اب تو یہ حال ہے کہ "ہندوستانی" کی اڈیٹری کے سلسلے
میں اگر کبھی کسی انگریزی کتاب یا مضمون کے ترجمے کا اتفاق ہوتا ہے تو
اس بے تکلفی سے بے تکان ترجمہ کرتے چلے جاتے ہیں کہ اچھے اچھے ڈگری یافتہ
منہ دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ یہی حال عربی اور فارسی کا ہے۔ خصوصاً فارسی پر آپ
کو بڑا عبور حاصل ہے۔ کبھی کبھی فارسی میں بھی سخن سنجی کرتے ہیں۔

شاعری کا شوق ابتدا سے تھا۔ زمانۂ نو مشقی کے چار اشعار "خمخانۂ
جاوید" میں نظر سے گذرے جن سے شاندار مستقبل کا پتہ چلتا ہے۔ وہ
مستقبل اب حال ہے۔ جس کا تذکرہ آئندہ آتا ہے۔ آپ نے مستقل طور
پر کسی سے استفادہ نہیں کیا۔ ابتدا میں کچھ دنوں منشی خلیل احمد وجد
بلگرامی کو اپنا کلام دکھایا۔ آخر میں کچھ غزلیں منشی امیر اللہ تسلیم کو دکھائیں
اس کے بعد سلسلہ بند ہو گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ حقیقی شاعر کے لئے اس کے
ذوقِ صحیح اور وجدانِ سلیم سے بڑھ کر کوئی استاد ہو ہی نہیں سکتا۔

حضرت اصغر پہلے گونڈے میں مقیم تھے۔ وہیں آپ کا ایک چشمہ کا کارخانہ
تھا۔ اس کے بعد آپ لاہور تشریف لے گئے۔ اور وہاں ادبی خدمات انجام
دیتے [illegible] نوں انڈین پریس الہ آباد سے بھی تعلق رہا۔ فی الحال
"ہندو [illegible] یمی" کے سہ ماہی رسالہ "ہندوستانی" کے اڈیٹر ہیں اور

الہ آباد میں مستقل قیام ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کے انفاس میں برکت دے۔[1]
خاکسار کو حضرت اصغرؔ سے نیاز حاصل ہے۔ آپ کی صحبت میں اُٹھنے
بیٹھنے کا اکثر اتفاق ہوا ہے۔ ناچیز پر ازبس بزرگانہ و مشفقانہ عنایت فرماتے
ہیں۔ آپ کے وسیع اخلاق کے متعلق صرف اس قدر عرض کر سکتا ہوں کہ
حضرت اصغرؔ پکے مسلمان ہیں لیکن زاہد خشک نہیں۔ مزاج میں رنگینی کہئے یا
ظرافت۔ طبیعت میں مروّت کہئے یا لطافت، یا اُن سب اوصاف کا مجموعہ
غرض دوست تو دوست اجنبی بھی آپ کی پُر مغز۔ اور مسلسل گفتگو سے
نہیں اُکتاتا تھا۔ آپ بادۂ تصوّف کے بھی ذوق شناس ہیں۔ حضرت قاضی
شاہ عبدالغنی صاحب منگلوری سے شرف بیعت حاصل ہے۔

آپ کے کلام کے دو مجموعے شایع ہو چکے ہیں۔ ایک "نشاطِ روح"
۱۹۲۵ء میں اور دوسرا "سرودِ زندگی" ۱۹۳۵ء میں شایع ہوا۔ دونوں
مجموعے اگرچہ مختصر ہیں لیکن اس اختصار میں بلندترین شاعری کے اعلیٰ نمونے
موجود ہیں۔ حضرت اصغرؔ بہت کم گو شاعر ہیں۔ اور اسی کم گوئی میں اُن کی
شاعری کا راز مضمر ہے۔ فرمایا کرتے ہیں کہ پُر گوئی کے معنی میری لغت میں ہیں
رطب و یابس سے کلام کو بھر دینا۔ دو چار شعر اس رنگ کے کہنا۔ دو چار

---

[1] یہ کتاب زیرِ طباعت تھی کہ حضرت اصغرؔ نے بمرض فالج بتاریخ ۳۰ر نومبر ۱۹۳۶ء
داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ آپ کی قبل از وقت رحلت سے دنیائے اُردو کو ناقابلِ تلافی
صدمہ پہنچا۔ آپ احاطۂ مزارِ حضرت شاہ محب اللہ میں مدفون ہیں۔

اُس رنگ کے کہنا کچھ ادھر کے کچھ ادھر کے غرض چشم زدن میں لمبی چوڑی غزل تو تیار کر دیا لیکن خود اپنا رنگ کچھ نہ ہوتا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اصغر صاحب نہایت کاوش سے شعر کہتے ہیں اور وہی کہتے ہیں جو کہنا چاہتے ہیں۔ اور یہ حقیقت ہے کہ ان کے کلام میں جس قدر ہمواری اور ایک رنگی ہے۔ اُس کی نظیر مشکل ہی سے کہیں اور ملے گی۔

" شعرا رماضی و حال سے اصغر صاحب کو صرف اسقدر تعلق ہے کہ آپ بھی انکی طرح غزل گو ہیں۔ اس کے سوا آپ کے کلام میں کسی ذکسی کی تقلید کا جلوہ ہے۔ اور نہ تتبع کی جھلک۔ آپ کی اجتہادی شان آپ کو محفلِ ادب میں سب حاضرین سے ممیز و ممتاز کرتی ہے۔ اور یہی اجتہادی اور غیر تقلیدی رنگ آپ کے فطری شاعر ہونے کی دلیل ہے۔

اصغر صاحب کی زبان اور اندازِ بیان میں لطافت اور جدت ہے۔ زبان کی متانت اور سنجیدگی، انداز بیان کی شگفتگی اور رنگینی سے امتزاج پاکر کلام میں وہ دل آویز ندرت پیدا کر دیتی ہے کہ تاثیر شعری خود وجد میں آتی ہے۔ تشبیہہ و استعارات کا استعمال بھی ہے۔ لیکن اصغر صاحب کی تشبیہوں میں ندرت اور استعارات میں اچھوتا پن پایا جاتا ہے۔ یہ چیزیں سب نئی ہوں گی۔ ان میں لطافت اور نزاکت کی انتہا نہ ہوگی۔ ندرت ادا کا یہ عالم ہے کہ معمولی سی بات بھی کہیں گے تو اس انداز سے کہیں گے کہ دلکش اور انوکھی معلوم ہونے لگے گی۔

آپ کے کلام پر اگرچہ ذوقِ فارسیت غالب ہے۔ تاہم آپ کی زبان میں صفائی اور برجستگی ہے۔ مصرعے ایسے ڈھلے ہوتے ہیں کہ سلاست اور

روانی سے خود بخود ترنم پیدا ہوجاتا ہے۔

خیالات و جذبات میں جوش اور صداقت بدرجۂ احسن موجود ہے۔ عامیانہ جذبات اور فرسودہ خیالات کی سطح سے گزر کر اصغر صاحب کی نظر لطیف حقائق و معارف تک پہنچتی ہے۔ جوش و مسرت، غم و رنج، ہجر و وصال، بیم و اُمید وغیرہ کیفیات سے متاثر ہونا اور اس تاثر کا کسی نہ کسی طرح اظہار کر دینا عام شعرار کا شیوہ ہے۔ اصغر صاحب ان کیفیات سے متاثر ہوکر عالم بیخودی میں چلا نہیں اُٹھتے بلکہ یہ کیفیات اُن پر الہامی حالت طاری کردیتی ہیں۔ اور وہ فلسفہ و حکمت کی تہ میں اُتر جاتے ہیں اور وہاں جن نتیجوں پر پہنچتے ہیں اُن کو شاعرانہ رنگینی اور لطافت سے شعر کے سانچے میں ڈھال دیتے ہیں۔ فلسفہ اور تصوف کے خشک مسائل کو اصغر صاحب حسن رنگینی اور شعریت کے پیرائے میں بیان کرتے ہیں۔ وہ شاعر اُن [illegible] کا حصہ ہے۔ فلسفیانہ خیالات کے اظہار میں ہمیشہ لطافت اور دل آویزی [illegible] ہے۔ آپ کے کلام میں جوش، ترنم، سکون، اضطراب، سرمستی اور بے خودی کے امتزاج سے ایک ایسی کیفیت پیدا ہوگئی ہے کہ سامعین و قارئین کے دل و دماغ پر کیف، سرور اور رقص کی حالت [illegible] ہو جاتی ہے۔

آپ کے تفکرات و خیالات میں اتحاد و یکرنگی پائی جاتی ہے۔ فلسفۂ افنا نیست کو جس جس انداز سے آپ نے کہا ہے۔ اس کی مثال کہیں اور نہیں مل سکتی۔ مثال کے طور پر محض حُسن و عشق کو لیجئے۔ آپ کے نزدیک حُسن و عشق کوئی علیحدہ اور مستقل ہستی نہیں رکھتے۔ بلکہ ایک کا وجود دوسرے کے وجود پر

مئی ہے ۔ عام زبان میں اس مضمون کو اس طرح ادا کیا جا سکتا ہے کہ
عاشق میں جس درجہ کا ذوقِ نظر ہے معشوق میں اسی درجہ کا حسن ہوتا ہے
چنانچہ فرماتے ہیں ۔

ہاں وادیٔ ایمن کے معلوم ہیں سب قصے موسیٰ نے فقط رہنا اک ذوقِ نظر دیکھا
وہ عشق کی عظمت سے شاید ہمیں واقف ہیں
سو حسن کر دل پیدا ایک ایک تمنا سے

سوز و گداز غزل کی خصوصیت ہے اگر اس سوز و گداز سے یاس،
حسرت آہ و بکا گریہ و زاری، فریاد و ماتم وغیرہ مراد لی جائے تو اصغر
صاحب کا کلام ایسے سوز و گداز سے یکسر پاک ہے ۔ خود فرماتے ہیں ۔

غزل کیا اک شرارِ معنوی گردش میں ہے اصغر
یہاں افسوس گنجائش نہیں فریاد و ماتم کی

ایک جگہ اور فرمایا ہے ۔

شعر میں رنگینیٔ جوش و تخیل چاہئے مجھ کو اصغر کم ہے عادت نالہ و فریاد کی

لیکن اگر سوز و گداز دل کی ایک لطیف دردمندانہ کیفیت کا نام ہے تو اصغر صاحب
کا کلام ایسے سوز و گداز سے لبریز ہے ۔

آخری اور شاید بہترین خصوصیت آپ کے کلام کی یہ ہے کہ آپ کے اشعار
فکر انگیز اور خیال افزا ہوتے ہیں ۔ غزلیات کے مطالعہ سے لطیف اور بلند باتیں
دل میں ابھرتے ہیں ۔ چنانچہ آج سے آٹھ نو سال پیشتر جب نشاط روح
اول اول خاکسار کی نظر سے گزری تو چند صفحات کے مطالعہ سے جو تاثر ابھر کر

دل پر مترتب ہوئی اس کا اظہار اس طرح ہوا تھا۔

عجز نما کلام ہے اصغر کا اے صغیر — افسردہ دل کو محشرِ جذبات کر دیا

اب حضرت اصغر کے چند اشعار سے لطف اٹھائیے۔

کیا کہیئے جاں نوازی پیکانِ یار کو — سیراب کر دیا دلِ منت گزار کو

جوشِ شباب، نشۂ صہبا، ہجومِ شوق — تعبیر یوں بھی کرتے ہیں فصلِ بہار کو

قہر ہے تھوڑی سی بھی غفلت طریقِ عشق میں — آنکھ جھپکی قیس کی اور سامنے محمل نہ تھا

نیازِ عشق کو سمجھا ہے اے واعظ ناداں — ہزاروں بن گئے سجدے جبیں میں نے جہاں رکھ دی

کیا کیا ہوا ہنگامِ جنوں یہ نہیں معلوم — کچھ ہوش جو آیا تو گریباں نہیں دیکھا

موجِ نسیمِ صبح میں بوئے صنم کدہ بھی ہے — اور ابھی جان پڑ گئی کیفیتِ نماز میں

بس اتنے پر ہوا ہنگامۂ دار و رسن برپا — کہ لے آغوش میں آئینہ کیوں مہرِ درخشاں کو

سنا ہے حشر میں شانِ کرم بیتاب نکلے گی — لگا رکھا ہے سینے سے متاعِ ذوقِ عصیاں کو

کو جلوہ بے رنگ سے ہوش اسقدر گم ہیں — کہ پہچانی ہوئی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی

رسم فرسودہ نہیں شایانِ اربابِ نظر — اب کوئی منظر بلند از کفر و ایماں دیکھئے

جگر مرادآبادی

علی سکندر نام۔ جگر تخلص۔ مرادآباد آپ کی وطنیت پر فخر کرتا ہے۔ بزرگوں کا وطن دہلی تھا۔ آپ کے والد علی نظر شاعر اور صاحب دیوان تھے۔ اور خواجہ وزیر لکھنوی سے انھوں نے اصلاحِ سخن لی تھی۔ جگر صاحب کی ابتدائی تعلیم معمولی اور غیر مستقل طور پر ہوئی۔ فارسی کی چند ابتدائی کتابیں پڑھیں انگریزی سے بھی کچھ واقفیت ہے۔

آپ کی عمر اس وقت کوئی پچاس کے قریب ہوگی۔ میانہ سے کچھ کم قد، سیاہ گول

فرنچ کٹ ڈاڑھی۔ سر کے بال پریشان۔ لباس سے بے پروا۔ بظاہر شاعری کے نجد کے مجنوں لیکن شگفتہ مزاج اور رنگینیٔ طبع۔ مستقل قیام کا فخر کسی خاص مقام کو حاصل نہیں۔ جہاں کسی قدردان نے مدعو کر لیا۔ کچھ دن گزار دیئے۔

آپ نے ذوقِ سخن ترکہ میں پایا۔ ابتداءً والد بزرگوار سے مشورۂ سخن کیا۔ اُن کے بعد داغ سے فیض پایا۔ کچھ غزلیں منشی امیر اللہ تسلیم کو بھی دکھائیں۔ لیکن ابتدائی کلام پر داغ کا رنگ زیادہ غالب ہے۔

آپ کے کلام کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ایک "داغ جگر" اور دوسرا "شعلۂ طور"۔ لیکن ان دونوں مجموعوں کا رنگ ایک دوسرے سے قطعی مختلف ہے۔ داغ جگر کی خصوصیات سادگی، روانی، دلنشین فارسی تراکیب، شوخی، معاملہ بندی اور جذبات و خیالات میں حمق وغیرہ ہیں۔ تعجب ہے کہ جگر صاحب "داغ جگر" کو پسند نہیں فرماتے۔ خاکسار نے خود اُن کی زبانی سنا ہے کہ جگر اب وہ جگر نہیں رہا۔ "داغ جگر" بھی اسی جگر کے ساتھ ختم ہوا۔ موجودہ جگر کو سمجھو تو موجودہ کلام سے سمجھو۔ آپ کا یہ قول خواہ شاعرانہ وارفتگی پر مبنی ہو۔ لیکن اس میں بہت کچھ اصلیت بھی پائی جاتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جس زمانے میں اصغر صاحب گونڈے میں چشموں کا کاروبار کرتے تھے۔ جگر صاحب چشموں کی ایجنسی کیا کرتے تھے اور اس سلسلہ میں جگر صاحب کو اُن سے تبادلۂ خیالات کا موقع ملتا تھا۔ صحبتیں گرم اور شعر و سخن کے چرچے رہتے تھے۔ اسی زمانے میں جگر صاحب کو اصغر صاحب سے عقیدت پیدا ہو گئی۔ چنانچہ آجکل یہ حالت ہے کہ آپ اصغر صاحب کے روبرو دوزانو باادب بیٹھتے ہیں۔ اگر اُن کے یہاں قیام کرنے کا موقع ملتا ہے تو دختر رز سے بگاڑ اور بچوقتہ نماز کی پابندی کر لیتے ہیں۔ مشاعروں

میں اُن کی غزلیں خود پڑھتے ہیں اور اگر کوئی اور پڑھنا چاہے تو اس سے بگڑ جاتے ہیں۔ اصغر صاحب کو بھی آپ کی خاطر اور دلدہی منظور رہوتی ہے۔ چنانچہ اُن ہی سے غزل پڑھواتے ہیں۔ اس عقیدت کی وجہ پردۂ راز میں ہے۔ لیکن کسی کسی حلقے میں لوگوں کا خیال ہے کہ جگر حضرت اصغر کے شاگرد ہیں۔ اگر اُستاد شاگردی کو عام معنوں میں سمجھا جائے تو یہ غلط ہے کہ جگر صاحب اصغر کے شاگرد ہیں۔ ورنہ اصغر صاحب کی صحبت اور اُن کے کلام کا جو اثر جگر صاحب کے کلام پر پڑا ہے اس کے رو سے ایک معنی میں آپ ضرور اُن کے شاگرد ہیں اور اس تاثر کا جلوہ "شعلۂ طور" میں صاف نظر آتا ہے۔

سطور بالا سے "داغ جگر" اور "شعلۂ طور" کے باہمی فرق کو سمجھنے میں سہولت ہوگی۔ "شعلۂ طور" میں سادگی، روانی اور دل نشین فارسی تراکیب وہی ہیں جو "داغ جگر" میں لیکن شوخی اور معاملہ بندی، کیف و وارفتگی۔ بیخودی اور والہانہ انداز بیان سے بدلتی ہے ان پر رنگینی اور دلکشی کا اضافہ ہوتا ہے۔ متانت اور پختگی بڑھتی ہے تخیل میں بلندی اور جذبات میں جوش و صداقت پیدا ہوتی ہے۔ حقائق و معارف کی شاعرانہ رنگینی سے کلام میں گہرائی اور عمق پیدا ہوتا ہے۔

جگر صاحب کے کلام میں حسن ہے خواہ حسن ادا کہیے خواہ حسن تخیل۔ غرض حسن سے اور شعر میں حسن کا ہونا شاعری کی معراج ہے۔ آپ اپنے پڑھنے کے طور پر تجربے والہانہ سے ایک مخصوص ترنم سے اس طرح پڑھتے ہیں کہ شعر کے حسن کی تاثیر کی انتہا نہیں رہتی۔ اطراف ہند میں جہاں ان کے رنگ شاعری کی تقلید کی جارہی ہے وہاں ان کے ترنم سے بھی مشاعروں کو گرمایا جاتا ہے۔

چند اشعار بطور نمونہ درج کئے جاتے ہیں۔

کام آخر جذبۂ بے اختیار آ ہی گیا | دل کچھ اس صورت سے تڑپا اُن کو پیار آ ہی گیا
ہائے یہ حسنِ تصور کا فریبِ رنگ و بو | میں نے یہ سمجھا جیسے وہ جانِ بہار آ ہی گیا
اس طرح خوش ہوں کسی کے وعدۂ فردا پہ میں | فی الحقیقت جیسے مجھ کو اعتبار آ ہی گیا
پیتا بغیر اذن یہ کب تھی مری مجال | در پردہ چشمِ یار کی شہ پا کے پی گیا

فنائے عشق کو رنگِ بقا دیا تو نے | حیات و موت کو یکجا دکھا دیا تو نے
ہزار جانِ گرامی فدا اس نسبت | کہ میری ذات سے اپنا پتہ دیا تو نے
یہ کیا کیا کہ عطا کر کے عشقِ لا محدود | مجھے حریفِ مقابل بنا دیا تو نے
ہزار دل کو عطا کر دیا مجھے اک درد | اس ایک درد کو پھر دل بنا دیا تو نے
ہر ایک دل کو عطا کی ہے مدعائے حیات | جگر کو اک دلِ بے مدعا دیا تو نے

فکرِ منزل ہے نہ ہوشِ جادۂ منزل مجھے | جا رہا ہوں جس طرف لیجا رہا ہے دل مجھے
روک سکتی ہو تو بڑھ کر روک لے منزل مجھے | لے اُڑی ہے ایک موجِ بے قرارِ دل مجھے
... غیرتِ سوزِ محبت پھونک دے | اب سمجھتی ہیں وہ نظریں رحم کے قابل مجھے

فانی بدایونی شوکت علی نام۔ فانی تخلص۔ ۱۳ ستمبر ۱۸۷۹ء کو پیدا ہوئے۔ فانی صاحب کے والد مرحوم محمد شجاعت علی خاں۔ محکمہ پولیس میں ملازم تھے۔ انھیں اپنے بیٹے کے لئے کسی آزاد پیشے کی تمنا تھی۔ چنانچہ انھوں نے فانی صاحب کو وکالت کے لئے مجبور کیا۔ آپ نے انٹرنس تک اپنے وطن بدایوں ہی میں تعلیم پائی۔ بریلی کالج سے بی۔ اے اور الہ آباد اور علی گڈھ سے ایل۔ ایل۔ بی پاس کیا۔

شعر و سخن کا شوق بچپن سے دامن گیر تھا۔ ان کے والد انھیں شعر گوئی سے روکتے

تھے اور یہ پوشیدہ طور پر کہتے رہتے تھے۔ ایک مرتبہ بذریعہ خط و کتابت داغ دہلوی سے مشورۂ سخن کرنا چاہا۔ مگر یہ راز افشا ہو گیا۔ اور انھیں یہ سلسلہ ختم کر دینا پڑا۔ غرض یہ کہ آپ نے کسی سے اصلاح نہیں لی۔ فراق صحیح اور وجدان سلیم نے آپ کی رہنمائی کی۔ اور آخر راہ راست پر ڈال دیا۔

آپ نے تین دیوان تصنیف کئے تھے۔ دو مثنویاں اور دو ڈرامے بھی لکھے۔ مگر آپ کی عدم توجہی سے یہ ذخیرہ تلف ہوتا رہا۔ آخر بچا کھچا کلام "باقیات فانی" کے نام سے شایع کیا۔

آپ کی زبان عام طور پر شیریں اور صاف ہے، فارسی تراکیب بھی دل کش اور مناسب ہیں۔ لیکن کہیں کہیں مضمون کی گہرائی اور تخیل کی بلندی کی وجہ سے تراکیب میں پیچیدگی اور ثقالت آگئی ہے۔ لطف محاورہ بھی موجود ہے۔ خاص خاص محاورے زبان پر زیادہ چڑھے ہوئے ہیں۔

پروفیسر رشید احمد صاحب صدیقی نے "باقیات فانی" پر مقدمہ لکھا ہے آپ فرماتے ہیں کہ فانی یاسیات کے امام ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ آپ کے کلام میں سوز و گداز یاس و حزن اور ملال کی حد تک بڑھا ہوا ہے۔ لہجہ ایسا دردناک ہے کہ دل پر اثر کئے بغیر نہیں رہتا۔ اس ضمن میں مشہور و معروف غزل کے چند اشعار درج کئے جاتے ہیں۔

مآل سوز غم ہائے نہانی دیکھتے جاؤ | بھڑک اٹھی ہے شمع زندگانی دیکھتے جاؤ
غرور حسن کا صدقہ کوئی جاتا ہے دنیا سے | کسی کی خاک میں ملتی جوانی دیکھتے جاؤ
سنے جاتے نہ تھے تم سے مرے دن رات کے شکوے | کفن سرکاؤ میری بے زبانی دیکھتے جاؤ

پروفیسر صاحب موصوف الصدر نے فانی صاحب اور غالب کا موازنہ کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔ غالب کی مانند فانی کو بھی مجردات سے بحث کرنے کا خاص ذوق اور اُس کے اظہار پر غیر معمولی قدرت ہے۔ اُن کو دقیق سے دقیق مسئلہ کی تشریح و تفسیر کے لئے بھی غیر مانوس یا دقیق الفاظ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اُن کو غالب کے مقابلے میں ایک امتیازی حیثیت دی جاسکتی ہے۔ مگر بہرحال الفضل للمقدم علاوہ بریں وہ غالب کی مانند متنوع نہیں یعنی انھوں نے غالب کی طرح زندگی کے ہر پہلو کا ہر نقطۂ نگاہ سے مطالعہ نہیں کیا ہے۔

فانی صاحب کے کلام میں تصوّف کی چاشنی بھی ایک پُرلطف حد تک موجود ہے۔ بیان و خیال میں عام طور پر ندرت و جدت پائی جاتی ہے۔ جذبات میں پُردرد جوش کے ساتھ اضطراب اور کشمکش کی آمیزش شعر کو نازک اور پُرلطف بنادیتی ہے۔

چند اشعار بطور نمونہ ملاحظہ ہوں۔

امکانِ معرفت کو سمو کر محال میں ۔۔۔ وہ دل میں یوں رہے کہ نہ آئے خیال میں
ٹوٹا نہ ہم سے رشتۂ رسمِ حجابِ عشق ۔۔۔ چھوٹا نہ ہم سے ہجر کا دامن وصال میں
قدموں پہ گر کے کوئی خطا کار مر نہ جائے ۔۔۔ ذوق آفرینیاں ہیں تمھارے ملال میں
ملتی نہیں تصورِ ہستی سے اب نجات ۔۔۔ گھر سا گیا ہوں حلقۂ دامِ خیال میں
آخر زمانہ آئینہ دکھلا کے رہ گیا ۔۔۔ لانا پڑا تم ہی کو تمھاری مثال میں

جوشؔ ملیح آبادی

شبیر حسن خاں نام۔ جوشؔ تخلص۔ ملیح آباد کے رہنے والے۔ قصبہ کنولہار میں ۱۸۹۴ء میں پیدا ہوئے آپ فقیر محمد خاں گویا صاحب "بستان حکمت" (ملاحظہ ہو حصّہ نثر فورٹ ولیم کالج) کے پرپوتے ہیں۔ جوشؔ لڑکپن ہی میں سایہ پدری سے محروم ہو گئے۔ جس کی وجہ سے تعلیم و تربیت پر خاطر خواہ توجہ نہ ہو سکی۔

شعر و سخن کا ذوق ابتدا سے تھا۔ زمانہ طالب علمی میں مشق سخن جاری تھی۔ خداداد ذہانت اور مذاق سلیم نے رہبری کی اور عہد حاضرہ میں صاحب طرز شعراء میں آپ کا شمار ہوتا ہے۔

ابتداءً زمینداری کا کام کرتے رہے پھر دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ کے شعبہ تالیف و ترجمہ میں ادبی نقاد کی خدمات انجام دیتے رہے۔

جوشؔ صاحب کو غزل اور نظم دونوں پر قدرت کامل حاصل ہے آپ کی شہرت زیادہ تر آپ کی نظموں کی وجہ سے ہے۔

غزل میں صفائی، روانی اور سلاست بہت ہے۔ فارسی تراکیب میں بندش کی چستی اور دلکشی موجود ہے۔ سوز و گداز و لپسند حد تک پایا جاتا ہے۔ صوفیانہ مضامین اور معرفت کے رموز بھی نہایت سادگی سے نظم ہوتے ہیں۔ ابتذال اور عامیانہ پن سے کلام یکسر پاک ہے۔

نظم میں آپ کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ نظموں میں جوش، سادگی اور صداقت بدرجہ احسن موجود ہیں۔ تشبیہات میں ایک طرح کی ندرت ہے جس سے کلام کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے۔ اصلاحی پہلو بھی کافی نمایاں ہوتا ہے۔ نظموں میں

جذبات کا زور بہت ہے۔ اس لئے عام طور پر مناظر قدرت کی نقاشی میں نیچرل حالت پوری طرح واضح نہیں ہوتی۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ جذبات کی آڑ میں جو ہلکی سی تصویر ہوتی ہے وہ بہت دلکش ہوتی ہے۔ کلام عام طور پر بلند پایہ اور معیاری ہوتا ہے۔ یاس و حرماں نصیبی کا کہیں پتہ نہیں ملتا۔

بطور نمونہ چند رباعیات پیش کی جاتی ہیں جن سے کلام کی شرینی کا ایک حد تک اندازہ ہوگا۔

مرنے پہ نوید جاں ملے یا نہ ملے
یہ کنج یہ بوستاں ملے یا نہ ملے
بیٹھے ہیں تو سر پہ چھوڑ اے خانہ خراب
معلوم نہیں وہاں ملے یا نہ ملے

گر شیخ ملے دعوئ ہمہ دانی کر کے
تفسیر مآل شاد مانی کر کے
تو آتش دوزخ سے ڈراتے ہے انھیں
جو آگ کو پی جاتے ہیں پانی کر کے

دل ہوتا ہے اور پاک کیسے گا ہے
دم لیتے ہیں پھر کے آہ گہ بے گا ہے
اس ڈر سے کہ خود ہی خدا نہ بن جائے کہیں
کر لیتے ہیں ہم گناہ گاہے گاہے

گردوں سے بلند ہے نشیمن اپنا
فردوس پہ خندہ زن ہے گلشن اپنا
تو کوثر و تسنیم کا چھوڑے گا نہ فکر
اچھا تو نچوڑ دوں یہ دامن اپنا

تبصرہ

زبان اس دور میں آپ کو کوئی شاعر روایتی اُستاد کی حیثیت سے لئے ہوئے نظر نہ آئے گا۔ فی زمانہ یہ خیال ہوتا جاتا ہے کہ روایتی اُستادی اور شاگردی کا زمانہ اب ختم ہوگیا جو علوم و فنون اساتذہ کے سینوں میں چھپے ہوئے تھے اور جن کے حصول کے لئے اُن کے روبرو زانوئے تلمذ تہ کرنا پڑتا تھا وہ علوم و فنون اب کتب فروشوں کی دوکانوں سے نہایت ارزاں قیمت پر خریدے جا سکتے ہیں۔ متروکات کی لمبی چوڑی فہرست اور توضیع قواعد قوانین کا اب زمانہ نہیں رہا۔ شخصی سعی و کوشش کی۔ قدر و قیمت نہیں رہی۔ اب رنگ زمانہ حجت اُستاد ہے۔ مدعا یہ ہے کہ شعرار کی توجہ اصلاح زبان کی طرف نہیں۔ اُس کی وجہ یا تو یہ ہے کہ اساتذہ متوسطین کے احسانات سے زبان منجھ کر اُس قدر صاف ہوچکی ہے کہ اب مزید اصلاح کی حاجت نہیں رہی۔ یا یہ وجہ ہوسکتی ہے کہ شعرار کا رجحان زیادہ تر تخیل کی بلندی اور مضمون کی ندرت کی طرف ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ جذبات کی صداقت تخیل کی بلندی اور کلام کا جوش و خروش خود بخود زبان کی اصلاح کرتا رہتا ہے۔

بہر کیف زبان کی کچھ نہ کچھ ترقی اس دور میں بھی نظر آتی ہے۔ مغربی اثر اور سائنس اور فلسفہ کی جہانگیری سے خیالات کی دُنیا متاثر ہوئی۔ خیالات کا تاثر زبان پر اثر انداز ہوا۔ جس کی وجہ سے زبان میں ادائے مطالب کی وسعت بڑھنی شروع ہوئی۔ موجودہ شعرار کا خیال ہے کہ ادائے

مطالب کی وسعت اور افزائش حسن کی صلاحیت جس قدر فارسی تراکیب میں ہے اور کسی زبان میں نہیں۔ لہذا یہ دور فارسی تراکیب کے اعتدال سے بڑھے ہوئے استعمال کے لئے خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ فارسی تراکیب سے زبان میں جو وسعت، جو حسن اور نزاکت پیدا ہوگئی ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ فارسی تراکیب کے استعمال میں بے اعتدالیاں بھی ہورہی ہیں لیکن جو فطری شاعر ہیں اُن کا کلام اعتدال کی عمدہ مثال ہے۔

اصناف سخن نی زمانہ اگرچہ نظموں کی کمی نہیں، ادبی رسائل میں اُن کی بھرمار ہے۔ لیکن خاکسار کو ان نظموں سے کسی شاندار مستقبل کی توقع نہیں، ناچیز کے نزدیک اس دور کی غزل تمام اصناف سخن پر بھاری ہے اور یہی اس دور کی خاص صنف ہے۔

موضوع سخن غزل کا خاص موضوع اگرچہ حُسن و عشق ہی ہے لیکن حُسن حُسن مطلق ہے اور عشق عشق حقیقی، جذبات میں صداقت ہے۔ اور واردات میں اصلیت، تصوف اور فلسفہ بھی اس دور کا خاص موضوع ہے۔ لیکن حقائق و معارف کے بیانات میں شاعرانہ لطافتیں موجود ہوتی ہیں۔ حیات انسانی اور نفسیات کا گہرا مطالعہ بھی اس دور کی خصوصیت ہے۔

اسالیب بیان فرسودہ مضامین اور عامیانہ انداز بیان اس دور میں مفقود ہے۔ طرزادا زیادہ تر حکیمانہ ہے۔ لیکن کلام میں خشکی اور بے رنگی نہیں آنے پاتی۔ کیف و سرور، بے خودی و سرمستی

رنگینی و رعنائی، متانت اور سنجیدگی کے ساتھ ترکیب پاکر کلام میں تڑپ اور اثر پیدا کر دیتی ہیں۔ غزلیں عام طور پر اس طرح لکھی جاتی ہیں کہ چاہے انھیں مجازی معنوں میں سمجھو چاہے حقیقی معنوں میں اور یہ اس دور کا خاص اسلوب بیان ہے۔ اس اسلوب نے عشق مجازی اور عشق حقیقی کو ایک کر کے دکھا دیا ہے۔ اس دور کی شاعری کا لب و لہجہ متین اور مہذب ہے۔ آپ آج کل کے اشعار کو ہر سوسائٹی میں بلا تکلف پڑھ کر سنا سکتے ہیں۔ غرض اس دور کے اسلوب بیان نے غزل کو بہت بلندی پر پہنچا دیا ہے۔

نتیجہ: غالب نے غزل کی زمین میں جو تخم بویا تھا۔ موجودہ زمانہ میں سرسبز و شاداب پودا ہی نہیں بن گیا ہے بلکہ پھل دار درخت بھی ہو رہا ہے۔ اردو شاعری کی معرکتہ الآرا صنف یعنی غزل اس دور میں معراج کمال پر پہنچ گئی ہے۔ ایک زمانہ میں جو اس کی طرف سے بدگمانی پیدا ہو گئی تھی۔ اس وقت وہ بدگمانی خوش اعتقادی سے بدل چکی ہے اور یقین ہوتا جاتا ہے کہ غزل ہی تمام اصناف کی سرتاج ہے۔

قیاس کہتا ہے کہ نثر کی عمر اس سے بھی زیادہ ہونی چاہیے۔ چنانچہ مصنف اردوئے قدیم کی رائے میں شیخ عین الدین گنج العلم متوفی ۷۹۵ھ (۱۳۹۲ء) کے رسالے نثر کے قدیم ترین نمونے ہیں۔ لیکن چونکہ یہ رسالے دستیاب نہیں ہو سکے لہٰذا عملی سہولت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے "معراج العاشقین" ہی کو اردو نثر کی پہلی کتاب سمجھا جاتا ہے۔ تحقیق و جستجو ابھی ہمت ہار کر نہیں بیٹھی ہے۔ اس کی سرگرمی ہنوز جاری ہے۔ لہٰذا ابھی سے کوئی آخری فیصلہ کر دینا قبل از وقت ہوگا۔

اس ابتدائی دور کو مذہبی دور اس لئے کہا گیا ہے کہ اس میں جو تصانیف ملتی ہیں وہ زیادہ تر مذہبی مقاصد کو مدِ نظر رکھ کر لکھی گئی ہیں اور عوام کی زبان یعنی اردو کو اشاعت و تبلیغ اسلام کا ذریعہ سمجھا گیا ہے۔

۱۔ معراج العاشقین

اس وقت تک اوّلیت کا فخر اسی تصنیف کو حاصل ہے۔ حضرت ابو الفتح صدر الدین سید محمد حسینی گیسو دراز متوفی ۸۲۵ھ/۱۴۲۲ء نے اسے ۱۳۹۸ء میں تصنیف کیا۔ نمونۂ عبارت یہ ہے:

"نبی علیہ السّلام کہے۔ انسان کے بوجنے کوں پانچ تن، ہر ایک تن کوں پانچ دروازے ہیں۔ ہور پانچ دربان ہیں۔ پہلا تن، واجب الوجود، مقام اس کا شیطانی، نفس اس کا امارہ، یعنی واجب کی آنک سوں غیر نہ دیکھنا سو حرص کے کان سوں غیر نہ سننا سو۔ حسد کی نکسوں۔ بدبوئی نہ لینا سو۔ بغض کی زبان سوں بدگوئی نہ کہنا سو۔ کینہ کی شہوت کوں غیر جاگا نہ چپا۔ پیر طبیب کامل ہونا۔ نبض پچھان کو دوا دینا سو

طبیبِ عشق را دکان کدام است — علاج جاں کند اورا چہ نام است

پہیر منع کئے سو پرہیز کرنا۔ مراقبے کی گولی۔ مشاہدے کے کانسے میں میکائیل کے
مدد کے پانی سوں جلی کا کاڑا کر کو پیلانا۔ سگن کا کاڑا۔ دیا۔ نرگن ہوا تو تو، شفا
پاوے گا۔ طبیب فرمائے یتوں پرہیز کرے تو اپنے بھی طبیب ہووے گا۔ ہور ماٹی
میں ماٹی، ماٹی میں پانی، ماٹی میں آگ، ماٹی میں بارا، ماٹی میں خال، ان
پانچ عناصران کا واجب الوجود بوجا تو معرفت تمام ہوا۔

”معراج العاشقین“ کو حال ہی میں مولانا عبدالحق صاحب نے
حیدرآباد دکن سے شائع کیا ہے۔

”معراج العاشقین“ کے بعد تقریباً ایک صدی تک کسی تصنیف و
تالیف کا سراغ نہیں ملتا۔ ”اردوئے قدیم“ میں چند بزرگوں کے دو ایک
اردو فقرے لکھے ہیں۔ لیکن ان فقروں کو اردو کی مستقل تالیف نہیں
کہا جا سکتا۔

۲۔ شرح مرغوب القلوب

حضرت شاہ میراں جی شمس العشاق بیجاپوری متوفی ۱۴۹۶ء کا تذکرہ
باب دوم میں گذر چکا ہے۔ ”شرح مرغوب القلوب“ آپ ہی کی تالیف
ہے۔ سال تالیف معلوم نہیں۔ ظاہر ہے کہ ۱۴۹۶ء سے قبل ہی تصنیف ہوئی ہوگی۔

نمونۂ عبارت یہ ہے:۔

”پیغمبر کہے جے کچ کام کرے گا کوئی خدا ناؤں نالیکر تو وہ کام پائمال ہوگا۔
سراناں، نواز ناخدا کو بہوت کر اوپالن ہار اہے عالم کا۔“

۳۔ کلمۃ الحقائق

شاہ برہان الدین جانم کا تذکرہ بھی باب دوم میں گزر چکا

ہے۔ یہ تصنیف آپ ہی کی ہے جو ۱۵۸۲ء سے قبل تصنیف کی جا چکی تھی۔ عبارت کا نمونہ یہ ہے :۔

سوال۔ یہ تن الادھا (علیحدہ) بلکہ ستنتر بکار ردپ دستا ہے۔ یک تل قرار نہیں جیوں مرکٹ روپ۔

جواب۔ اے عارف ! ظاہر تن کے فعل نے گندیا د باطن کریت دستے اس کا قانون سو ممکن الوجود۔ دوسرا تن سو بھی کر اس ایندرین کا بکار دھیشٹیا کرن ہارا سو وہی تن نہیں تو یو خاک و سوکھ دو ڈکھ بھوگن ہارا۔ جیتا یکار دپ وہی دوسرا تن تو توں نظر کر دیکھ یہ تن فہم سوں گندریا۔ تو گن اس کا کیوں رہے۔

۴۔ احکام الصلوٰۃ | یہ کتاب ۱۶۲۲ء میں قطب شاہ کے عہد حکومت میں لکھی گئی۔ اس کے مصنف مولانا عبداللہ ہیں۔ نمونۂ عبارت یہ ہے۔

"بات کرنے سوں نماز جاتا ہے۔ نماز میں آدمیاں کی مثال دعا منگنے نماز جاتا ہے۔ دہ کہے سوں نماز جاتا ہے۔ درد سوں یا مصیبت سوں نماز جاتا ہے۔ نماز میں کسی کی موت کی خبر سن کر قالوا انّا للّٰہ و انّا الیہ راجعون بولنے سوں نماز جاتا ہے۔ مصحف دیک کر پڑنے سوں نماز جاتا ہے۔ قہقہہ ہنسنے سوں نماز جاتا ہے۔"

۵۔ سب رس | یہ تصنیف اس دور کی مایۂ ناز ادبی کوشش ہے۔ اسے ملا وجہی معاصر سلطان عبداللہ قطب شاہ نے ۱۶۳۵ء میں تصنیف کیا۔ حال ہی میں مولوی عبدالحق صاحب نے اسے مع مقدمہ اور فرہنگ

نے شائع کیا ہے۔ یہ کتاب ادبی نقطۂ نگاہ سے قدیم اردو میں ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں حسن و عشق کی کشمکش اور عشق و دل کے معرکے کو قصے کی صورت میں پیش کیا ہے۔ طرزِ بیان بھی اس دور کی تصانیف سے مختلف ہے تمام عبارت مقفٰی اور مسجع ہے لیکن روانی اور سلاست کا رشتہ کہیں ہاتھ سے چھوٹنے نہیں پایا ہے۔ عبارت کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

زینتِ سخن و تسمیۂ کتاب

"یو قدرت اللہ ہے۔ یو اسرار اللہ ہے۔ یو ہاتف اللہ ہے۔ لا الٰہ الا اللہ

یو عجیب کتاب ہے۔ سبحان اللہ۔ اس کتاب کا ناؤں "سب رس" سب کوں پڑھنے آوے ہوس۔ بول بول کوں جڑے اس یاگار ہو اچھے گا۔ دنیا میں کئی لاکھ برس۔ بہوتیچ (بہت ہی) شیریں بہوتیچ لذیذ۔ عاشقوں کے گلے کا تعویذ۔ یو کتاب سب کتاباں کا سرتاج۔ سب باتاں کا راج۔ ہر بات میں سو سو معراج۔ اس کا سواد سمجھے نا کوئی عاشق باج۔ اس کتاب کی لذت پانے عالم سب محتاج۔ کیا عورت کیا مرد جس میں کچھ عشق کا درد اس کتاب کوں سینے پرتے ہلاسے نا۔ اس کتاب بغیر کوئی اپنا وقت بہلاسے نا۔ جو کوئی پڑھے گا جنس جنس کا اثر جھڑے گا ...."

مندرجہ بالا تصنیف کے علاوہ اس عہد میں اور بھی کتابیں مثلاً "طوطی نامہ" (۱۰۴۹ھ) مصنفہ محمد قادری، "اسرار التوحید" مصنفہ سید شاہ میر وغیرہ لکھی گئیں۔ جن کا تذکرہ طوالت سے خالی نہیں۔ واضح ہو کہ اب تک جس قدر کتابوں کا تذکرہ

کیا گیا وہ سب دکنی پیداوار ہیں۔ شمالی ہند میں اس وقت تک سناٹا ہے۔

شمالی ہند میں اوّل تو لوگوں پر شاعری کا رنگ غلبہ کئے ہوئے تھا۔ دوسرے اُن کے دل و دماغ پر فارسی اس قدر مسلّط تھی کہ وہ اُردو میں تصنیف و تالیف کرنا ننگ و عار سمجھتے تھے۔ تصنیف و تالیف تو ایک طرف مراسلات بھی فارسی ہی میں ہوتے تھے۔ یہی فارسی اثر تھا کہ اُردو نثر کی طرف لوگوں کی توجہ ہوئی بھی تو قافیہ و سجع کے تکلّفات کی قید سے ایک مدت تک آزاد نہ ہو سکے۔

"کربل کتھا" یا "دہ مجلس"

"کربل کتھا" یا "دہ مجلس" شمالی ہند کی پہلی کتاب ہے۔ یہ ۱۷۳۲ء میں تصنیف ہوئی۔ مصنف شاہ فضل اللہ المتخلص بہ فضلی ہیں۔ یہ کتاب روضۃ الشہداء کا ترجمہ ہے۔ عبارت اس کی مقفّٰی و مسجّع اور پیچیدہ ہے۔ نمونۂ عبارت ملاحظہ ہو۔

اس کا سبب تالیف کا یہ تھا کہ قبلۂ حقیقی اور کعبۂ تحقیقی میرے نواب مستطاب معلّی القاب یعنی نواب بابام اشرف علی خاں سلّمہٗ اللہ الملک المنّان ہر سال تعزیہ ابو عبداللہ الحسین علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کا بخلوص نیت اندرون محل بوجہ حسن بجا لاتا تھا اور بندۂ حقیر پر تقصیر حسب الارشاد اس قبلہ گاہ کے روضۃ الشہداء کا خلاصہ کہ سب نکتہ سنجان مناقب شاہ لا فتیٰ نے اور سب دقیقہ مہان مصائب سید الشہداء نے واقعہ شہادت کربلا اس میں لکھا ہے، سناتا تھا لیکن معنی اسکے عورتوں کے سمجھ میں نہ آتے تھے اور فقرات پر سوز و گداز اس کتاب مذکور کے بسبب لغات فارسی اُن کو نہ رُلاتے تھے۔ اکثر اوقات بعد کتاب خوانی سب یہ مذکور کرتیں کہ صد حیف و صد ہزار افسوس جو ہم کم نصیب عبارت فارسی نہیں سمجھتے اور رونے کے ثواب سے بے نصیب رہتے ہیں۔ ایسا کوئی

صاحب شعور ساوے کہ کسی طرح من و عن ہمیں سمجھا دے اور ہم سی بے سمجھوں کو سمجھا کر رُلا دے مجھ احقر افقر کی خاطر میں گزرا کہ اگر ترجمہ اس کتاب کا برنگینیٔ عبارات اور حُسن استعارات ہندی قریب الفہم عامۂ مومنین و مومنات کیجئے ! .... بڑا ثواب لیجئے "

وہ مجلس کی تالیف کے ایک مدت بعد سودا نے اپنے دیوان مرثیہ کا دیباچہ اُردو نثر میں لکھا جو اُن کے کلیات میں موجود ہے - یہ دیباچہ غالبًا ۱۷۶۶ء میں لکھا گیا ہے - اس کی عبارت بہت مشکل اور پیچیدہ ہے - نمونہ ملاحظہ ہو -

ضمیر منیر پر آئینہ داران معنی کے مبرہن ہو کہ محض عنایت حق تعالیٰ کی ہے - جو طوطی ناطقہ شیریں سخن ہو پس یہ چند مصرع کہ از قبیل ریختہ در ریختہ خامۂ دو زبان اپنی سے صفحۂ کاغذ پر تحریر پائے - لازم ہے کہ تحویل سخن سامعہ سنجان روزگار کروں تا زبانی اُن اشخاص کی ہمیشہ مورد تحسین و آفریں رہوں - مطلع -

قیمت و قدر شناسی سے پہنچے ہے ہم
ورنہ دریا میں خزف بھی نہیں گوہر سے کم

مضمون سینے میں بیش از مرغ اسیر نہیں کہ ہو بیچ قفس کے - جس وقت زبان پر آیا فریاد بلبل ہے واسطے گوش دادہ ہیں کے - غرض جس اہل سخن کا در منصفی زینت لب ہے ، سر رشتۂ حُسن معانی کا اس کلام کے اُس سے انصاف طلب ہے - اگر حق تعالیٰ نے صبح کاغذ سفید کی مانند شام سیاہ کرنے کو یہ خاکسار خلق کیا ہے تو ہر انسان کے فانوس دماغ میں چراغ ہوش دیا چاہئے کہ وہ دیکھ کر

نکتہ چینی کرے۔ ورنہ آئندہ مرآلودہ سے بے اجل کا ہے کو مرے ......"

سوداؔ کے مندرجہ بالا دیباچہ سے بائیس سال بعد یعنی ۱۷۸۶ء میں شاہ مولوی رفیع الدین صاحب دہلوی نے قرآن شریف کا ترجمہ کیا۔ اور دو سال بعد یعنی ۱۷۹۰ء میں مولانا شاہ عبدالقادر صاحب دہلوی نے بھی قرآن پاک کا ترجمہ کیا۔ ان دونوں ترجموں کی عبارت اگرچہ آسان ہے۔ الفاظ آسان اور عام فہم ہیں لیکن چونکہ لفظی ترجمہ کیا گیا ہے۔ اس لئے الفاظ میں بے ترتیبی اور نشست الفاظ میں ڈھیلا پن پایا جاتا ہے۔ اور ان عیوب سے عبارت قریب الفہم نہیں رہتی۔ نمونہ ملاحظہ ہو:-

ترجمہ از شاہ عبدالقادر صاحب:" اے جماعت جنوں اور انسانوں کی! کیا تم کو نہیں پہنچے تھے رسول تمہارے اندر کے۔ سناتے تم کو میرے حکم اور ڈراتے اس دن کے سامنے آنے سے۔ بولے ہم نے مانے اپنے گناہ۔ اور ان کو بہکایا زندگی نے اور قائل ہوئے اپنے گناہ پر کہ وہ تھے منکر۔ یہ اس واسطے کہ تیرا رب ہلاک کرنے والا نہیں بستیوں کو ظلم سے۔"

تبصرہ

اردو نثر کی ابتدائی دو چار سو برس کی طویل مدت میں پھیلا ہوا ہے۔ اس مدت میں تقریباً ساڑھے تین سو برس دکن کے حصے میں آتے ہیں۔ اور پچاس پچپن برس شمالی ہند کے حصے میں۔ اس دور کو مذہبی دور کہا گیا ہے۔ کیونکہ اس دور کا تمام سرمایہ کم و بیش مذہبی رنگ میں رنگا ہوا ہے۔ لطف یہ کہ سوداؔ کا دیباچہ جو نہایت مختصر اور کوئی مستقل تصنیف نہیں مراثی کے دیوان کا دیباچہ ہے۔ جسے بھی کچھ نہ کچھ مذہبی حیثیت حاصل ہے۔

زبان | زبان اس دور میں ابتدائی منازل طے کر رہی ہے۔ اگرچہ اس وقت تک اردو نظم کافی ترقی کر چکی ہے۔ اس میں میر و سودا جیسے شاعر اپنے اپنے کمالات دکھا رہے ہیں۔ لیکن نثر ابھی عالمِ طفلی میں ہے۔ دکنی تصانیف میں "سب رس" کو چھوڑ کر باقی تمام تصانیف سادہ اور بے تکلف عبارت میں لکھی گئی ہیں۔ لیکن ان میں دکنی، مرہٹی، تامل وغیرہ الفاظ کی آمیزش اس حد تک ہے کہ اس زمانے میں اس کا سمجھنا دشوار ہے "سب رس" کا بھی یہی حال ہے لیکن اس کی عبارت میں رنگینی ہے۔ قافیہ اور ... آ گیا ہے۔ اور تکلفات ... کی قدرت کے ساتھ ساتھ قدرے ... بھی پیدا ہو گئی ہے۔ اب شمالی ہند میں آئیے۔ یہاں تین نمونے ملتے ہیں۔ فضلی ... یہاں دکنی اور قدیم الفاظ کے عوض فارسی اور عربی الفاظ کی کثرت ہے۔ سودا ... کے یہاں اس کثرت میں اور ترقی ہے۔ لیکن مترجمین قرآن کے یہاں ... الفاظ ہیں نہ عربی و فارسی الفاظ لیکن زبان خلافِ روزمرہ اور بے ترتیب ہے۔

طرزِ بیان | اس دور میں نثر عاری لکھی گئی اور نثر مقفّیٰ ... مسجّع بھی لیکن طرزِ بیان ہر حالت میں اُکھڑا اُکھڑا سا ہے۔ دکنی اور شمالی ہند کی تصانیف کے اندازِ بیان میں کافی فرق محسوس ہوتا ہے۔ قدیم الفاظ سے قطع نظر کی جائے تو "سب رس" کا اندازہ "دہ مجلس" کے انداز سے صاف اور سلیس ہے۔ یعنی شمالی ہند کا انداز اُلجھا ہوا اور دشوار ہے۔

نتیجہ | اس ابتدائی دور کو کوئی خاص ادبی اہمیت حاصل نہیں۔

باب ۱۳

اُردو نثر کا دوسرا یعنی افسانوی دَور

سنہ ۱۸۰۰ء سے سنہ ۱۸۳۶ء تک

تمہید دَور اوّل سنہ ۱۷۹۰ء میں ختم ہوتا ہے اور دوسرے دور کی ابتدا سنہ ۱۸۰۰ء سے ہوتی ہے۔ اِس دس سال کی مدت میں ایک ایسی کتاب کا حال معلوم ہوتا ہے جس کو نہ دور اوّل سے کوئی تعلق ہے اور نہ دور دوم سے۔ اس لئے خاکسار اس کا تذکرہ یہاں تمہید میں کئے دیتا ہے۔

مذکورہ بالا کتاب کا نام "نوطرز مرصع" ہے۔ یہ کتاب حضرت امیر خسرو کی کتاب "چہار درویش" کا ترجمہ ہے۔ مترجم میر محمد عطا حسین خاں تحسین اٹاوہ کے رہنے والے ہیں۔ "نوطرز مرصع" مقبول عام نہ ہو سکی۔ اس لئے اب اس کا نام ہی رہ گیا ہے۔

فورٹ ولیم کالج انگریزوں کو جب ہندوستان کا مستقبل اُمید افزا اور شاندار نظر آنے لگا تو انھوں نے اپنی تجارت و سلطنت کو استحکام دینے کے لئے متعدد ذرائع اختیار کئے۔ منجملہ ایک ذریعہ یہ بھی تھا کہ انگریز تجار و حکام کو دیسی زبان سکھانے کے لئے فورٹ ولیم میں ایک کالج قائم کیا گیا۔ چونکہ ہندوستانی اور خصوصاً شمالی ہند اور پایۂ تخت دہلی

کی زبان اردو تھی۔ لہٰذا اردو کی تعلیم و تعلّم پر زیادہ زور تھا۔ اردو کی تعلیم کے لئے کتابوں کی ضرورت تھی۔ مگر یہاں بجز چند دواوین کے اور کیا تھا چنانچہ اسی کالج میں تصنیف و تالیف کا ایک شعبہ قائم کیا گیا۔ اس شعبہ کے صدر ڈاکٹر جان گلکرائسٹ تھے۔ فورٹ ولیم کالج اور ڈاکٹر صاحب موصوف نے اردو زبان پر جو جو احسانات کئے ہیں۔ اردو نثر ان سے سبکدوش نہیں ہو سکتی۔ علاوہ متعدد تصانیف و تالیفات کے ان ہی ڈاکٹر صاحب کی نظر التفات کی وساطت سے اردو دربار سرکار میں رسائی پاکر عدالتی زبان قرار پائی۔

ڈاکٹر جان گلکرائسٹ

آپ نے شعبۂ تصنیف و تالیف کے صدر ہونے کی حیثیت سے محض مختلف مشہور نثاروں سے کتابیں ہی نہیں لکھوائیں بلکہ خود بھی چند کتابیں لکھی ہیں۔ یوں تو آپ نے متعدد کتابیں تصنیف کیں۔ لیکن حسب ذیل زیادہ مشہور اور مفید ہیں۔

۱۔ انگریزی ہندوستانی لغت۔
۲۔ ہندوستانی علم اللسان (فرہنگ)۔
۳۔ ہندوستانی کی صرف و نحو۔
۴۔ اتالیق ہندی۔
۵۔ مکالمہ (یہ کتاب انگریزوں کے لئے تھی۔ تاکہ عام مضامین پر بول چال میں انھیں مہارت حاصل ہو)
۶۔ قصص مشرقی (متفرق انگریزی قصّوں کا ترجمہ ہے) وغیرہ۔

اِس دَور کے مشہور نثّار اور اُن کی تصانیف

میر شیر علی افسوس آپ میر مظفر خاں کے بیٹے تھے جو میر قاسم نواب بنگالہ کے داروغۂ توپ خانہ تھے۔ افسوس دہلی میں پیدا ہوئے۔
ابتداءً آپ کے والد نواب عمدۃ الملک امیر خاں کی سرکار میں ملازم تھے۔ لیکن نواب موصوف کی وفات کے بعد وہ لکھنؤ چلے گئے۔ اُس وقت افسوس کی عمر گیارہ برس کی تھی۔ لکھنؤ کی فضا نے بچپن ہی میں شعر و سخن کا شوق پیدا کر دیا۔ میر حیدر علی حیرانؔ دہلوی کو اپنا کلام دکھانے لگے۔ عربی اور علم حکمت کی تحصیل عالمانہ تھی۔

میر افسوس ابتداء میں نواب سالار جنگ اور اُن کے لڑکے نوازش علی خاں کے پاس گیارہ برس تک رہے۔ پھر مرزا جواں بخت ولی عہد نے جو اُن دنوں لکھنؤ میں رونق افروز تھے۔ کلام سُن کر از راہ قدر دانی طلب فرمایا اور اپنے مصاحبوں میں داخل کر لیا۔ جب جواں بخت کچھ عرصے کے بعد دہلی جانے لگے تو یہ ہمراہ نہ جا سکے اور نواب سرفراز الدولہ حسن رضا خاں نائب آصف الدولہ کے پاس چلے آئے۔
چند سال بعد کرنیل اسکاٹ نے آپ کو کلکتہ بلایا۔ پانچسو روپیہ زادِ راہ بھیجے اور دو سو روپیہ ماہوار تنخواہ مقرر کر دی۔ آپ فورٹ ولیم کالج کے سربرآوردہ لوگوں میں شمار ہونے لگے تھے۔ آخر ۱۸۰۹ء میں انتقال ہوا۔
دو کتابیں آپ نے یادگار چھوڑیں۔ ایک "باغ اردو" جو سعدی کی گلستاں کا ترجمہ

ہے اور دوسری "آرائش محفل" جس میں ہندوستان کے تاریخی حالات درج ہیں۔ افسوس کہ آج کل دونوں کتابیں نایاب ہیں۔

"باغِ اُردو" کی زبان سلیس اور سادہ ہے ترجمہ میں اصلی فارسی کی خوبی کو بڑی حد تک قائم رکھا ہے۔ اشعار کا ترجمہ بھی اشعار ہی میں کیا ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو:۔

(باب دوم گلستاں) ایک بزرگ نے کسی پرہیزگار سے پوچھا کہ فلانے عابد کے حق میں آپ کیا کہتے ہیں کہ اکثر اشخاص اُس کے حق میں طعنہ آمیز باتیں کہتے ہیں۔ کہا اُس نے کہ بظاہر اس میں کچھ عیب نہیں دیکھتا اور باطن سے آگاہ اللہ ہے۔

جس کو ظاہر میں متقی دیکھے ۔۔۔ اُس کے تقویٰ کا کرنہ تو انکار
کھوج مت کر کسی کے باطن کا ۔۔۔ محتسب را درون خانہ چہ کار

مرزا لطف علی لطف مرزا لطف علی نام لطف تخلص تھا۔ آپ کے والد ناظم بیگ خاں استرآباد کے رہنے والے تھے۔ نادر شاہ کے ساتھ شاہجہاں آباد آئے۔ فارسی کے شاعر تھے اور ہجری تخلص کرتے تھے۔ مرزا لطف کو ڈاکٹر گلکرائسٹ نے کلکتہ بلا کر شعبۂ تصنیف و تالیف میں جگہ دی۔ اور تذکرۂ شعراء لکھنے کی فرمائش کی۔ چنانچہ آپ نے تذکرہ "گلشنِ ہند" نامی تذکرہ ۱۸۰۱ء میں مرتب کیا۔

تذکرہ کی زبان صاف اور سادہ ہے۔ تاہم قافیہ کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ بعض باتیں تذکرہ میں ایسی درج ہیں کہ جن کا ذکر کسی اور جگہ نہیں پایا جاتا۔ تاریخی

۱۵۔ تنویر

حالات بھی خوب درج کئے ہیں۔ مولوی عبدالحق صاحب نے اس تذکرہ کو شائع کر دیا ہے۔ یہ تذکرہ اردو شعرا کا پہلا تذکرہ ہے جس میں شعراء کے حالات اُردو زبان میں لکھے گئے ہیں۔

میر امّن دہلوی

میر امان نام اور امّن تخلص تھا۔ دہلی کے رہنے والے بڑے نامور اور خاندانی شخص تھے۔ فن شعر میں کسی سے اصلاح نہیں لی۔ خود فرمایا کرتے تھے کہ "شاعری میرا پیشہ نہیں ہے نہ میں کسی شاعر کا بھائی میری اُردو ٹکسالی اُردو ہے کیونکہ میں دلی کا روڑا ہوں اور یہیں کا پروردہ یا فتہ ہوں"

میر امّن اور ان کے بزرگوں کے حالات خود اُن ہی کی زبانی سنئے۔ اور اسی بیان کو اُن کی عبارت کا نمونہ سمجھئے۔

" پہلے اپنا حال یہ عاصی میر امّن دلّی والا بیان کرتا ہے کہ میرے بزرگ ہمایوں بادشاہ کے عہد سے ہر ایک بادشاہ کی رکاب میں پشت بہ پشت جانفشانی بجا لاتے رہے اور وہ بھی پرورش کی نظر سے قدردانی جتنی چاہئے فرماتے رہے، جاگیر، منصب اور خدمات کی عنایت سے مالا مال اور نہال کر دیا اور خانہ زاد موروثی اور منصب دار قدیمی زبان مبارک سے فرمایا۔ چنانچہ یہ لقب بادشاہی دفتر میں داخل ہوا۔ جب ایسے گھر کی کہ سارے گھر اس کے سبب سے آباد تھے۔ یہ نوبت پہنچی ظاہر ہے عیاں را چہ بیان تب سورج مل جاٹ نے جاگیر کو ضبط کر لیا اور احمد شاہ درّانی نے گھر بار تاراج کیا۔ ایسی تباہی اُٹھا کر ایسے شہر سے کہ جنم بھوم میرا ہے اور آنول نال وہیں گڑا ہے۔ جلا وطن ہوا اور ایسا جہاز کہ جسکا ناخدا خدا تھا۔ غارت ہو گیا میں بے کسی کے سمندر میں غوطے کھانے لگا۔ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا بہت ہوتا ہے۔

کئی برس بلدۂ عظیم آباد میں دم لیا۔ کچھ بنی کچھ بگڑی۔ آخر وہاں سے بھی پاؤں اُکھڑے۔ روزگار نے موافقت نہ کی۔ عیال و اطفال کو چھوڑ کر تن تنہا کشتی پر سوار ہوا۔ اشرف البلاد کلکتہ میں آب و دانہ کے زور سے آپہنچا۔ چندے بیکاری میں گذری اتفاقاً نواب (دلاور) جنگ نے بلوا کر اپنے چھوٹے بھائی میر محمد کاظم کی اتالیقی کے لئے مقرر کیا۔ قریب دو سال کے وہاں رہا۔ جب وہاں اپنا نباہ نہ دیکھا تب منشی بہادر علی کے وسیلے سے حضور جان گلکرائسٹ صاحب بہادر سے رسائی ہوئی۔ باری تعالیٰ کی مدد سے ایسے جوان مرد کا دامن ہاتھ لگا۔ چاہیے کہ دن کچھ بھلے آویں۔ نہیں تو یہی غنیمت ہے کہ ایک ٹکڑا کھا کر پاؤں پھیلا کر سو رہتا ہوں۔ اور گھر میں دس آدمی بڑے چھوٹے پرورش پا کر دعا اس قدردان کو کرتے ہیں۔ خدا قبول کرے۔

میر امن نے چہار درویش کا قصہ اردو میں ترجمہ کیا۔ اور "باغ و بہار" اس کا نام رکھا۔ یہ کتاب سنہ ۱۸۰۱ء میں شروع ہوئی۔ اور دو سال کی مدت میں پایۂ اختتام کو پہنچی۔ اس کے علاوہ "اخلاق محسنی" کا بھی اردو ترجمہ کیا تھا۔ اور "گنج خوبی" نام رکھا تھا لیکن یہ کمیاب ہے۔

میر امن کی نثر کو وہی رتبہ حاصل ہے جو میر تقی میر کی نظم کو "باغ و بہار" کی تصنیف کو آج ایک سو تیس ۱۳۰ برس سے زیادہ مدت گزری۔ لیکن اب بھی اس کی وہی قدر ہے۔ جو اس زمانے میں تھی۔ روانی اور سلاست اور محاورے کی خوبی اور روزمرہ کی صفائی اس کی خصوصیات ہیں۔ طرز بیان بے تکلف اور رواں ہے۔ ہندی الفاظ نہایت خوبی سے استعمال ہوئے ہیں۔ کہیں کہیں غلط

الفاظ بھی ملتے ہیں لیکن یہ معلوم ہوتا ہے کہ عوام کی زبان پر یہ الفاظ اسی طرح رائج تھے۔ عام طور پر عبارت کا رنگ ایسا ہے جیسے کوئی باتیں کرتا ہے۔ جذبات کو حفظ مراتب کے ساتھ بڑی خوبی سے ادا کیا ہے۔ کردار نویسی کی بھی کہیں کہیں جھلک موجود ہے۔

سید حیدر بخش حیدری دہلی میں پیدا ہوئے اور یہیں نشو و نما پائی۔ سلطنت کی تباہی پر وطن کو خیرباد کہا چند دے ادھر اُدھر سرگردان و پریشان پھرے۔ آخر قسمت نے انھیں کلکتہ پہنچایا۔ وہاں انھوں نے فورٹ ولیم کالج کے شعبۂ تصنیف و تالیف میں ملازمت کرلی۔ آپ نے متعدد کتابیں تصنیف و ترجمہ کیں جن کی فہرست حسب ذیل ہے۔

۱۔ **آرائش محفل** ۔ ترجمہ حاتم طائی فارسی۔ ترجمہ لفظ بہ لفظ نہیں ہے۔ بلکہ جہاں کہیں موقع پایا ہے قصّے کو طول دے دیا ہے۔

۲۔ **طوطا کہانی**۔ اس میں چھوٹے چھوٹے قصّے ہیں یہ کتاب پہلے سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ ہوئی اور فارسی سے حیدری نے اردو میں ترجمہ کی۔

۳۔ **قصہ لیلیٰ مجنوں**۔ امیر خسرو کی مثنوی کا اُردو ترجمہ ہے۔

۴۔ **تاریخ نادری**۔ فارسی "نادر نامہ" کا ترجمہ ہے۔

۵۔ **گلزار دانش**۔ ترجمہ بہار دانش فارسی۔ اس کتاب میں عورتوں کے مکر و فریب کے قصّے درج ہیں۔

۶۔ **گل مغفرت**۔ اولیائے کرام اور شہدائے پاک کے حالات درج ہیں۔ سنہ طباعت ۱۸۱۲ء ہے۔

ان سب کتابوں میں "آرائش محفل" یعنی "حاتم طائی" بہت مقبول

ہوئی۔ قصے کے حسن و قبح کا انحصار پڑھنے والے کی پسند یا عدم پسند پر ہے۔ لیکن اس کی عبارت میر امن دہلوی کی عبارت کی طرح صاف، شستہ اور با محاورہ ہے۔ زبان آج کل کے مذاق کے مطابق ہے۔ البتہ کہیں کہیں قدامت کی جھلک ہے۔ اور ہونی بھی چاہئے کہ آج سے سوا سو برس پہلے کی زبان ہے۔

نہال چند لاہوری اگرچہ دہلی کے رہنے والے تھے مگر ایک عرصے تک لاہور میں رہنے کا اتفاق ہوا۔ اس وجہ سے لاہوری مشہور ہیں۔ افسوس کہ ان کے متعلق اور کچھ دریافت نہیں ہوتا۔ آپ بھی شعبۂ تصنیف و تالیف سے متعلق تھے۔ آپ کی ایک کتاب "مذہب عشق" جس کا دوسرا نام "قصہ گل بکاؤلی" ہے۔ بہت مشہور ہے۔ یہ قصے پہلے فارسی میں تھے۔ آپ نے اردو میں اس کا ترجمہ کیا۔ سنہ تصنیف ۱۸۰۳ء ہے۔

مندرجہ بالا مصنفین کے علاوہ چند مصنفین اور بھی ہیں۔ مثلاً مرزا کاظم علی جوان۔ مظہر علی خاں ولا وغیرہم لیکن نہ تو اُن کے حالات معلوم ہیں کہ درج ہوں، نہ اُن کی تصانیف و تراجم کا سراغ ملتا ہے کہ نمونہ پیش ہو۔

یہاں تک کہ جن مصنفین کا تذکرہ ہوا اُن کا تعلق براہ راست فورٹ ولیم کالج کے شعبۂ تصنیف و تالیف سے تھا۔ اس کالج اور ان مصنفین کی خدمات زبان قابل قدر ہیں۔ ان کی کوششوں سے ملک میں عام طور پر تصنیف و تالیف کا ذوق پیدا ہوگیا اور اہل زبان کو نثر نگاری کا سلیقہ آگیا۔ چنانچہ اسی عہد میں سید انشاء اللہ خاں انشا نے (حالات ملاحظہ ہوں۔

حصّہ نظم) بھی نثر نگاری کی طرف توجہ کی۔ اگرچہ آپ کو فورٹ ولیم کالج سے
کوئی تعلق نہیں تھا۔ لیکن شعبۂ تصنیف و تالیف نے جو ایک عام مذاق پیدا
کر دیا تھا۔ کچھ اس کا اثر۔ کچھ سیّد صاحب کی انوکھی طبیعت۔ غرض آپ
نے دریائے "لطافت" میں لطافت کے دریا بہائے۔ اس کتاب میں اُردو
صرف و نحو، منطق، عروض و قافیہ، معنی و بیان وغیرہ کی بحث ہے پہلا
حصّہ یعنی اُردو صرف و نحو تو سیّد صاحب کی تصنیف ہے۔ دوسرا حصّہ جس میں
بقیہ مضامین ہیں۔ مرزا محمد حسن قتیل کا تالیف کیا ہوا ہے لیکن کتاب کی جان پہلا ہی
حصّہ ہے۔ یہ پہلی کتاب ہے جسے اُردو اہل زبان نے صرف و نحو پر لکھی ہے۔ اس کی
زبان اگرچہ فارسی ہے لیکن اس میں جابجا اُردو عبارت کے نمونے درج ہیں
اور چونکہ اُردو صرف و نحو کے متعلق ہے۔ لہٰذا خاکسار نے اس جگہ اس کا ذکر کر دیا ہے۔

"دریائے لطافت" کے علاوہ ایک داستان بھی سیّد صاحب کی یادگار ہے۔
اس میں عربی اور فارسی کا ایک لفظ بھی نہیں آنے پایا ہے۔ باوجود اس کے
اُردو کے رتبہ سے کلام نہیں گرا ہے۔ یہ داستان کوئی پچاس صفحوں پر مشتمل
ہے اور جابجا ظرافت اور بذلہ سنجی کے پھول کھلے نظر آتے ہیں۔ سنہ تصنیف
۱۸۰۳ء ہے۔

تبصرہ

اُردو نثر نگاری کا دوسرا دور جس قدر مختصر ہے، اسی قدر اس کے کارنامے
وقیع ہیں۔ اگرچہ تمام کتابیں جو اس دور میں تصنیف و تالیف ہوئیں۔ قصے کہانیوں

پر مشتمل ہیں لیکن نثر نگاری کا ذوق پھیلانے میں یہ قصّے کہانیاں بیحد مفید ثابت ہوئیں۔ علاوہ بریں چونکہ یہ کتابیں زیادہ تر انگریزوں کے پڑھانے کے لیے لکھوائی گئی تھیں، اس لئے اس کا انداز بیان نہایت صاف اور سادہ رکھا گیا اور پھر اسی رنگ کو لوگ پسند کرنے لگے ورنہ سَودا اور نفطلی کا رنگ عام ہوکر مدّت تک جاری رہتا۔

باب ۱۴

اُردو نثر کا تیسرا یعنی مقفّیٰ و مسجّع دَور

سنہ ۱۸۳۶ء سے سنہ ۱۹۰۰ء تک

فقیر محمد خاں گویاؔ فقیر محمد خاں نام گویاؔ تخلص، حضرت ناسخؔ کے ارشد تلامذہ میں شمار کئے جاتے تھے۔ زمانہ شاہی میں آپ رسالہ دار اور "حسام الدولہ" کے خطاب سے مخاطب تھے۔

آپ نے حضرت ناسخؔ اور خواجہ وزیرؔ کے مشورہ سے "انوار سہیلی" کا ترجمہ اُردو میں کیا اور اُس کا نام "البستان حکمت" رکھا۔ یہ کتاب ۱۸۳۶ء میں اختتام کو پہنچی۔ اس عہد کی تحریر کے مطابق ترجمہ اچھا ہے۔ لیکن عربی اور فارسی الفاظ بکثرت استعمال کئے ہیں۔ اکثر مقامات پر فارسی اشعار اور عربی ضرب الامثال کو جوں کا توں رہنے دیا ہے جسکی وجہ سے عبارت آسان اور زود فہم نہیں رہی۔ علاوہ بریں بعض الفاظ ثقیل بھی ہیں۔

مرزا رجب علی بیگ سرور

مرزا رجب علی بیگ نام۔ سرور تخلص۔ مرزا اصغر علی لکھنوی کے بیٹے ۱۷۸۶ء میں بمقام لکھنؤ پیدا ہوئے اور لکھنؤ ہی میں تعلیم و تربیت پائی۔ عربی و فارسی میں کافی مہارت تھی۔ خطاطی اور موسیقی میں بھی دخل تھا۔ شاعری میں آغا نوازش حسین نوازش کے شاگرد ہوئے۔ مذاق سخن ستھرا تھا۔ اور صاحب دیوان بھی تھے۔ لیکن شہرت نثر نگاری کی وجہ سے ہوئی۔ واجد علی شاہ نے از راہ قدردانی پچاس روپیہ ماہوار مقرر کرکے درباری شعراء میں شامل کیا۔ لیکن زوال سلطنت کے بعد بنارس چلے گئے۔ جہاں مہاراجہ ایشری پرشاد نرائن سنگھ جی بہت خاطر و مدارات سے پیش آئے۔ آپ نے دہلی، میرٹھ اور راجپوتانہ کی بھی سیاحت کی۔ آخر ۱۸۶۷ء میں بنارس میں انتقال کیا۔

سرور زندہ دل شگفتہ مزاج اور یار باش آدمی تھے۔ مرزا غالب سے دوستانہ تعلقات تھے۔

متعدد تصانیف آپ کی یادگار ہے۔

۱۔ فسانۂ عجائب۔

۲۔ سرور سلطانی (شمشیر خانی کا ترجمہ ہے۔ واجد علی شاہ کی فرمائش سے کیا گیا تھا۔

۳۔ گلزار سرور (حدائق العشاق کا ترجمہ ہے۔ مہاراجہ ایشری پرشاد نرائن سنگھ کی فرمائش سے کیا گیا تھا)

۴۔ شگوفۂ محبت ایک قصہ ہے۔

۵۔ انشاء سرور۔

جملہ تصانیف میں "فسانۂ عجائب" اپنے رنگ کی بہترین تصنیف ہے۔ یہ افسانہ ۱۸۲۴ء میں لکھا گیا۔ سرور کی جملہ تصانیف کی عبارت کا ایک ہی رنگ ہے۔ یعنی مقفّٰی و مسجّع۔ یہ رنگینی اور قافیہ پیمائی فارسی کا رنگ تھا لیکن اُردو میں اس رنگ کے سرور ہی موجد ہیں۔ اس قسم کی نثر کی بنا تصنّع اور بناوٹ پر ہوتی ہے اور اس کی دلآویزی کا مدار مصنوعی حُسن پر ہوتا ہے۔ اس میں تو شک نہیں کہ یہ رنگ پُرلطف اور دلکش ہوتا ہے۔ جو کیف و سرور اشعار سے حاصل ہوتا ہے۔ وہی اس قسم کی عبارت سے ملتا ہے لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس طرز کا میدان بہت تنگ ہوتا ہے۔ اس زبان میں بجز افسانہ گوئی کسی اور علمی اور ادبی بحث کی قدرت نہیں ہوتی اور یہی وجہ ہے کہ سرور کا طرزِ نگارش ایک خاص زمانہ تک ہی مقبول رہا۔ اور اس وقت قطعی متروک ہے۔ یہاں تک کہ قصہ کہانی میں بھی اس طرز کو کوئی اختیار نہیں کرتا۔

مرزا اسداللہ خاں غالب بہ حیثیت تقریظ نگار

حالات زندگی کے لئے ملاحظہ ہو باب غالب نے بعض اُردو خطوط اور خاص کر اردو تقریظوں میں مقفّٰی و مسجّع عبارت لکھنے کا التزام کیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ خاکسار آپ کا شمار اس دور میں بھی کرتا ہے۔ اور آیندہ دور میں بھی آپ کا شمار کرے گا۔ (ملاحظہ ہو باب ۱۵)

آپ کی تقریظوں اور دیباچوں کا وہی رنگ ہے جو مرزا رجب علی بیگ سرور

کی تصانیف کا۔ لیکن غالب کی عبارت میں تصنع اور آورد نسبتاً کم پائی جاتی ہے۔ عام طور پر دوسرے فقرے میں۔ ویسی ہی بے تکلفی ہوتی ہے۔ جیسی کہ پہلے فقرے میں اور اس سے آپ کی خوش سلیقگی کا پتہ چلتا ہے۔

مولانا غلام امام شہید غلام امام نام۔ شہید تخلص۔ شاہ غلام محمد کے بیٹے اور قصبہ امیٹھی ضلع لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔ شہید اچھے شاعر اور مداح نبیؐ اور عاشق رسولؐ کے لقب سے مشہور تھے۔ قتیل اور مصحفی کے شاگرد تھے اور علوم متداولہ کی تحصیل مولوی حیدر علی صاحب کی خدمت میں کی تھی۔ فارسی میں کامل دستگاہ تھی۔ اور فارسی نظم ونثر میں آغا سید اسمٰعیل ماژندرانی کے شاگرد تھے۔ سرکار نظام سے چار سو تیس روپے سال بلاشرط خدمت مقرر تھے۔ جو آخر وقت تک آپ کو ملتے رہے نواب کلب علی خاں والیٔ رامپور بھی آپ کی بہت قدر و منزلت کرتے تھے۔ شہید نے اپنا کلام کبھی جمع نہیں کیا لیکن جو کچھ محفوظ رہا وہ شائع ہو چکا ہے۔ مجموعۂ میلاد شریف اور "انشاء بہار بے خزاں" اور قصائد و غزلیات کا ایک مجموعہ آپ کی یادگار ہے۔

نثر میں آپ کا وہی رنگ ہے جو اس دور کے دیگر انشا پرداز حضرات کا یعنی مقفٰی و مسجع لفظ لفظ میں تصنع اور بات بات میں آورد۔ تاج گنج کے روضے کی تعریف میں جو کچھ لکھا ہے وہ آپ کی طرز نگارش کا بہترین نمونہ ہے۔

منشی غلام غوث بیخبر غلام غوث نام اور بیخبر تخلص تھا۔ آپ کے والد کا نام خواجہ حضور اللہ تھا۔ آپ کے بزرگوں

کا وطن کشمیر تھا۔ خواجہ حضور اللہ ترک وطن کر کے تبت چلے گئے۔ وہاں سے ریاست نیپال میں آئے اور وہیں اقامت گزیں ہوئے۔ چنانچہ بیخبر وہیں ۱۸۲۴ء میں پیدا ہوئے۔

بیخبر ابھی چار پانچ برس ہی کے تھے کہ آپ کے والد نے مجبوراً ترک وطن کیا اور بنارس میں بود و باش اختیار کی۔ آپ نے یہیں تعلیم و تربیت پائی۔ ۱۸۴۳ء میں سلسلہ ملازمت شروع ہوا اور اپنے خالو خان بہادر مولوی سید محمد خاں میر منشی نواب لفٹنٹ گورنر ممالک مغربی و شمالی کے نائب مقرر ہوئے اور ان کے انتقال کے بعد خود میر منشی ہو گئے۔ ۱۸۸۵ء میں پنشن لی اور خان بہادر ذو القدر کے خطاب سے سرفراز ہوئے۔ ۱۹۰۵ء میں رحلت فرمائی۔

بیخبر اور غالب میں دوستانہ تعلقات تھے۔ چنانچہ خطوطِ غالب میں دو خط بیخبر کے نام بھی موجود ہیں۔ آپ کی دو تصنیفیں یادگار ہیں۔ ایک "خونابۂ جگر" اور دوسری "فغانِ بیخبر"۔

بیخبر کا شمار اس عہد کے نامور انشا پردازوں میں تھا۔ آپ کی عبارت میں رنگینی و تصنع تو ضرور ہے لیکن قوافی اور سجع کا الزام نہیں۔ رعایت لفظی اور مبالغہ کا بہت شوق ہے۔ تشبیہہ۔ استعارہ سے بھی نثر کو مزین کرتے ہیں۔ بطور نمونہ ملاحظہ ہو۔

خط مولانا غلام امام شہید کے نام :- قبلہ میری شوخی دیکھئے یوسف کو آئینہ دکھاتا ہوں۔ خورشید کو روشنی کی شکایت سناتا ہوں گلزار میں پھول لیجاتا

ہوں۔ ختن میں مشک تحفہ بھیجتا ہوں۔ دریا کے سامنے دانی کے معانی بیان کر رہا ہوں۔ چاند کے روبرو نور افشانی کا معمہ حل کرتا ہوں۔ لعل کے حضور میں رنگ کی دوکان کھولتا ہوں۔ قند کے مواجہ میں شیرینی تولتا ہوں۔ مسیحا سے کہتا ہوں۔ جاں بخشی کی روایت سنئے۔ موسیٰ سے تمنا کرتا ہوں کہ ید بیضا کی چمک دیکھئے۔ یعنی حضرت کا دیوان مرتب کرکے آپ کے حضور میں پیش کرتا ہوں۔"

امیر مینائی لکھنوی

حالات زندگی کے لئے ملاحظہ ہو باب ۹ -

امیر مینائی نے یوں تو اپنی شاعری سے نظم اردو کی کافی خدمت کی ہے۔ لیکن "انتخاب یادگار" کی تالیف سے نثر کی بزم میں بھی آپ کو شرکت کا استحقاق ہے۔ "انتخاب یادگار" اُن شاعروں کا تذکرہ ہے جو ریاست رامپور کے متوسل رہے۔ یہ تذکرہ ۱۸۷۳ء میں طبع ہوا تھا۔ اس میں چارسو دس شاعروں کا حال قلم بند ہے۔ اور کل ۴۰۰ صفحات ہیں۔ "انتخاب یادگار" کا طرز نگارش 'فسانہ عجائب' کی طرح مقفیٰ و مسجّع ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو۔

" سمند قلم پر شہسوار سخن کی تاکید ہے کہ میدان حمد الٰہی میں قدم اٹھا اور تیغ زبان پر قوت ناطقہ کی تہدید ہے کہ اس معرکہ میں جوہر دکھا۔ مگر یہ منزل ایسی کڑی ہے کہ دونوں کو مشکل پڑی ہے۔ نہ اس کا پاؤں نہ اس کا ہاتھ اٹھ سکتا ہے۔ اس عجز کو دیکھ کر عقل حیران ہے اور عقل کو سکتہ ہے ....."

تبصرہ و کیفیت

دور اوّل میں سادگی تھی۔ اس دور میں تصنّع و آورد ہے۔ دور دوم پر

بول چال کا لطف اور روزمرہ کی صفائی تھی۔ اس دور میں قافیہ بندی
تراش خراش، عبارت کی رنگینی اور فارسی کے تتبع کا زور رہے۔ اس دور
کے مصنفین اعلیٰ قابلیت کے لوگ ہیں اور فارسی وعربی سے بہرہ دانی رکھتے ہیں۔
نظم کی طرح نثر کو بھی سادگی کے بعد تصنع کے دور سے گزرنا پڑا ہے۔ نثر میں بھی
نظم کی طرح دہلی اور لکھنؤ اسکول کا فرق موجود ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ سادگی
کے بعد تصنع پیدا ہوتا ہے۔ اور تصنع کے بعد پھر سادگی کی طرف رجحان ہوتا ہے۔
پہلے دور کی سادگی مفید تھی لیکن اس دور کا تکلف کسی اہم کام کے لئے
موزوں نہیں اور یہی وجہ ہے کہ رنگ عام نہیں ہو سکا۔ خاکسار نے ایک
خاص رنگ کے مصنفین چن کر ایک دور قائم کر دیا ہے۔ ورنہ حقیقت یہ
ہے کہ دور دوم کی سادگی دور سوم میں کیا موجودہ زمانے تک کارفرما ہے۔
یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ دور دوم مفید اور کارآمد تصانیف و تالیف سے
قطعی خالی ہے۔ جون ۱۹۲۰ء کے معارف میں مولانا سید سلیمان صاحب
ندوی کا ایک مضمون شائع ہوا ہے جس میں آپ نے اُن کتابوں کی
فہرست دی ہے۔ جو انڈیا آفس لندن میں آپ کی نظر سے گذری۔ یہ
فہرست ۱۹۰۰ء میں چھپی ہے۔ اس لئے موجودہ بیسویں صدی کی کتابیں
اس میں شامل نہیں۔ اس فہرست سے معلوم ہوتا ہے کہ زبان اردو غدر
کے پہلے ہی سے علمی زبان بن رہی تھی۔ کتابوں کی کثرت کا اس سے اندازہ
ہو سکتا ہے کہ فہرست کتب تین سو صفحات میں ختم ہوئی ہے۔ اس فہرست میں
علوم و فنون، تاریخ و جغرافیہ، ادبیات کتب علمی الہیات وغیرہ کی بے شمار کتب درج ہیں۔

باب ۱۵

اُردو نثر کا چوتھا یعنی ادبی تاریخی اور تنقیدی دور
سنہ ۱۸۵۰ء سے سنہ ۱۹۳۶ء تک

تمہید | اس سے قبل اُردو نثر تین ادوار سے گزر چکی ہے۔ ابتدائی دور محض تمہید کی حیثیت رکھتا ہے۔ تیسرا دور نثری ترقی کی زنجیر کی کوئی اہم کڑی نہیں۔ البتہ دوسرا دور ایسا ہے جس نے چوتھے دور کے لئے میدان صاف و ہموار کرکے سہولتیں مہیا کر دی تھیں۔ واضح ہو کہ تیسرے دور کا درمیانی زمانہ اور چوتھے دور کا ابتدائی زمانہ دوش بدوش چلتا نظر آتا ہے۔ تیسرے دور میں جہاں مقفیٰ اور مسجع عبارتیں لکھی جا رہی ہیں۔ وہاں چوتھے دور میں غالب کے خطوط اور سرسید احمد خاں کے علمی مضامین دنیائے ادب میں گلکاریاں کر رہے ہیں۔ مقصد عرض کرنے کا یہ ہے کہ چوتھے دور کی تدریجی ترقی کا تعلق تیسرے سے نہیں بلکہ دوسرے دور سے ہے۔

چوتھے دور کی ابتدا میں غالب کے خطوط ملتے ہیں۔ اُن کا تعلق نہ دوسرے دور سے ہے اور نہ چوتھے دور سے، اس لئے مناسب ہی معلوم ہوتا ہے کہ ان کا تذکرہ یہاں تمہید میں کر دیا جائے۔

غالب کے خطوط | غالب کے حالات زندگی اور اُن کی تعارف نگاری کے لئے

ملاحظہ ہوں ابواب ۱۰ اور ۱۲ -

مرزا غالب ۱۸۵۰ء تک خط و کتابت ہمیشہ فارسی میں کرتے تھے لیکن سنہ مذکورہ میں آپ ہمہ تن "مہر نیم روز" لکھنے میں مصروف ہو گئے - اُس وقت اُن کو خط و کتابت بضرورت اُردو میں کرنی پڑی - آپ فارسی خطوط نہایت کاوش سے لکھتے تھے - چنانچہ فرماتے ہیں -

"زبان فارسی میں خطوں کا لکھنا پہلے سے متروک ہے - پیرانہ سری اور ضعف کے صدموں سے محنت پژوہی اور جگر کاوی کی قوت مجھ میں نہیں رہی - اور پھر "مہر نیم روز" کی مصروفیت" غرض یہ کہ آپ نے خط و کتابت اُردو میں شروع کر دی -

آپ کے خطوط کے دو مجموعے شائع ہوئے ہیں - ایک "اُردوئے معلّٰی" دوسرا "عود ہندی"

خطوط کی عبارت صاف، سادہ، سلیس، رواں اور بے تکلف ہے - خط و کتابت کا طریقہ بھی نرالا ہے - القاب و آداب کا پرانا اور فرسودہ طریقہ آپ نے قطعی ترک کر دیا - آپ خط کو کبھی "میاں" کبھی "برخوردار" کبھی "بھائی صاحب" کبھی "مہاراج" کبھی کسی اور مناسب لفظ سے آغاز کرتے ہیں - اُس کے بعد مطلب لکھتے ہیں - اکثر بغیر کسی قسم کے الفاظ کے سرے ہی سے مدعا لکھنا شروع کر دیتے ہیں -

ادائے مطلب کا طریقہ بالکل ایسا ہے جیسے دو آدمی بالمشافہ بات چیت یا سوال جواب کرتے ہیں - بعض جگہ مکتوب الیہ کو خطاب کرتے کرتے غائب فرض کر لیتے ہیں - ان سب خصوصیات کے علاوہ آپ کے خطوط میں لطف بیان اس بلا کا ہے کہ ان میں ناول اور ڈرامہ سے زیادہ دلچسپی ہے - مرزا

کی طبیعت میں شوخی نہایت خوشگوار حد تک تھی۔ لہٰذا اُن کے خطوط میں بھی جابجا شوخیانہ انداز پایا جاتا ہے۔ آپ خط لکھتے وقت ہمیشہ اس بات کا خیال رکھتے تھے کہ خط میں کوئی ایسی بات لکھی جائے کہ مکتوب الیہ اُس کو پڑھ کر محظوظ اور خوش ہو۔ پھر جس رتبہ کا مکتوب الیہ ہوتا تھا۔ اس کی سمجھ اور مذاق کے موافق خط میں شوخیاں کرتے تھے۔

حصّہ اوّل

بانیٔ تہذیب الاخلاق اور تہذیب الاخلاق کا اثر

سرسید احمد خاں

حالی نے سرسید کے سوانح حیات پر ایک ضخیم کتاب موسومہ "حیات جاوید" تصنیف کی ہے جو بڑی دلچسپ اور پُر زور معلومات ہے۔ خاکسار یہاں نہایت اختصار کے ساتھ سرسید کے حالات زندگی پیش کرتا ہے۔

سرسید احمد خاں ۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء کو دلّی میں پیدا ہوئے۔ آپ حسینی سید تھے آپ کے آباد اجداد شاہ جہاں کے عہد میں ہرات سے ہندوستان آئے اور اسی وقت سے اکبر شاہ ثانی کے زمانہ تک شاہان مغلیہ کی مختلف خدمات انجام دیتے رہے۔ اکبر شاہ ثانی نے سرسید کے والد میر متقی کو عہدۂ وزارت کے لئے نامزد کیا۔ مگر انھوں نے اپنی قناعت پسندی کی وجہ سے انکار کر دیا۔

سرسید کی ابتدائی تعلیم و تربیت ان کی والدہ کی زیر نگرانی ہوئی۔ ۱۸۲۳ء میں

میر تقی کا انتقال ہو گیا تو سرسید کو ملازمت کا خیال پیدا ہوا۔ کچھ دنوں تک عدالتی کارروائی سے واقفیت حاصل کرنے کے بعد صدر امینی میں سررشتہ داری مل گئی لیکن اپنی ذاتی قابلیت و صلاحیت کی بدولت ترقی کرتے کرتے صدر امین کے عہدے تک پہنچ گئے۔

دوران ملازمت میں علم کا ذوق برابر کام کرتا رہا۔ چنانچہ دہلی کی منصفی کے زمانے میں آپ نے دہلی کی عمارات کے متعلق تحقیقات کی اور اپنی کاوش اور جستجو کے نتیجے کو "آثار الصنادید" نامی کتاب کی شکل میں پیش کیا جو بڑی مفید اور کارآمد کتاب ہے۔ دوران قیام دہلی ہی میں اور بھی چند رسالے آپ نے تصنیف کئے جو زیادہ تر مذہبی بحث پر ہیں۔

۱۸۵۵ء میں آپ مراد آباد تبدیل ہوئے۔ وہاں آپ نے تاریخ سرکشی بجنور شائع کی۔ اس میں مئی ۱۸۵۷ء سے لے کر اپریل ۱۸۵۸ء تک کے حالات و واقعات غدر جو ضلع بجنور میں گزرے۔ تفصیل کے ساتھ بیان کئے ہیں۔

آپ نے ایک انگریزی اسکول مراد آباد میں اور دوسرا غازی پور میں کھولا۔ اور غازی پور میں ایک سائنٹیفک سوسائٹی قائم کی جس کا مقصد مسلمانوں میں مغربی علوم و فنون سے بیداری پیدا کرنا تھا۔ اس کے علاوہ ایک اور انجمن انھوں نے قائم کی جس کا نام برٹش انڈیا ایسوسی ایشن تھا۔

۱۸۶۴ء میں آپ غازی پور سے تبدیل ہو کر علی گڈھ آئے اور سائنٹیفک سوسائٹی کو بھی وہیں منتقل کر دیا۔ ۱۸۶۶ء میں آپ نے سائنٹیفک سوسائٹی سے اخبار نکالا جو آخر کو علی گڈھ انسٹیٹیوٹ گزٹ کے نام سے آخر دم تک جاری رہا

اس اخبار میں سماجی، اخلاقی، علمی اور سیاسی مضامین چھپتے تھے اور یہ مضامین زیادہ تر سرسید ہی کے ہوتے تھے۔

سرسید کو ابتدا ہی سے مسلمانوں کی اصلاح کی دھن تھی اور اُن میں تعلیم پھیلانے کا شوق تھا۔ لہٰذا آپ اصول و طرزِ تعلیم سے واقفیت حاصل کرنے کے لئے انگلستان تشریف لے گئے۔ سال بھر کے بعد واپس آئے۔ انھوں نے سب سے پہلے مسلمانوں کے مذہبی خیالات کی اصلاح کا بیڑا اُٹھایا۔ چنانچہ رسالہ تہذیب الاخلاق جاری کیا۔ ۲۴ دسمبر ۱۸۷۰ء کو اس کا پہلا نمبر شائع ہوا اور پورے چھ برس تک برابر نکلتا رہا۔

جولائی ۱۸۷۶ء میں آپ نے پنشن لی اور ملازمت سے کنارہ کش ہو کر آپ علی گڑھ چلے آئے اور علی گڑھ کالج کے کام میں ہمہ تن مصروف ہو گئے۔ آخر ۱۸۷۷ء میں کالج کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ یہ کالج ترقی کرتا کرتا آج علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نام سے موسوم ہے۔

سرسید کو آخر وقت تک قومی خدمات کی دُھن اور کالج کی بہبودی کا خیال رہا۔ آخر ۱۸۹۸ء میں اس محسنِ قوم نے جہانِ فانی سے کوچ کیا۔ سرسید نے قوم کی بہبودی کے لئے جو جو کام کئے اُن کے تذکرہ کا یہ موقع نہیں، البتہ جو احسانات آپ نے اُردو زبان پر کئے ہیں اُن سے سروکار ہے۔ آپ کی تصانیف کی فہرست کافی لمبی چوڑی ہے جن میں سے دو چار کے نام اوپر گذر چکے ہیں لیکن مہتم بالشان خدمت جو آپ نے اُردو زبان کی کی اس کا ذریعہ "تہذیب الاخلاق" ہے، آپ خود اس کے ایڈیٹر اور منیجر تھے اور زیادہ تر خود ہی مضامین لکھا کرتے تھے۔ دیگر مضمون

نگاروں میں مولوی سید مہدی علی خاں اور مولوی چراغ علی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

سرسید کی عبارت صنائع و بدائع اور تکلفات بادہ سے یکسر پاک ہوتی ہے۔ جس بات کو لکھتے ہیں قلم برداشتہ لیکن اسے دلائل و براہین سے مضبوط کرتے جاتے ہیں مشکل سے مشکل و دقیق سے دقیق بحث پر قلم اُٹھاتے ہیں تو اسے سادگی اور صفائی سے اس طرح بیان کرتے ہیں کہ فوراً ذہن نشین ہو جاتا ہے۔ الفاظ سیدھے سادے مگر زوردار۔ اگر کوئی غلط یا متروک لفظ اُن کے مفہوم کو بہتر طریقہ پر ادا کرتا ہے تو اسے بے تکلف استعمال کرتے ہیں اصول اور قواعد کی پابندی اگر ادائے مطلب میں مانع آتی ہے تو اُس سے سبکدوش ہونے میں سب کی نہیں سمجھتے۔ بعض اصحاب اس خصوصیت کو عیب سمجھتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ بجز اس کے چارہ ہی کیا تھا زبان اظہار مطالب کے لئے ہے اگر اصول و قواعد اس مقصد کے حصول میں مانع ہوں تو اُن کی پابندی کیوں کر کی جا سکتی ہے۔ بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ سرسید کا طرز کہیں کہیں خشک اور بے لطف ہو گیا ہے لیکن اس خشکی اور بے لطفی کی ذمہ دار زیادہ تر نوعیت مطالب ہے۔ ناول یا افسانہ میں اس قسم کی خشکی ناقابل عفو سہی لیکن علمی اور فلسفیانہ مضامین میں یہ خشکی اکثر ناگزیر ہوتی ہے۔ آخر میں یہ بھی عرض کر دینا مناسب سمجھتا ہوں کہ "تہذیب الاخلاق" نے اردو زبان کی خدمات سے بڑھ کر انجام دیں۔ اوّل تو اُس نے اردو میں علمی، ادبی، مذہبی وغیرہ مضامین کا ایک وافر ذخیرہ جمع کر دیا تھا۔ دوسرے اس کے مضمون نگاروں نے بھی اسی رنگ کے مضامین لکھے اور اس طرح ملک میں ایک جماعت علمی، مذہبی، سماجی وغیرہ مضامین لکھنے والوں کی پیدا ہو گئی۔ تیسری اور سب سے زیادہ اہم بات یہ

ہے کہ چونکہ "تہذیب الاخلاق" کے مضامین بھی اپنی نوعیت کے لحاظ سے بالکل
انوکھے ہوتے تھے۔ اس لئے ملک میں ایک بڑی جماعت اس کے خلاف ہوگئی تھی۔
یہ لوگ "تہذیب الاخلاق" کے مضامین کا رد لکھتے تھے اور اپنے جواب کو ہر صورت
سے اصلی مضمون کا جواب بنانے کی کوشش کرتے تھے۔ اس طرح ان جوابی
مضامین میں سرسید کا طرز نگارش بھی اختیار کیا جاتا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سلیس
اور عام فہم اردو نثر کا ملک میں چرچا ہوگیا۔

نواب اعظم یار جنگ مولوی چراغ علی

آپ کے آبا و اجداد کشمیر کے رہنے والے تھے۔ آپ کے
جدِ امجد کشمیر سے پنجاب اور پھر پنجاب سے میرٹھ آکر آباد ہوگئے تھے۔ آپ کے
والد مولوی محمد بخش سہارنپور میں کلکٹری کے دفتر میں ہیڈ کلرک تھے لیکن جب
انگریزوں کا تسلط پنجاب پر ہوگیا تو آپ محکمہ بندوبست میں منتقل ہو کر ترقی
کرتے کرتے مہتمم بندوبست ہو گئے۔ افسوس کہ آپ اپنی اولاد کو خاطر خواہ تعلیم
نہ دلا سکے۔ اور عین عالم جوانی میں ۱۸۵۶ء میں انتقال فرمایا۔ اس وقت مولوی
چراغ علی کی عمر بارہ برس کی تھی۔

مولوی چراغ علی نے اپنی دادی اور والدہ کے زیر سایہ میرٹھ میں تعلیم پائی
لیکن یہ تعلیم بالکل معمولی تھی اور سوائے معمولی اردو، فارسی، انگریزی کے
نہ کسی اور علم کی تحصیل تھی اور نہ کوئی امتحان پاس کرنے پائے تھے کہ ضلع بستی
و کمشنری گورکھپور میں خزانے کی منشی گری پر جسکی تنخواہ ۲۰ روپیہ تھی آپ کا تقرر ہوگیا۔

مطالعۂ کتب اور لکھنے پڑھنے کا شوق ابتدا سے تھا۔ سرکاری کام کے بعد باقی تمام وقت لکھنے پڑھنے میں صرف ہوتا تھا۔ چنانچہ پادری عماد الدین کی کتاب تاریخ محمدی کے جواب میں آپ کا رسالہ "تعلیقات" اسی زمانہ کا لکھا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ "منشور محمدی"، "مخبر صادق" لکھنؤ وغیرہ میں بھی آپ کے اکثر مضامین شائع ہوئے۔

مولوی صاحب اپنی ذاتی قابلیت کی مدد سے منشی گری سے ترقی کرکے ڈپٹی شعری تک پہنچے اور پھر تحصیلدار ہوگئے۔ مذہبی مباحث اور مضمون نویسی کی وجہ سے سرسید احمد خاں سے تعارف ہوگیا تھا۔ چنانچہ اُن کی سعی سے آپ حیدرآباد میں مددگار معتمد مالگذاری کے عہدے پر مقرر ہوئے اور چار سو روپیہ ماہوار آپ کی تنخواہ مقرر ہوئی۔ وہاں بھی آپ نے نہایت خوش اسلوبی سے فرائض کو انجام دیا اور ترقی کرکے معتمد مال کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ آخر ۱۸۹۵ء میں آپ نے انتقال فرمایا۔

مولوی چراغ علی متعدد علوم اور متعدد زبانوں کے عالم تھے۔ سرسید اُن کی وفات کے حال میں لکھتے ہیں۔ متعدد علوم میں اچھی دستگاہ رکھتے تھے۔ عربی زبان اور عربی علوم کے عالم تھے۔ فارسی نہایت عمدہ جانتے تھے اور بولتے تھے۔ عبری و کالڈی میں نہایت اچھی دستگاہ رکھتے تھے۔ لیٹن اور گریک بقدر کارروائی جانتے تھے۔ اعلیٰ درجہ کے مصنف تھے، انگریزی زبان میں بھی اُنھوں نے کتابیں تصنیف کی ہیں۔

آپ اپنے ہمعصروں میں سب سے زیادہ محقق اور وسیع النظر اور ایک زبردست

مصنف تھے۔ اُن کی تمام تصانیف اسلام کی حمایت میں ہیں اُن کی عبارت میں لفاظی اور عبارت آرائی مطلق نہیں ہوتی اور نہ انھیں فصاحت و بلاغت کے قواعد کی پروا ہوتی ہے۔ مضامین کو دلائل سے مضبوط کرتے ہیں اور مطلب سے مطلب رکھتے ہیں جو کچھ کہنا چاہتے ہیں وہی کہتے ہیں۔ ادھر ادھر کی باتوں سے نہ اپنا وقت ضائع کرتے ہیں نہ پڑھنے والے کا۔ "تہذیب الاخلاق" میں اکثر آپ کے مضامین شائع ہوئے ہیں۔

نواب محسن الملک مولوی سید مہدی علی خاں

میر مہدی علی نام خلف الرشید میر ضامن علی ۹ر دسمبر ۱۹۳۷ء کو پیدا ہوئے آپ کا تعلق سادات بارہہ کے ایک خاندان سے تھا جو اٹاوہ میں سکونت پذیر ہوگیا تھا۔

میر مہدی علی نے عربی و فارسی کی ابتدائی تعلیم اٹاوہ ہی میں حاصل کی اور دس روپیہ ماہوار پر کلکٹری میں ملازم ہوگئے۔ رفتہ رفتہ ترقی کرکے اہلمدی اور سررشتہ داری کے مدارج طے کرتے ہوئے ۱۸۶۱ء میں تحصیلدار ہوگئے۔ اور ۱۸۶۳ء میں ڈپٹی کلکٹر کے عہدے پر فائز ہوئے۔

دوران ملازمت میں لکھنے پڑھنے کا شوق دامن گیر تھا۔ چنانچہ آیات بینات نامی ایک مذہبی کتاب لکھ کر شائع کی۔ اُسی زمانہ میں سرسید سے شناسائی ہوئی۔ اور یہ شناسائی آگے چل کر دوستی کے تعلقات میں نمودار ہوئی ۱۸۷۴ء میں ریاست حیدرآباد نے آپ کو طلب کیا۔ اور انسپکٹر جنرل

مالیات کے عہدے پر مقرر کر دیا۔ رفتہ رفتہ ترقی کر کے آپ معتمد مال ہو گئے۔ اور تین ہزار روپیہ ماہوار آپ کی تنخواہ ہو گئی۔ حسن خدمات پر ریاست کی طرف سے محسن الدولہ، محسن الملک، منیر نواز جنگ کے خطابات عطا ہوئے۔ ۱۸۹۳ء میں پنشن لے کر آپ علی گڈھ چلے گئے اور بقیہ عمر قومی خدمت اور کالج کے انتظام میں صرف کی۔ چنانچہ سرسید کے بعد علی گڈھ کالج کے سکریٹری بھی ہو گئے۔ آخر ۱۹۰۷ء میں آپ کا انتقال ہوا۔ آپ کی تصنیفات حسب ذیل ہیں۔

(۱) مضامین تہذیب الاخلاق (۲) مکمل مجموعہ لکچر
(۳) تقلید عمل بالحدیث (۴) مکاتیب
(۵) مسلمانوں کی تہذیب (۶) آیات بینات
(۷) کتاب المحبت والشوق۔

نواب محسن الملک اعلیٰ درجہ کے مقرر اور شیریں زبان تھے برجستہ تقریر کرتے تھے۔ تہذیب الاخلاق میں آپ کے اکثر مضامین شائع ہوئے ہیں۔ آپ کو زبان پر حیرت انگیز قدرت حاصل تھی۔ چنانچہ آپ کی عبارت صاف اور سلجھی ہوئی ہوتی ہے۔ انداز تحریر قابل تعریف ہے منطقی استدلال اور تحقیق و تدقیق کا مادہ پایا جاتا ہے۔ اگرچہ آپ سرسید کے مقلد ہیں لیکن پھر بھی آپ کی عبارت میں جدت پسندی پائی جاتی ہے۔ صفائی اور سلاست پر کہیں کہیں صنائع و بدائع کی رنگینی عبارت نے دل کشی و شگفتگی پیدا کر دیتی ہے۔ عام طور پر انداز بیان میں زور اور عبارت میں توازن پایا جاتا ہے۔

حصۂ دوم

شموس ستہ

۱۔ شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد

حالات زندگی کے لئے ملاحظہ ہو باب ۱۰۔
مولانا آزاد کی انشاپردازی مسلّم الثبوت ہے
آپ نے اپنی بیش بہا تصانیف اور بے مثل
طرز نگارش سے جو احسانات زبان اُردو پر کئے ہیں اُن کا کما حقہٗ اظہار بہت
دشوار ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ کا مرتبہ محسنین زبان اُردو میں بہت بلند ہے۔

آپ کے تبحر علمی اور طبیعت کی ہمہ گیری نے مختلف موضوع پر قلم اُٹھایا۔
تاریخ ادب سے اُردو کو روشناس کیا۔ تنقید کی بھی ابتداء کی علم اللسان کے
متعلق تحقیقات کی تاریخ لکھی۔ انگریزی تمثیلی افسانوں سے اُردو کو مالا مال
کیا بغرض یہ کہ اُردو کو وسعت دینے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔

اُردو قاعدے۔ قواعد اُردو۔ قصص ہند وغیرہ کے علاوہ مولانا کی
مندرجہ ذیل تصنیفات پر اُردو زبان و ادب کو فخر ہے۔

۱۔ **آب حیات**۔ (اُردو شعر و سخن کی تاریخ ہے) شعراء کے کلام پر تنقید
بھی کی گئی ہے۔

۲۔ **نیرنگ خیال**۔ (انگریزی تمثیلی افسانوں کی جنھیں "ایلیگری"

(Allegary) کہتے ہیں، تقلید میں لکھی گئی ہے۔ اس میں متعدد مضامین ہیں)

۳۔ دربار اکبری (شہنشاہ اکبر کے عہد کی تاریخ ہے۔)

۴۔ سخندانِ فارس، علم السنہ یعنی فیلالوجی پر ہے)

۵۔ دیوانِ ذوق ۔ حضرت ذوق کے منتشر کلام کو یکجا کر کے جستہ جستہ حالات کے ساتھ مرتب کیا ہے)۔

مولانا آزاد کا طرز تحریر دورِ سوم اور دورِ چہارم کے مصنفین کے طرزِ تحریر کے درمیان ایک اعتدال کی مثال ہے۔ نہ تو وہ اس قدر رنگین ہے کہ تصنّع اور آورد کا عیب آنے پائے اور نہ اس قدر عاری کہ خشکی اور بے لطفی کی شکایت ہونے پائے۔ مولانا کے طرز تحریر کی بنیاد شیریں زبان، صحت محاورہ اور دلکشی تشبیہہ و استعارہ پر ہے عبارت میں سادگی اور بے تکلفی سے ایک حسن پیدا ہو جاتا ہے۔ مولانا کے قلم میں وہ جادو ہے کہ جس چیز کو بیان کرتے ہیں اس کی تصویر آنکھوں میں پھرنے لگتی ہے۔ جذبات نگاری پر وہ قدرت ہے کہ جب چاہیں پڑھنے والوں کو ہنسا دیں۔ جب چاہیں رُلا دیں۔ بیان میں وہ زور ہے کہ جو بات پڑھنے والوں کے دلوں میں پیدا کرنا چاہتے ہیں پیدا کر دیتے ہیں۔ آپ کی نثر میں نظم کا لطف ہے اور آپ کے جملوں میں شعر کا سا اثر ہے۔

"آب حیات" اور "دربار اکبری" انشا پردازی کے لحاظ سے آپ کی بہترین تصانیف ہیں۔ جن میں ناول سے زیادہ لطف اور ڈرامے سے زیادہ دلچسپی ہے لیکن بعض لوگوں کا خیال ہے کہ دونوں کتابوں میں تحقیق سے کام نہیں لیا گیا ہے بلکہ ہوائی اور اُن ہوائی باتوں کو محض طرز ادا کے جادو سے چمکا دیا ہے۔

اس اعتراض میں ایک حد تک صداقت بھی ہے۔ لیکن ان دونوں کتابوں کے مفید اور کارآمد ہونے میں کوئی شک نہیں۔ یقین ہے کہ یہی دونوں کارنامے مولانا کی حیات جاوداں کے سبب بنیں گے۔

مولانا محمد حسین آزاد کا طرز جس قدر دلچسپ ہے اُسی قدر ناقابل تقلید بھی ہے۔ اکثر اُن کے طرز کی تقلید کی گئی۔ لیکن بجز ناکامی کچھ حاصل نہیں ہوا۔ لیکن اس طرز میں ایک خامی بھی ہے اور وہ یہ کہ یہ طرز محض قصہ کہانیوں، اور افسانوں ہی کے لئے موزوں ہو سکتا ہے۔ علمی، فلسفی و تاریخی وغیرہ مطالب کے لئے یہ طرز اختیار نہیں کیا جا سکتا۔ اس میں اتنی گنجائش نہیں ہے کہ اس قسم کے مطالب اس میں ادا کئے جاسکیں۔

۲۔ شمس العلما رخان بہادر مولوی ذکاء اللہ خاں

مولوی ذکاء اللہ خاں ۱۸۳۲ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد حافظ ثناء اللہ نہایت دیندار اور پابند صوم و صلوٰۃ بزرگ تھے۔ مولوی ذکاء اللہ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد بارہ برس کی عمر میں دہلی کالج میں داخل ہوئے۔ تعلیم سے فارغ ہوکر آپ اُسی کالج میں معلم ریاضی مقرر ہوئے۔ اس کے بعد آپ آگرہ کالج میں معلم اُردو ہوئے۔ اس کے بعد آپ ۱۸۵۵ء میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس مقرر ہوکر اضلاع بلند شہر و مراد آباد میں رہے۔ اور گیارہ سال اس عہدہ پر عمدگی سے کام کرتے رہے۔

۱۸۶۹ء میں آپ میور کالج الہ آباد کے پروفیسر مقرر ہوئے یہاں

مولانا ذکاء اللہ

پندرہ سال تک ایم۔ اے تک کی کلاسوں کو عربی و فارسی پڑھاتے رہے۔ آخر ۳۶ سال کی سرکاری ملازمت کے بعد آپ نے پنشن لی اور ۲۴ سال تک آپ بفراغت تمام تصنیف و تالیف میں منہمک رہے۔ آخر سنہ ۱۹۱۰ء میں راہی ملک بقار ہوئے۔

مولوی ذکاء اللہ نے اردو زبان کی جو خدمات کی ہیں وہ ہمیشہ قابل تحسین وتشکر رہیں گی۔ ریاضیات، تاریخ وجغرافیہ، علم ادب، علم اخلاق، طبیعات وہیئت اور سیاست مدن وغیرہ علوم پر آپ کی تصانیف کی تعداد ۱۴۳ تک پہنچتی ہے۔ ان مستقل تصانیف کے علاوہ وقتاً فوقتاً مختلف موضوعوں پر مضامین لکھتے رہتے تھے جو ملکی رسائل واخبارات میں شائع ہوتے رہتے تھے۔ اگر ان تمام مضامین کو یکجا کیا جائے تو یہ مجموعہ کئی ضخیم جلدوں کے برابر نکلے گا۔ ان مضامین میں تاریخ، فلسفہ، سائنس، کیمیا، طرز معاشرت، علم المعیشت، سیاست غرض مشکل سے کوئی مضمون بچا ہوگا۔ جس پر آپ نے طبع آزمائی نہ فرمائی ہو۔ کثرت تصانیف کے لحاظ سے اردو کا کوئی مصنف آپ کے مقابلہ میں پیش نہیں کیا جا سکتا۔

آپ کا طرز نگارش، سلیس، رواں اور بے تکلف ہے۔ بڑے سے بڑے حال کو نہایت مختصر عبارت میں لکھ دیتے ہیں اور مشکل سے مشکل بات کو چند الفاظ میں سلجھا دیتے ہیں۔ آپ کی تصانیف ملک میں بہت مقبول ہوئیں۔ گورنمنٹ نے بھی حسن خدمات کے صلے میں خان بہادر شمس العلماء کے خطابات عطا فرمائے

آپ کا طرز تحریر کسی قدر روکھا پھیکا ہے یعنی اس میں شگفتگی اور دلکشی نہیں لیکن بات یہ ہے کہ جن موضوعوں پر آپ نے طبع آزمائی کی ہے۔ اُن میں شگفتگی اور دلکشی کا زیادہ امکان بھی نہیں۔

۳۔ شمس العلماء ڈاکٹر مولوی سید علی بلگرامی

مولوی سید علی قصبۂ بلگرام کے ایک شریف خاندان سے تھے۔ آپ کے والد زین الدین خاں بنگال اور بہار کے مختلف اضلاع میں ڈپٹی کلکٹری کے عہدہ پر مامور رہے۔ ۱۸۷۵ء میں پنشن لینے کے بعد حیدر آباد میں ایک معزز عہدہ پر ممتاز ہو گئے تھے۔ مولوی سید علی اپنے باپ کے سب سے چھوٹے بیٹے تھے۔ آپ ۱۸۵۱ء میں پیدا ہوئے۔ چودہ پندرہ سال کی عمر تک عربی و فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ ۱۸۶۶ء میں انگریزی مدرسہ میں داخل ہوئے اور ۱۸۷۴ء میں بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ بی۔ اے میں اُن کی اختیاری زبان سنسکرت تھی۔ آپ کا حافظہ بہت قوی تھا۔ کالج کے پروفیسر آپ کی ذہانت، قابلیت اور حافظے کے قائل تھے۔

مولوی صاحب کی قابلیت اور روز افزوں ترقی کو دیکھ کر سر سالار جنگ بہادر نے آپ کو حیدر آباد طلب فرمایا اور اپنے خاص عملے میں داخل کیا۔ حیدر آباد پہنچ کر آپ نے علم طبقات الارض، کیمیا، طبیعیات، نقشہ کشی، معدنیات، علم الحیٰوۃ وغیرہ علوم میں دستگاہ حاصل کی۔ تکمیل علوم کے لئے آپ ولایت بھی تشریف لے گئے۔ چنانچہ فرانس، اسپین اور جرمنی کا سفر کیا۔

مولوی صاحب مختلف زبانیں، لاطینی، انگریزی، جرمنی، فرانسیسی، عربی

فارسی، اردو، سنسکرت، بنگالی، ہندی، مرہٹی، تلنگی اور گجراتی خوب جانتے تھے۔
۱۸۹۷ء میں گورنمنٹ نے انھیں شمس العلماء کا خطاب عطا فرمایا۔ سنہ ۱۹۰۰ء میں آپ انگلستان جا کر مقیم ہوئے اور سنہ ۱۹۰۲ء میں کیمبرج یونیورسٹی میں مرہٹی زبان کے لکچرر مقرر ہوئے۔

آخر عمر میں ہر دوئی میں قیام کر لیا تھا۔ اور قوم کی خدمت میں وقت صرف کرنے لگے تھے آخر ۱۹۱۱ء میں اس دنیا سے کنارہ کش ہوئے۔

مولوی صاحب کے کارنامے زیادہ تر ترجمے ہیں۔ جن میں "تمدن ہند" اور "تمدن عرب" نے آپ کے نام نامی کو خوب روشن کیا۔ یہ دونوں کتابیں موسیو لیبان کی تصنیف کردہ اور فرانسیسی زبان میں ہیں۔ آپ نے ان کا اردو میں ترجمہ کیا۔ اور اس قابلیت سے کیا کہ خاص آپ ہی کی تصانیف معلوم ہوتی ہیں۔ آپ نے اردو ترجمے میں شاذ و نادر ہی کہیں انگریزی یا دیگر یورپی زبانوں کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اصطلاحات کا ترجمہ نہایت خوبی سے کیا گیا ہے۔ زبان پر آپ کو قدرت کامل حاصل ہے۔ روزمرہ و محاورہ کا جائزہ صرف خوبی سے ہوتا ہے۔ عبارت میں سلاست اور روانی بدرجۂ احسن موجود ہے۔

۴۔ **شمس العلماء مولوی نذیر احمد** | حالات زندگی اور ادبی خدمات کے لئے آئندہ باب ملاحظہ ہو۔

نوٹ:- اگرچہ مولوی نذیر احمد صاحب کا تذکرہ یہیں ہونا چاہیے تھا۔ لیکن خاکسار نے اپنے ذہن میں جو تاریخ ادب کا خاکہ بنا رکھا ہے اس کی رو سے

آپ کا شمار ناول نگار حضرات کی انجمن میں بحیثیت صدر کے ہوگا۔ ناچیز نے آپ کے نام نامی کو اس دور کے شموس میں شمار تو کر ہی لیا ہے۔ اب تذکرہ خواہ کہیں ہو۔ انتقال مقام سے خدانخواستہ رتبہ میں کچھ کمی واقع نہ ہوگی۔

۵۔ شمس العلماء مولانا الطاف حسین حالی

حالاتِ زندگی اور آپ کی شاعری کے متعلق ملاحظہ ہو باب ۱۰۔

مندرجہ ذیل تصنیفات نثر آپ کی زندہ جاوید ہیں۔

۱۔ حیات سعدی (شیخ سعدی کی سوانح عمری اور اُن کی نظم و نثر پر تبصرہ ہے)

۲۔ مقدمہ شعر و شاعری (شاعری پر ایک مبسوط مضمون ہے جو دیوان حالی کے مقدمے کے طور پر شائع ہوا۔)

۳۔ یادگار غالب۔ (اسد اللہ خاں غالب کی سوانح عمری اور اُن کی فارسی اور اُردو نظم و نثر پر تنقید ہے)۔

۴۔ حیاتِ جاوید۔ (سر سید احمد خاں کی سوانح عمری ہے)

ان کے علاوہ متفرق مضامین ہیں جو تہذیب الاخلاق وغیرہ رسائل میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے۔ مولوی سید وحید الدین صاحب سلیم نے اُن مضامین کو یکجا کر کے ۱۹۰۴ء میں کتاب کی شکل میں شائع کیا تھا۔

"مکتوبات حالی" دو جلدوں میں اُن کے صاحبزادہ خواجہ سجاد حسین صاحب نے ۱۹۲۹ء میں ترتیب دے کر چھپوائے۔

مولانا حالی نے اُردو کو سوانح عمری سے روشناس کیا۔ آپ کی تصانیف حیاتِ سعدی و حیاتِ جاوید وغیرہ سے قبل اُردو میں کوئی سوانح عمری موجود نہیں تھی۔ علاوہ ازیں "مقدمہ شعر و شاعری" اور یادگارِ غالب کے بعض مقامات سے اُردو میں حقیقی اور بے لوث تنقید کا اضافہ کیا۔

مولانا کی سوانح نگاری پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ آپ نے تصویر کا ایک رُخ دکھایا ہے۔ معائبت یا تو چشم پوشی کی گئی ہے یا توجیہ کر دی گئی ہے۔ اگرچہ یہ اعتراض ایک حد تک صحیح ہے لیکن اوّل تو جو محبت اور عقیدت مندی مولانا کو سرسید اور غالب سے تھی۔ اُس کا تقاضا یہی تھا کہ ان کے عیب و ہنر نظر آئیں۔ یا عیب۔ سرے سے نظر ہی نہ آئیں۔ دوسرے سوانح عمری کا کوئی نمونہ زبان اُردو میں موجود نہیں تھا۔ جو مولانا کے لئے چراغِ ہدایت بنتا۔ مولانا کی انشاء پردازی مسلم ہے۔ آپ کی نثر میں سادگی سلاست اور صفائی بدرجۂ احسن موجود ہے۔ تصنّع اور آورد کا کہیں نام نہیں۔ بلکہ ہر مقام پر برجستگی اور بے تکلفی پائی جاتی ہے۔ جس مضمون کو ادا کرتے ہیں۔ نہایت سادہ عبارت میں تحریر کرتے ہیں۔ خیالات کا تسلسل اور زبان کی پختگی خود بخود دل پر اثر کرتی ہے۔ زبان ٹکسالی ہے اور محاورات کا صحیح استعمال کرتے ہیں۔ یہ سب باتیں ہیں لیکن عبارت میں شگفتگی نہیں۔ انگریزی الفاظ بھی استعمال کرتے ہیں لیکن بعض اوقات ایسے الفاظ بھی استعمال کئے ہیں۔ جن کا مترادف اُردو پیش کر سکتی ہے۔

۶۔ شمس العلماء مولوی شبلی نعمانی | مولانا شبلی ۱۸۵۷ء میں بمقام بندول ضلع اعظم گڈھ پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم

مولوی شکر اللہ صاحب سے حاصل کی اور پھر مولوی محمد فاروق صاحب
چریا کوٹی سے عربی کی تحصیل کی اور معقولات و منقولات کی تعلیم کے لئے رامپور،
سہارنپور، لکھنؤ، لاہور وغیرہ مقامات کی سیاحت کرتے رہے۔ ۱۹ سال کی عمر میں یعنی
۱۸۷۶ء میں حجاز کا سفر کیا۔ اور فریضۂ حج ادا کیا۔ اور مدینہ منورہ کے کتب خانہ سے فیض اٹھایا۔
مولانا فطری شاعر تھے اس فن میں کسی کی شاگردی نہیں کی، فارسی اور اردو
دونوں زبان میں شعر کہتے تھے اور خوب کہتے تھے۔ قیام اعظم گڑھ کے زمانے میں وہاں جو
مشاعرے ہوتے تھے تو آپ میر مشاعرہ بنائے جاتے تھے۔

گھر والوں نے زمینداری کا جوا آپ کے کندھوں پر رکھ دیا، لیکن مولانا اس
بے کیف شغل سے عہدہ برآ نہ ہو سکے۔ آخر یہ رائے ہوئی کہ آپ وکالت کریں۔ چنانچہ
آپ نے وکالت کا امتحان پاس کیا اور چند ماہ اعظم گڑھ میں ذاتی کام کیا لیکن یہ پیشہ بھی
آپ کی افتادِ طبع کے خلاف تھا چنانچہ وکالت ترک کر کے آپ امین و خواتی بنے۔ لیکن
یہاں بھی جی نہ لگا۔ آخر مستعفی ہو کر مطالعہ و تدریس میں مشغول ہو گئے۔
مولانا کے ایک نوجوان بھائی مہدی علی گڑھ کالج میں تعلیم پاتے تھے ۱۸۸۲ء
میں آپ اُن سے ملنے گئے۔ وہاں سرسید سے ملاقات ہوئی۔ سرسید نے اس جوہرِ قابل
کو پرکھا اور اسی کالج میں فارسی و عربی کا پروفیسر مقرر کر دیا۔ اسی زمانے میں آپ نے
سرسید کے کتب خانے سے بہت فائدہ اٹھایا۔ اور اسی زمانے میں آپ نے تصنیف و
تالیف کی طرف توجہ فرمائی۔ اور سب سے پہلے "المامون" تصنیف کی اس کے بعد
سیرۃ النعمان لکھی اور پھر مصر و شام و روم کا سفر کیا۔ اس سفر میں آپ نے "الفاروق"
کے لئے کافی مصالحہ جمع کیا۔ سرسید کے انتقال کے بعد سنہ ۱۸۹۸ء میں سولہ سال کی خدمت

شبلی نعمانی

کے بعد کالج کی پروفیسری کا سے استعفا دے دیا اور اعظم گڈھ میں مستقل قیام کر کے تالیف و تصنیف میں مصروف ہو گئے۔

ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہ گذرا تھا کہ مولوی سید علی بلگرامی نے آپ کو حیدرآباد بلایا وہاں آپ کو نظامت علوم و فنون کا عہدہ مل گیا۔ حیدرآباد ہی کے قیام میں آپ نے "الغزالی" "سوانح رومی" "علم الکلام" "الکلام" اور "موازنہ انیس و دبیر" بالترتیب تصنیف فرما کر شائع کیں۔

ندوۃ العلماء ۱۸۹۴ء میں قائم ہوا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کی بہبودی اور فلاح کی تدابیر کی جائیں لیکن چونکہ مسلمانوں کی اصلاح علماء کی اصلاح پر مبنی ہے۔ لہٰذا علماء کی اصلاح اور صحیح طریقہ پر تعلیم دینے کے لئے یہ دارالعلوم قائم کیا گیا۔ مولوی محمد علی کانپوری اس کے روح رواں تھے اُن کے استعفا دینے پر اُس کی حالت خراب ہونے لگی۔ مولانا شبلی خود لکھنؤ پہنچے۔ اور ۱۹۰۴ء میں اس دارالعلوم کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ۱۹۱۳ء تک نہایت خیر و خوبی کے ساتھ اُسے چلاتے رہے۔ آخر حاسدین کی رخنہ اندازیوں سے بددل ہو کر اُس کی خدمات سے سبکدوش ہو گئے۔

لکھنؤ سے واپس آ کر آپ نے اعظم گڈھ میں دارالمصنفین قائم کیا جس کا مقصد یہ تھا کہ قوم میں اچھے مصنفین کی ایک جماعت پیدا ہو جائے۔

یہ دارالمصنفین نہایت آب و تاب کے ساتھ مذہب و علم کی خدمت کر رہا ہے۔

مولانا کی جو شہرت ہندوستان اور ممالک غیر میں ہوئی۔ اُس کا اندازہ

اس سے ہوتا ہے کہ ۱۸۹۲ء میں سلطان ترکی نے تمغۂ مجیدی آپ کو عنایت کیا۔ ۱۸۹۴ء میں شمس العلماء کا خطاب گورنمنٹ نے دیا۔ الہ آباد یونیورسٹی کے فیلو مقرر ہوئے "رائل ایشیاٹک سوسائٹی" کے ممبر بھی اُسی زمانے میں ہوئے۔ نظام دکن نے سو روپیہ ماہوار مقرر کئے پھر ۱۹۱۲ء میں تین سو روپیہ ماہوار کر دئے۔ انگلستان کے مشہور مشرق شناس پروفیسر براؤن نے اپنی تاریخ "ادبیات فارسی" کی چوتھی جلد میں مولانا کی شعر العجم سے مستفید و مستفیض ہونا فخر کے ساتھ بیان کیا۔

سب سے آخری اور اہم تصنیف سیرت نبوی زیر تالیف تھی۔ کچھ اجزاء تیار ہو چکے تھے۔ کچھ باقی تھے کہ پندرہ روز کی علالت کے بعد ۱۸ نومبر ۱۹۱۴ء کو وفات پائی۔ ملک اور قوم اس محسنِ علم و ادب سے ساری عمر کے لئے محروم ہو گئی۔

تصانیف کی تعداد کے لحاظ سے مولانا شبلی مولانا ذکاء اللہ کو چھوڑ کر بقیہ اپنے ہمعصر شموس سے بہت بڑھے ہوئے ہیں۔ یوں تو آپ کی تصنیفات بہت ہیں۔ لیکن زیادہ مشہور یہ ہیں۔

"المامون۔ سیرت النعمان۔ الفاروق۔ سفرنامہ، الغزالی علم الکلام۔ سوانح مولانا روم۔ موازنۂ انیس و دبیر۔ شعر العجم۔ سیرۃ النبی۔ الکلام۔

مولانا کی جملہ تصانیف پانچ مستقل شاخوں پر تقسیم ہو سکتی ہیں۔

(۱) علم الکلام، (علم الکلام الکلام)۔

(۲) تاریخ (المامون، الفاروق وغیرہ)۔
(۳) تنقید۔ (موازنہ انیس و دبیر، شعرالعجم)۔
(۴) شعر و شاعری، (مجموعہ کلام اردو، دیوان شبلی، فارسی وغیرہ)۔
(۵) متفرق مضامین۔

آپ کی جملہ تصنیفات میں عالمانہ استدلال و انداز پایا جاتا ہے۔ آپ کی تاریخی اور تنقیدی کتابوں کی بڑی خصوصیت و تحقیق و تدقیق و استحکام رائے اور جامع بیان ہے۔ طرز ادا میں جدت کے ساتھ دلآویزی اور عام فہمی کا خیال ہر جگہ ملحوظ رکھا گیا ہے۔ فن تنقید کو آپ نے اردو میں رائج کیا۔ آپ کی زبان مستند ہے۔ طرز تحریر میں صفائی اور سادگی کے علاوہ ایک قسم کا زور ہے۔ تشبیہ و استعارہ کی چاشنی بھی کہیں کہیں لطف پیدا کر دیتی ہے۔ پیچیدہ سے پیچیدہ مضامین کو سیدھی سادی عبارت میں سلجھا کر رکھ دیتے ہیں۔ آپ کا اسلوب بیان علمی اور تحقیقی ہے۔ لیکن یہی اسلوب بیان ناول اور افسانہ وغیرہ میں بھی اختیار کیا جا سکتا ہے۔

آخر میں یہ بھی عرض کر دینا مناسب ہے کہ فی زمانہ علم انسانی میں اضافہ ہو جانے کی وجہ سے آپ کی تاریخی تحقیقات میں کسی مقام پر خامیاں دریافت ہوئی ہیں۔ لیکن ان چند خامیوں سے مولانا شبلی کی عظمت میں کچھ فرق نہیں آتا۔

تبصرہ

اردو نثر کا چوتھا دور حقیقت یہ ہے کہ زرین دور ہے۔ اگر تاریخ ادب اردو سے اس دور کو خارج کر دیا جائے تو غریب اردو قطعی تہیدست و نردمایہ

رہ جائے۔ اس دور کے مصنفین کا جواب تاریخ ادب پیش کرنے سے قاصر ہے اور اُمید نہیں کہ آیندہ اس پایہ کے انشاپرداز پیدا ہو سکیں گے۔ ممالک کے غیر ذی علم اصحاب کی اگر نظر پڑتی ہے تو اسی دور کے مصنفین پر پڑتی ہے اور اگر وہ اُردو کی کسی تصنیف سے استفادہ کرتے ہیں تو وہ اسی دور کی تصنیف ہوتی ہے۔

زبان اس دور کی زبان کے متعلق کچھ لکھنا تحصیل حاصل ہے۔ مختصر یہ کہ نہایت مستند اور مکمل زبان ہے۔

اسلوب بیان اسلوب بیان کے لحاظ سے یہ دور خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس دور کے خاص خاص اسلوب چار ہیں۔

(۱) صاف، سادہ، بے تکلف اور مدلل (سرسید وغیرہ)

(۲) صاف مگر تشبیہ و استعارہ کی گلکاری سے رنگین و حسین (آزاد)

(۳) صاف، بے تکلف، زوردار اور علمی (حالی، شبلی وغیرہ)۔

(۴) عام بول چال، محاوروں کی کثرت، سادہ، بے تکلف، مگر عربی الفاظ کی کثرت (نذیر احمد)

موضوع گذشتہ تمام ادوار کے خاص خاص موضوع مذہب اور افسانہ ہیں۔ لیکن اس دور میں اُردو عالم شباب کو پہنچی اور اس کے موضوعوں میں ایسا تنوع پیدا ہوا کہ اُس کا شمار علمی زبانوں میں ہونے لگا۔ موضوع یوں تو بے شمار ہیں لیکن خاص خاص یہ ہیں۔

مذہب، اصلاح، مذہب، تعلیم، تاریخ، سوانح حیات، تحقیق زبان، اصول تنقید ادبی تنقید (ناول وغیرہ) اور ان میں سے ہر موضوع پر نہایت گراں قدر کتابیں لکھی گئیں۔

باب ۱۶

مابعد دورِ چہارم

حصّہ اوّل

ناول نگاران اُردو

تمہید

ناول ''ناول'' انگریزی زبان کا لفظ ہے جس کے لفظی معنی تو ہیں عجیب اور انوکھی چیز کے لیکن اصطلاح میں افسانوں کی ایک خاص صنف کو کہتے ہیں۔ دورِ سوم کے اختتام تک اُردو میں ناول کا پتہ نہیں۔ یہ دراصل انگریزی چیز ہے اور انگریزوں ہی کے ساتھ ہندوستان میں آئی۔ چوتھے دور میں جہاں انگریزی علوم و فنون کا اثر قبول کیا گیا۔ وہاں ''ناول'' کو بھی لیا گیا۔ اگرچہ مکمل ناول دورِ چہارم کے بعد ہی لکھے گئے۔

افسانہ افسانہ اُردو میں نہایت قدیم چیز ہے ابتدائی افسانے یا تو فارسی سے ترجمہ کئے گئے۔ یا فارسی افسانوں کی تقلید میں لکھے گئے۔ بڑے بڑے افسانوں میں ذیل کے افسانے خاص طور پر شہرت رکھتے ہیں۔

۱۔ الف لیلہ۔ ۲۔ داستان امیر حمزہ۔ ۳۔ بوستان خیال۔ ۴۔ طلسم ہوش رُبا۔

۵۔ قصہ حاتم طائی۔ ۶۔ باغ و بہار۔

یہ سب افسانے فارسی سے ترجمہ کئے گئے۔ ان کے علاوہ "دہ بے تال پچیسی سنگھاسن بتیسی گل بکاؤلی، طوطا کہانی، کلیلہ و دمنہ خاص ہندوستانی پیداوار ہیں۔ اگرچہ ان میں اکثر فارسی ہی سے ترجمے کئے گئے ہیں۔ فسانہ عجائب خاص اُردو کی پیداوار ہے۔

ناول اور افسانہ کا فرق

افسانہ کی بنیاد تمام تر فوق الفطرت عناصر پر ہوتی ہے۔ اُن میں خدماتِ انسانی اور واقعاتِ زندگی سے کچھ سروکار نہیں ہوتا۔ کوئی خاص پلاٹ نہیں ہوتا اور نہ کردار نویسی ہوتی ہے۔ واقعات وحادثات خود بخود بلا اسباب کے رونما ہو جاتے ہیں اور اگر وہ ہیرو کے خلاف پڑیں تو فوق العادت اسباب ہی سے اُن کا تدارک بھی ہو جاتا ہے۔ افسانہ کا انجام ہمیشہ ہیرو کی کامیابی پر ہوتا ہے اور پڑھنے والے کو اس کامیابی پر اس قدر یقین ہوتا ہے کہ اگر کسی مقام پہ ہیرو بھی مر جائے تو پڑھنے والے کے اطمینان میں فرق نہیں آنے پاتا۔ جانتا ہے کہ کہیں نہ کہیں جیتا جاگتا نظر آجائے گا۔

اس کے خلاف ناول کی بنیاد "عادت اور فطرت پر ہوتی ہے" ذاتِ انسانی اس کا خاص موضوع ہوتا ہے۔ ناول نگار انسان کا مطالعہ گہری نظروں سے کرتا ہے۔ ناول کا تعلق انسان کے افعال، خیالات اغلاط اور خام کاریوں سے ہے۔ روزانہ زندگی کے واقعات، انسان کی فطرت، اُس کی تلوّن مزاجی، خوف، احساسات جوش، جذبات، غرض یہ سب ناول کے موضوع ہیں۔

اردو کا پہلا ناول نگار

شمس العلما مولوی نذیر احمد دہلوی

مولوی نذیر احمد ضلع بجنور میں ۶ دسمبر ۱۸۳۶ء کو پیدا ہوئے۔ مولوی صاحب کے والد مولوی سعادت علی صاحب بجنور میں رہتے تھے۔ چنانچہ مولوی نذیر احمد بھی چار سال کی عمر میں وہیں پہنچے۔

ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی پھر مولوی نصر اللہ خاں سے تعلیم پائی اس کے بعد فارغ التحصیل ہونے کے لئے دہلی آئے اور مولوی عبد الخالق اورنگ آبادی کے شاگرد ہو گئے لیکن مکتبی تعلیم سے مولوی نذیر احمد دل برداشتہ تھے۔ چنانچہ ۱۸۴۵ء میں آپ دہلی کالج میں داخل ہو گئے اور کالج میں اُن کا وظیفہ بھی مقرر ہو گیا۔ مولوی صاحب کی عمر چودہ سال کی تھی کہ اُن کے والد کا انتقال ہو گیا۔ چار برس بعد یعنی ۱۸۵۴ء میں کنجاہ ضلع گجرات میں چالیس روپیہ ماہوار پر مدرس ہو گئے۔ دو برس بعد ڈپٹی انسپکٹر ہو کر کانپور پہنچے لیکن انسپکٹر مدارس سے کچھ بگاڑ ہو جانے پر استعفا دے کر دہلی چلے آئے۔

غدر ۱۸۵۷ء کے بعد آپ ڈپٹی انسپکٹر مدارس ہو کر الٰہ آباد پہنچے۔ وہاں آپ نے انگریزی زبان سیکھی اور رفتہ رفتہ نہایت اچھی استعداد پیدا کر لی۔ اُسی زمانے میں گورنمنٹ تعزیرات ہند کا ترجمہ کرانا چاہتی تھی۔ چنانچہ یہ کام مولانا کے سپرد ہوا۔ آپ نے اس کام کو اس خوبی سے کیا کہ لفٹننٹ گورنر ولیم میور نے خوش ہو کر آپ

کو کانپور کا تحصیلدار کر دیا اور بعد میں ضابطہ فوجداری کا ترجمہ ختم کرنے پر یعنی ۱۸۶۳ء میں ڈپٹی کلکٹر ہو گئے۔

مولانا کی قابلیت کا شہرہ شدہ شدہ حیدرآباد پہنچا اور آپ کو وہاں طلب کیا گیا۔ آپ ۱۸۷۷ء میں ساڑھے آٹھ سو روپیہ ماہوار تنخواہ پر حیدرآباد گئے اور اپنے حسن عمل کے صلہ میں برابر ترقی پاتے رہے۔ یہاں تک کہ آخر میں آپ کو سترہ سو روپیہ ماہوار تنخواہ ملنے لگی اور بورڈ آف ریونیو کے ممبر ہو گئے۔ لیکن سر سالار جنگ اوّل کی وفات کے بعد آپ پنشن لے کر دہلی چلے آئے یہاں آتے ہی آپ تصنیف و تالیف میں نہایت سرگرمی سے منہمک ہو گئے۔

علمی خدمات کے صلے میں آپ نے گورنمنٹ سے متعدد انعام حاصل کیے نقدی انعامات کے علاوہ ۱۸۹۷ء میں شمس العلماء کا خطاب ملا۔ اور ۱۹۰۲ء میں ایڈنبرا یونیورسٹی نے ایل۔ ایل۔ ڈی کی ڈگری عطا کی۔

آخر عمر میں صحت نے جواب دے دیا تھا۔ بینائی جاتی رہی تھی۔ ہاتھوں میں رعشہ آ گیا تھا لیکن لکھنے پڑھنے کا شغل جاری رہتا تھا۔ آخر ۱۹۱۲ء میں اس زبردست انشاء پرداز اور محسن زبان اردو نے وفات پائی۔

آپ کی جملہ مشہور تصانیف کی فہرست یہ ہے۔

قانون۔ تعزیرات ہند۔ قانون شہادت۔

اخلاق۔ مذہب:۔ ترجمہ قرآن شریف۔ ادعیۃ القرآن۔ دہ سورہ۔ مطالب القرآن۔ الحقوق والفرائض۔ امہات الامہ۔ موعظہ حسنہ۔

ناول۔ مرآۃ العروس۔ بنات النعش۔ توبۃ النصوح۔ ابن الوقت۔ رویائے صادقہ۔

مولانا نذیر احمد اپنی تصانیف کی نوعیت اور اپنی انشا پردازی کے لحاظ سے دور چہارم کے مستحق ہیں۔ چنانچہ اسی خیال سے اُن کے نام نامی کو رونق دہ بزم چہارم کیا گیا ہے اور حالات یہاں درج ہوئے ہیں۔ اس لئے کہ آپ اس بزم کی کرسی صدارت پر رونق افروز نظر آتے ہیں۔

مولانا کی زبان خاص دہلی کی ٹکسالی زبان ہے۔ نہایت صاف، سادہ، رواں اور شیریں، تحریر میں بے تکلفی اور بے ساختہ پن ہے۔ تشبیہ و استعارہ سے بھی دلکشی پیدا کرتے ہیں اور برجستہ محاورات کا تو اس قدر شوق ہے کہ کوئی بات اُن کی لطف محاورہ سے خالی نہیں ہوتی۔ متانت اور سنجیدگی کا سررشتہ ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔ کہیں کہیں سنجیدہ ظرافت سے بھی شگفتگی پیدا کر دیتے ہیں۔

آپ کی عبارت میں کہیں کہیں نقائص بھی نظر آتے ہیں۔ بعض اوقات عوام کی زبان لکھ جاتے ہیں۔ محاورات بھی سبک اور عامیانہ استعمال کر لیتے ہیں۔ کبھی کبھی عربی کے متعلق اور غیر مانوس لغت لے آتے ہیں۔ ترجمۃ القرآن اور دیگر مذہبی کتابوں میں آپ کا لب و لہجہ اور انداز بیان کچھ زیب نہیں دیتا۔ بعض مقامات پر آپ نے حفظ مراتب کا خیال نہیں رکھا اور اللہ تعالیٰ اور رسولؐ کا ذکر کرتے ہوئے ایسی زبان اور ایسے محاورے استعمال کر دیئے جو مناسب نہ تھے۔

مولوی نذیر احمد پہلے انشا پرداز ہیں جنھوں نے اردو کو ناول سے روشناس کیا۔ آپ کے ناولوں کے نام اوپر درج کئے جاچکے ہیں اگرچہ

آپ کے ناول حقیقی معنوں میں ناول نہیں۔ تاہم انھیں بجز ناول اور کسی نام سے موسوم کیا بھی نہیں جا سکتا۔ آپ کے ناولوں میں اخلاقی پہلو بہت اُبھرا ہوا ہے۔ آپ کے پیش نظر زیادہ تر اصلاح معاشرت اور تعلیم نسواں ہے اور ان ہی بنیادوں پر آپ ناولوں کی عمارتیں کھڑی کرتے ہیں۔

آپ کے ناولوں میں ناول کے جملہ عناصر مکمل یا نامکمل حالت میں پائے جاتے ہیں۔ اشخاص۔ قصہ۔ پلاٹ۔ مکالمہ، مقصد، اسلوب بیان، زبان ومکان، ان کے علاوہ کردار نویسی، سوشل و معاشرتی تصویریں۔ روزمرہ واقعات کے نقشے ہماری آنکھوں کے سامنے پیش کر دیے ہیں توبۃ النصوح کی ایک شخصیت مرزا ظاہر دار بیگ تو زندۂ جاوید ہے۔

صاحب" دنیائے افسانہ" مولانا نذیر احمد صاحب کے ناولوں کو ناول نہیں کہتے۔ حالانکہ انھوں نے ناول کے جو جو عناصر اور جو جو خصوصیات بیان کی ہیں وہ سب ان ناولوں میں پائی جاتی ہیں۔ پھر کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ انھیں ناول کیوں نہ کہا جائے۔ ناول تو وہ ضرور ہیں لیکن نامکمل نمونے ہیں اور یہ اس لئے کہ ابتدائی کارنامے ہیں۔

پنڈت رتن ناتھ سرشار لکھنوی

پنڈت صاحب لکھنؤ میں پیدا ہوئے سنہ ولادت غالباً ۱۸۴۶ء ہے۔ آپ کی عمر چار سال کی تھی کہ آپ کے والد پنڈت بیجنا تھ صاحب دَر کا سایۂ شفقت سر سے اُٹھ گیا۔

بیان کیا جاتا ہے کہ جس مکان میں حضرت سرشار اپنے لڑکپن کے ایام کھیل کود میں بسر کر رہے تھے۔ اس کے پڑوس میں اہل اسلام کے مکانات تھے۔ آپ اُن کے زنان خانوں میں بچوں کے ساتھ کھیلا کرتے تھے۔ چنانچہ شریف خاتونوں سے آپ نے بیگمات کی زبان اور طرز معاشرت سے بہت کچھ آگاہی حاصل کی۔ جو آیندہ چل کر آپ کی شہرت کا باعث بنی۔ آپ نے ابتداءً عربی و فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد کیننگ کالج میں داخل ہوئے لیکن کوئی ڈگری حاصل نہ کر سکے۔ حصول معاش کے لئے کھیری کے ضلع اسکول میں مدرّس ہو گئے۔

اُس زمانے میں "مراسلہ کشمیر" نامی ایک رسالہ نکلتا تھا جس میں اصلاحی مضامین نکلا کرتے تھے۔ اُسی زمانے میں "اودھ پنچ" بھی اپنا رنگ جما رہا تھا۔ حضرت سرشار کی انشا پردازی کی ابتدا ان ہی رسائل سے ہوئی۔ آپ برابر مضامین لکھ کر ان رسائل میں شائع کرایا کرتے تھے۔ آپ کے ابتدائی مضامین میں مرزا رجب علی بیگ سرور کا رنگ صاف نمایاں ہوتا تھا۔ لیکن شوخی اور دلکشی کچھ اُن سے زیادہ تھی۔ اُسی زمانے میں سررشتۂ تعلیم کی جانب سے ایک اخبار نکلتا تھا۔ اس میں اکثر علمی و اخلاقی مضامین کے ترجمے شائع ہوتے تھے۔ آپ بھی اس اخبار میں مضامین بھیجتے تھے۔ ۱۸۷۰ء میں ایک علم طبیعی کی کتاب کا انگریزی سے اُردو میں ترجمہ کیا۔ اور شمس الضحیٰ اُس کا نام رکھا۔ یہ ترجمہ بہت مقبول ہوا۔ اور اُس نے آپ کی شہرت

کا سنگ بنیاد رکھا۔
منشی نول کشور" اودھ اخبار" نکالا کرتے تھے۔ چنانچہ اس کی ایڈیٹری حضرت سرشار کو تفویض ہوئی۔ آپ کا مایہ ناز کارنامہ" فسانۂ آزاد" اسی اخبار میں بالاقساط نکلا کرتا تھا۔ اسی اشاعت نے آپ کی شہرت کو چار چاند لگائے۔ اور ملک کے گوشے گوشے میں آپ کا طوطی بولنے لگا۔ چنانچہ ۱۸۹۵ء میں آپ کو حیدرآباد طلب کیا گیا۔ جہاں مہاراجہ سرکشن پرشاد نے آپ کی خاطر خواہ قدر افزائی فرمائی۔ لیکن افسوس کہ آپ نے خود اپنی قدر نہ پہچانی، آپ کی بے اعتدالیوں سے آپ کے قویٰ میں ضعف آ گیا۔" فسانہ آزاد" میں دختِ رز کی مذمت نئے نئے انداز سے کی ہے۔ لیکن یہی دخت رز اپنے ہجو اور مذمت کرنے والے کے لئے تپ دروں بن گئی۔ اور اس کو گھلا گھلا کر کانٹا کر دیا۔ آخر ۱۹۰۲ء میں حضرت سرشار نے رحلت فرمائی۔
یوں تو حضرت سرشار نے متعدد تصنیفات یادگار چھوڑیں لیکن مندرجہ ذیل بہت مشہور ہیں۔
" فسانۂ آزاد" " سیر کوہسار" " جام سرشار" " خدائی فوجدار" " طوفان بے تمیزی" " کامنی" وغیرہ۔ ان میں سے " فسانہ آزاد" کو جو شہرت اور ہر دل عزیزی حاصل ہے۔ وہ اب تک کسی اور فسانہ اور ناول کو حاصل نہ ہو سکی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ فسانہ اپنے مصنف کو زندۂ جاوید رکھنے کے لئے کافی ہے۔

"فسانۂ آزاد" بڑی تقطیع کی چار ضخیم جلدوں کا مالک ہے۔ اور اُردو میں ابتدائی اور نامکمل ناول کا عمدہ نمونہ ہے۔ لکھنؤ کی مٹتی ہوئی تہذیب اور گری ہوئی حالت کی سچی تصویریں جیسی اس فسانہ میں ملتی ہیں۔ ان کا عشر عشیر بھی کہیں اور نظر سے نہیں گزرتا۔ ان تصویروں نے اس افسانے کو ناول کے مرتبہ پر پہنچایا اور کتاب کی دلچسپی میں چار چاند لگائے لیکن "فسانۂ آزاد" کی کامیابی کا اصلی راز حضرت سرشار کی جادو طرازی ہے۔ حضرت سرشار کی زبان لکھنؤ کی ٹکسالی زبان ہے۔ محاورہ اور روزمرہ کی شوخی آپ کا خاص رنگ ہے۔ بیان میں شگفتگی اور طرزادا میں رنگینی ہے۔ آپ نے مکالمہ میں کمال دکھایا ہے۔ اگرچہ آپ کا ذاتی طرزادا منفقی اور رنگین ہے۔ لیکن مکالموں میں آپ نے مختلف رنگ اختیار کئے ہیں۔ مگر برجستگی کا سررشتہ کہیں ہاتھ سے چھوٹنے نہیں پایا۔ سوشیل زندگی کی مصوری، منظر نگاری اور مکالمہ میں آپ خاص طور پر کامیاب ہیں اور اس کامیابی کا راز آپ کی شوخی اور زندہ دلی میں مضمر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب سنجیدگی پر اُترتے ہیں اور ناصحانہ انداز اختیار کرتے ہیں تو آپ کی عبارت میں سستی اور پھیکاپن پیدا ہو جاتا ہے۔

اگرچہ آپ کے ناول پلاٹ سے اور آپ کے اشخاص قصہ یک رنگی سے بے نیاز ہوتے ہیں لیکن اُن کی دلچسپی کا یہ عالم ہے کہ یہ خامیاں محسوس نہیں ہونے پاتیں۔

منشی سجاد حسین

منشی سجاد حسین "اودھ پنچ" کے شہرۂ آفاق ایڈیٹر خلف الرشید منشی منصور علی ڈپٹی کلکٹر قصبہ کاکوری میں ۱۸۵۶ء میں پیدا ہوئے۔ اور لکھنؤ میں نشو و نما اور ابتدائی تعلیم پائی۔ ۱۸۷۳ء میں انٹرنس کا امتحان پاس کرنے کے بعد آپ فیض آباد چلے گئے اور وہاں محکمۂ فوج میں اردو ٹیچر کی حیثیت سے ملازم ہو گئے۔ لیکن افتادِ طبع نے مدرسی کو پسند نہ کیا۔ ایک سال ملازمت کرنے کے بعد مستعفی ہو کر آپ لکھنؤ واپس چلے آئے۔

لکھنؤ پہنچ کر علمی زندگی بسر کرنے کا ارادہ کیا۔ چنانچہ ۱۸۷۷ء میں "اودھ پنچ" جاری کیا جو اُن کی اصلی شہرت کا باعث بنا۔ اودھ پنچ کانگریس کا حامی تھا۔ اور آخر وقت تک اُسی کی حمایت میں زعفران زار بنا رہا۔

منشی صاحب فالج کی وجہ سے ۱۹۰۳ء کے بعد مجبور اور معذور ہو گئے تھے۔ قوتِ گویائی بھی قریب قریب سلب ہو چکی تھی۔ مگر اودھ پنچ برابر نکالتے رہے۔ آخر مالی دشواریوں اور کچھ جسمانی معذوریوں سے دق آ کر ۱۹۱۲ء میں اودھ پنچ کو بند کرنا پڑا۔ خود بھی زیادہ زندہ نہ رہ سکے۔ اور دو سال بعد ابتدائے ۱۹۱۵ء میں راہی ملکِ بقا ہوئے۔

منشی صاحب کا مزاج عجیب صفات کا مجموعہ تھا۔ خلقی ذہانت اور طبّاعی کے علاوہ زندہ دلی اُن کی گھٹی میں پڑی تھی۔ زباں دانی اور انشاء پردازی آپ کی مسلّم ہے۔ آپ کے بیان میں ندرت، تحریر میں شگفتگی،

نتائج میں دل نشینی اور انداز میں ظرافت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ خیالات میں بے باکی اور آزادی اس بلا کی تھی کہ جو کچھ چاہتے تھے کہہ گذرتے تھے۔ گورنمنٹ تک پر فقرے چست کرتے تھے۔ اور کسی کی تو ہستی ہی کیا ہے۔ ظرافت چونکہ آپ کی تحریر کا جوہر ہے لہذا تشبیہ و استعارہ بھی ظرافت آمیز استعمال کرتے ہیں۔

"اودھ پنچ" کے علاوہ چند مزاحیہ ناول بھی آپ کے مشہور و معروف کارنامے ہیں جن میں "حاجی بغلول"، "طرح دار لونڈی"، "احمق الدین"، "کایا پلٹ" زیادہ شہرت رکھتے ہیں۔

آپ کے ناولوں کو پلاٹ اور کردار نگاری کے لحاظ سے گذشتہ تمام ناولوں پر فوقیت حاصل ہے۔ اور ارتقائے ناول میں آپ کے کارنامے خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ "حاجی بغلول" زندۂ جاوید کارنامہ ہے۔

مولانا عبدالحلیم شرر

مولانا شرر لکھنؤ میں ۱۸۶۰ء میں پیدا ہوئے۔ پانچ سال کی عمر میں بسم اللہ ہوئی۔ لیکن مکتبی تعلیم میں کچھ کامیابی نہ ہوئی۔ آپ کے والد حکیم تفضل حسین صاحب واجد علی شاہ کی ملازمت میں مٹیا برج کلکتہ میں مقیم تھے۔ انھوں نے مولانا شرر کو ۱۸۶۹ء میں اپنے پاس بلا لیا۔ وہاں آپ نے فارسی عربی اور قدرے انگریزی پڑھی۔ مٹیا برج کے قیام کی بدولت شہزادوں سے خصوصیت تھی۔ اور تعلقات اس قدر بڑھ گئے تھے کہ شہزادوں کو بغیر آپ کے اور آپ کو بغیر شہزادوں کے چین نہ پڑتا تھا۔ اس وقت آپ کی عمر ۱۳،۱۴ برس سے زیادہ نہ تھی۔ شہزادوں کے ساتھ آپ کی رسائی زنان خانہ تک تھی اور مولانا کی زباندانی

کارازاسی میں مضمر ہے۔

مولانا ۱۸۷۷ء میں کلکتہ چھوڑ کر لکھنؤ تشریف لائے۔ یہاں بھی تحصیل علم برابر جاری رہا۔ شوق علم آپ کو ۱۸۷۹ء میں دہلی لایا۔ جہاں آپ نے مولوی نذیر حسین سے حدیث پڑھی اور ڈیڑھ سال کے بعد لکھنؤ واپس پہنچے۔ قیام دہلی کے دوران میں آپ نے محمد بن الوہاب نجدی کے رسالہ التوحید کا ترجمہ کر کے شائع کیا۔ یہ آپ کی پہلی ادبی کوشش تھی۔

لکھنؤ واپس پہنچ کر آپ اودھ اخبار کے اسسٹنٹ بمشاہرہ تیس روپیہ مقرر ہوئے۔ یہاں سے آپ کی ادبی شہرت کا آغاز ہوتا ہے۔ آپ مسلسل دو سال تک علمی، خیالی اور فلسفیانہ مضامین لکھتے اور اخبار میں شائع کرتے رہے اور ملک میں ہر طرف آپ کے مضامین کی دھوم مچ گئی۔

کچھ عرصہ بعد آپ نے "اودھ اخبار" سے قطع تعلق کر کے خود اپنا ایک ماہوار رسالہ دلگداز نکالنا شروع کیا۔ یہ رسالہ جنوری ۱۸۸۷ء سے جاری ہوا اور ختم سال تک اس کے دو ہزار خریدار ہو گئے۔ اس رسالے میں زیادہ تر شاعرانہ و عاشقانہ خیالی مضامین ہوتے تھے یا کبھی کبھی کوئی تاریخی مضمون بھی چھپ جاتا تھا۔ ۱۸۸۸ء میں ایک جزو ناول کا بھی اس میں اضافہ کیا اور "ملک العزیز ورجنا" اس میں بالاقساط شائع ہوا اور پھر متعدد ناول اسی طرح شائع ہوئے لیکن مالی دشواریوں کی وجہ سے آپ کو ۱۸۹۱ء میں حیدرآباد کا سفر کرنا پڑا۔

حیدرآباد میں نواب وقارالامراء نے آپ کی قدردانی کی اور اپنے بیٹے کے ساتھ آپ کو ۱۸۹۳ء میں انگلستان بھیج دیا۔ تین سال آپ وہاں رہے اور اس مدت میں آپ نے فرانسیسی زبان سیکھی۔

انگلستان سے واپس آکر آپ حیدرآباد پہنچے اور "دلگداز" کا دفتر بھی وہیں اُٹھا لے گئے۔ سنہ ۱۹۰۹ء تک آپ کئی بار لکھنؤ آئے گئے۔ لیکن سنہ ۱۹۰۹ء میں حضور نظام کے حکم سے آپ کو حیدرآباد ہمیشہ کے لئے چھوڑ دینا پڑا۔ آپ نے اپنے وطن میں مستقل سکونت اختیار کر لی اور ادبی خدمات میں ہمہ تن مصروف ہو گئے۔ آخر سنہ ۱۹۲۶ء میں راہی ملک بقا ہوئے۔ "دلگداز" آخر وقت تک شائع ہوتا رہا۔

مولانا شرر کی جملہ تصانیف کو ہم چار موضوع پر تقسیم کر سکتے ہیں (۱) ناول (۲) تاریخ (۳) لکچر (۴) متفرق مضامین چونکہ اس باب میں ہمیں ناول ہی سے سروکار ہے۔ لہذا باقی موضوعوں کو نظرانداز کرتے ہیں۔

مولانا کی زبان لکھنؤ کی ٹکسالی زبان ہے۔ نہایت شستہ، صاف، سلیس اور رواں ہے، طرز بیان شگفتہ اور بے تکلف ہے تشبیہ و استعارے کا بہت شوق ہے لیکن یہ زیادہ تر ناولوں میں ہے۔ تاریخی کتابوں میں آپ کا انداز نپا تلا ہے۔ عبارت آرائی نہیں پائی جاتی، منظر نگاری میں آپ کو خاص ملکہ حاصل ہے لیکن اکثر اوقات جذبات کی شدت اس میں شامل ہو کر فضا دیر کو دھندلا کر دیتی ہے۔

مولانا کے ناول دو حصوں میں تقسیم کئے جا سکتے ہیں ایک معاشرتی دوسرے تاریخی دوسرے قسم کے ناول یعنی تاریخی ان کی حقیقی شہرت کے باعث ہیں اُن تاریخی ناولوں کا مقصد قدیم اسلامی حالات کو منظر عام پر لانا اور ان کی اہمیت کا احساس دلانا ہے۔ اسلامی تاریخ کے ہر انقلاب کن واقعہ پر ایک ایک ناول لکھا گیا ہے۔ اور اسلامی حکومتوں کے عروج و زوال کے نہایت عمدہ نقشے دکھائے گئے ہیں۔

آپ نے ناول کو ہردل عزیز بنانے اور اُسے معیار بلندی تک پہنچانیکی بے دریغ کوشش کی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ آپ نے ناول کو انگریزی ناول کے ہم پلّہ کرد کھایا ہے۔ آپ کے بعض ناول مثلاً فردوس بریں، ملک العزیز ورجنا۔ فلورو فلورنڈا وغیرہ بڑے پایہ کے ناول اور ہر لحاظ سے قابل ستائش ہیں۔

آپ کے ناول نگاری میں بعض خامیاں بھی ہیں اوّل تو یہ کہ تاریخی واقعات میں صداقت کا سررشتہ کہیں کہیں ہاتھ سے چھوٹ گیا ہے۔ دوسرے اشخاص قصہ میں جذبات، خیالات، احساسات وغیرہ کے لحاظ سے یکسانیت پائی جاتی ہے۔ بعض اوقات یہ یکسانیت اس قدر اُجاگر ہو جاتی ہے کہ بجز ناموں کے اشخاص میں کوئی فرق نہیں رہتا لیکن ان خامیوں کے باوجود مولانا شرر کا مرتبہ بحیثیت ناول نگار بہت بلند ہے اور اگر تاریخی چھان بین اور موشگافیوں سے قطع نظر کرلی جائے تو آپ اُردو کے پہلے ناول نگار ہیں جنھوں نے انگریزی اصول پر ناول لکھے۔

مرزا محمد ہادی رسواؔ لکھنوی | مرزا محمد ہادی نام۔ رُسوا تخلص، خلف آغا محمد تقی۔ لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔

سنہ ولادت ۱۸۵۸ء ہے۔ سولہ برس کی عمر میں والدین کے سایہ سے محروم ہوگئے۔

ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی۔ پھر انگریزی پڑھنی شروع کی اور انٹرنس پاس کیا۔ رڑکی جاکر اورسیری کا امتحان دیا اور کوئٹہ اور بلوچستان

کی ریلوے میں ملازم ہو گئے لیکن افتادِ طبع اس بے کیف ملازمت کے خلاف تھی۔ چنانچہ ملازمت چھوڑ کر لکھنؤ چلے آئے اور علم کیمیا (کیمسٹری) کی تحصیل میں منہمک ہو گئے۔ لکھنؤ مشن اسکول میں فارسی کے مدرس بھی ہو گئے تھے۔ لیکن کیمسٹری کا شغل برابر جاری رہا۔

پنجاب یونیورسٹی سے منشی عالم کا امتحان آپ نے پاس کر لیا تھا۔ اسلئے اس یونیورسٹی سے بی، اے بھی پرائیوٹ طور پر پاس کیا اور امریکہ کی "اورنٹیل یونیورسٹی" سے پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری بھی حاصل کی۔ آپ متعدد زبانیں جانتے تھے۔ چنانچہ عربی، یونانی، انگریزی، فارسی، ہندی اور سنسکرت پر عبور حاصل تھا۔ ان زبانوں کے علاوہ منطق، فلسفہ اور ریاضی میں دستگاہ کامل رکھتے تھے۔ شاعر بھی اچھے تھے اور مرزا اوج کی شاگردی پر فخر کیا کرتے تھے۔ ناول نگاری میں خاص نام پیدا کیا تھا۔ منجملہ دیگر ناولوں کے "امراؤ جان ادا" شہرہ آفاق اور زندہ جاوید ناول ہے۔

بڑھاپے میں آپ کا تقرر، دارالترجمہ عثمانیہ میں ہو گیا تھا لیکن گاہے گاہے لکھنؤ آتے رہتے تھے۔ خاکسار نے ۱۹۲۵ء یا ۱۹۲۶ء میں مسلم ہوسٹل الہ آباد کے سالانہ مشاعرہ میں آپ کی زیارت کی تھی اور غزل بھی سنی تھی جیسے خود منحنی تھے ویسے ہی آواز بھی منحنی تھی۔ پڑھنے کا انداز بھی نرالا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا باتیں کر رہے ہیں۔ ایک شعر کوشش کے بعد سن کر یاد کیا تھا تبرک کے طور پر پیش کرتا ہوں (اس غزل کے چند اشعار "امراؤ جان ادا" میں درج ہیں)

چارہ گر زہر منگا دے تھوڑا ۔۔۔ لے مجھے اپنی دوا یاد آئی

آخر یہ مجموعۂ کمالات ۱۲ر اکتوبر ۱۹۳۱ء کو دنیائے فانی سے کوچ کر گیا۔

مرزا صاحب کا منظوم کلام نہ کہیں شائع ہوا اور نہ غالباً کہیں محفوظ ہے۔ آپ کی چند غزلیں "امراؤ جان ادا" میں نظر سے گذریں۔ دو چار مسلم ہوسٹل الہ آباد کے مشاعرے میں سُنے۔ ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ زبان کی سلاست اور ندرت اور طرز ادا کی برجستگی اور جذبات و خیالات کی سادگی آپ کے کلام کی خصوصیات ہیں۔

آج کل مرزا صاحب کی شہرت زیادہ تر اُن کی نثر نگاری کی وجہ سے ہے آپ کی زبان لکھنؤ کی ٹکسالی اور ستھری زبان ہے۔ لکھنؤ کے روزمرہ اور محاورات پر پوری قدرت حاصل ہے۔ طرز بیان میں سادگی، صفائی، اور نرمی کے جوہر موجود ہیں۔ عبارت کا اندازہ ایسا ہے گویا بات چیت کر رہے ہیں۔ شگفتگی بھی آپ کی عبارت میں بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔

مرزا صاحب اپنے ناولوں کے متعلق فرماتے ہیں کہ "ہمارے ناول نہ ٹریجڈی ہیں نہ کامیڈی" نہ ہمارے ہیرو تلوار سے قتل ہوتے ہیں اور نہ اُن میں سے کسی نے خودکشی کی ہے۔ نہ ہجر ہوتا ہے نہ وصل، ہمارے ناولوں کو موجودہ زمانے کی تاریخ سمجھنا چاہئے اور حقیقت یہ ہے کہ آپ کے ناولوں کا زمان عصر حاضرہ ہے اور مکان لکھنؤ۔ اشخاص قصہ لکھنؤ یا قرب و جوار کے باشندے ہیں اور ان کے پلاٹ روزانہ زندگی کے واقعات سے لئے گئے ہیں۔ فطرت و حیات انسانی کا گہرا مطالعہ کیا گیا ہے۔ ہر سوسائٹی کے آدمی کو لیا ہے اور اس کے عیب دُھر کر طشت ازبام کر دیا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ مرزا صاحب کے ناولوں میں دلچسپی کا بے انتہا سامان موجود ہے۔

مولانا راشد الخیری

مولانا راشد الخیری شمس العلماء مولوی نذیر احمد کی بیوی کے سگے بھتیجے اور دلی کے ایک معزز و عالی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ آپ ۱۸۶۸ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد نظام گورنمنٹ میں محکمۂ بندوبست کے افسر اعلیٰ تھے۔

عربی و فارسی کی ابتدائی تعلیم گھر کے افراد سے حاصل کرنے کے بعد عربک اسکول میں داخل ہوئے اور یہیں سے انٹرنس کا امتحان پاس کیا۔ اسکے بعد محکمۂ بندوبست میں کچھ عرصہ تک خدمات انجام دیں۔ ۱۹۰۵ء میں آپ نے مستورات کے لئے ماہنامۂ "عصمت" جاری کیا۔ جو اب تک خواتین ہند خصوصاً مخدرات اسلام کی فلاح و بہبود میں مصروف ہے اور مولانا مرحوم کی زبردست کوششوں کی زندۂ جاوید یادگار ہے۔

مولانا نے ابتداءً تحریر میں مولوی نذیر احمد کی پیروی اختیار کی تھی۔ لیکن کچھ مدت بعد ان کا اپنا رنگ اُبھر آیا۔ شروع سے آپ کو مسلمان لڑکیوں کی تعلیم و تربیت سے دلچسپی تھی جو عمر بھر باقی رہی۔ اُن کی تمام تصنیفات میں یہ دلچسپی موجود ہے۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ اس دلچسپی نے آپ کو مصنف بنایا تو بیجا نہ ہوگا۔ عورتوں کی جہالت اور پستی کو دور کرنے اور مردوں کو اُن پر رحم دلانے میں مولانا نے پورا حصّہ لیا۔

آپ شاعر بھی تھے لیکن آپ کی تمام نظمیں عورتوں ہی کے حقوق کی حمایت اور عورتوں کی اصلاح کے متعلق ہیں۔ اگرچہ اب سے ستر برس پہلے آپ پیدا ہوئے تھے یعنی ہنگامہ غدر کے بعد مگر آپ کے دل و دماغ

میں دوسو برس پہلے کے سے بھرے تھے۔ وہ موجودہ مسلمان لڑکیوں کو دوسو برس پہلے کی لڑکی کی صورت میں دیکھنے کے آرزومند تھے۔

مولانا کی مشہور تصانیف میں "صبح زندگی" اور "شام زندگی" کو جو عالمگیر مقبولیت حاصل ہوئی وہ محتاج بیان نہیں۔ آپ کی تصنیفات کی تعداد ساٹھ تک پہنچتی ہے جن میں زیادہ تر ناول ہیں۔ جن کا تعلق مستورات کی اصلاح سے ہے۔

افسوس کہ یہ زبردست انشا پرداز ناول نگار اور عورتوں کا ہمدرد اور مونس غمگسار ۳ر فروری سنہ ۱۹۳۶ء کو اس جہان فانی سے عالم جاودانی کی طرف کوچ کر گیا۔

مولانا کی زبان خاص دہلی کی اردوئے معلّٰی ہے آپ کے روزمرہ عہد حاضرہ کے انگریزی اثر سے قطعی پاک اور ٹھیٹ ٹکسالی ہے۔ عورتوں کی زبان اور بیگمات کے محاوروں پر عبور حاصل ہے اور اُن کو نہایت لطف کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔ الفاظ ملائم اور شیریں زبان سادہ اور شگفتہ طرز بیان ایسا جیسے کوئی باتیں کرتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے جملوں سے تاثیر کا طلسم باندھتے ہیں۔ آپ حزن وملال کے بادشاہ ہیں۔ ہر تصنیف میں بےکسی کے مرقعے اور یاس کی تصویریں پڑھنے والوں کو بے چین کر دیتی ہیں۔ غم و الم کے مناظر کو الفاظ میں جس طرح آپ بیان کرتے ہیں وہ آپ ہی کا حصّہ ہے اور یہی وجہ ہے کہ ملک میں آپ کا لقب "مصوّرِ غم" مشہور ہے۔

آپ کے ناول ایک مخصوص و محدود طبقے کے لئے لکھے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ اُن کے اشخاص اور واقعات اور طرز ادا میں طبیعت کو اکتا دینے والی یکسانیت و یک رنگی ہے۔ چونکہ مولانا ہر شے کو صنف لطیف کے نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں اور انداز بیان بھی یکسانی ہی ہوتا ہے۔ اس لئے آپ کے ناولوں میں مصنوعیت سی محسوس ہونے لگتی ہے۔ حزن و ملال کے غلبے کی وجہ سے بھی طبیعت پراگندہ اور مضمحل ہو کر رہ جاتی ہے۔

ظفر عمر

آپ کے حالات باوجود سعی بلیغ دستیاب نہیں ہوئے۔ چونکہ آپ اُردو میں ناول نگاری کے ایک خاص صنف کے موجد ہیں اور ایک مدت تک پنجاب میں آپ کی ایجاد کی تقلید ہوتی رہی۔ لہٰذا آپ کے نام نامی کو زیب داستان بناتا ہوں۔ آپ کے متعلق صرف اس قدر دریافت ہوا کہ آپ علی گڑھ یونیورسٹی کے گریجویٹ اور محکمہ پولیس میں کسی ممتاز عہدے پر مامور ہیں۔

آپ نے اردو ناول نگاری میں سُراغ رسانی کے حصّوں کا اضافہ کیا اور اس رنگ کے آپ موجد ہوئے۔ آپ کی دو کتابیں "نیلی چھتری" اور "بہرام کی گرفتاری" خاص شہرت رکھتی ہیں۔ دونوں کتابیں ایک ہی سلسلہ کی دو کڑیاں ہیں۔ ہنوز یہ سلسلہ ختم نہیں ہوا تھا کہ مصنّف کو ایک حادثہ پیش آیا جس کی وجہ سے آپ کی ٹانگ میں شدید ضرب آئی اور سلسلہ نامکمل رہ گیا۔

مدت ہوئی خاکسار نے ایک انگریزی ناول پڑھا تھا۔ اس کا نام اعداد میں ہے۔ یہ تو اچھی طرح یاد نہیں رہا کہ عدد کیا تھا لیکن یہ خیال ہے کہ یا تو ۵۰۵ تھا یا ۱۲۸ یا پھر ۵۰۸۔ اُن ایام میں خاکسار نے بہت کوشش کی، لیکن وہ کتاب دستیاب نہیں ہوئی۔ "نیلی چھتری" اور "بہرام کی گرفتاری" حقیقت میں اس انگریزی ناول کا ترجمہ ہے۔ لیکن اس سلیقہ سے کیا گیا ہے کہ کہیں سے ترجمے کا گمان نہیں ہوتا۔ کتابوں کو ہر لحاظ سے ہندوستانی رنگ میں اس طرح رنگ دیا ہے کہ قطعی ہندوستان کی پیداوار معلوم ہوتی ہیں۔ زبان اور طرز بیان بھی نہایت صاف رواں اور شگفتہ ہے۔

تبصرہ وکیفیت

اس دور میں بڑے بڑے قابل بزرگ نظر آتے ہیں جنھوں نے اپنی انشار پردازی سے اُردو کو باغ وبہار کیا۔ لیکن توجہ زیادہ تر ناول کی طرف مبذول رکھی۔ ناول کے موجد ڈاکٹر نذیر احمد دہلوی نے ناول کو ناول کی حیثیت سے نہیں لکھا بلکہ لڑکیوں کی تعلیم کے لئے ایک دلچسپ سلسلہ کتابوں کا مرتب کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ناولوں میں اخلاقی پہلو بہت ابھرا ہوا ہے۔ اُن کے اشخاص قصہ عموماً روشن خیال اور مذہب پرست ہوتے ہیں۔ اُن کے ناول حسن وعشق سے بھی مبرا ہیں۔ ان میں شعریت بالکل نہیں اور یہی وجہ ہے کہ ہم انھیں مکمل ناول نہیں

کہہ سکتے۔

بالکل یہی حال علامہ راشد الخیری کے ناولوں کا ہے۔ مندرجہ بالا باتوں کے علاوہ آپ کے ناولوں میں حزن و ملال کا عنصر غالب ہے ظاہر ہے کہ پڑھنے والا ہر وقت حزن و ملال، یاس و غم وغیرہ کے لئے تیار نہیں رہتا۔ خوشی و مسرت اور ظرافت و زندہ دلی کی بھی اُسے تلاش ہوتی ہے۔ وہ تنوع چاہتا ہے اور یہ باتیں ان ناولوں میں مفقود ہیں۔

حضرت سرشار کے افسانوں کو ایک محدود معنوں میں ناول کہہ سکتے ہیں۔ اُن میں سب سے بڑی خرابی پلاٹ اور ترتیب کی ہے تسلسل افعال اور اشخاص قصہ کے کردار ہیں۔ استقلال بھی آپ کے افسانوں میں مفقود ہیں۔ محض مکالمہ کی خوش اسلوبی اور لکھنؤ کی طرز معاشرت کے صداقت آمیز بیان کے اعتبار سے ہم ان افسانوں کو ناول کہہ سکتے ہیں۔

لے دے کے شرر، منشی سجاد حسین، مرزا رسوا اور ظفر عمر صاحب کے ناولوں پر نظر جمتی ہے۔ منشی صاحب کے ناولوں میں ظرافت ہی ظرافت ہے اور ظفر عمر صاحب کے ناول محض سراغ رسانی سے متعلق ہیں۔ شرر نے البتہ مختلف قسم کے ناول لکھے۔ جن میں تاریخی ناول خاص طور پر قابل قدر ہیں۔ لیکن اُن میں بھی واقعات کے عدم صداقت اور اشخاص قصہ کی یکسانیت کے عیوب پائے جاتے ہیں۔ حضرت رسوا کے ناول اچھے ہیں۔ لیکن انگریزی ناولوں سے اُن کے ناولوں کا مقابلہ کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ ان میں بھی کہیں کہیں فنی نقص موجود ہیں۔

اگرچہ ان مشہور ناول نگاروں کے علاوہ منشی عبدالغفور اور احمد حسین خاں اور حکیم محمد علی خاں وغیرہم نے بھی بعض اچھے ناول لکھے جو ایک حد تک مقبول بھی ہوئے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اردو اب تک فنی اعتبار سے عمدہ اور مستند ناول پیش کرنے سے قاصر رہی اور شاید قاصر ہی رہے گی کیونکہ فی زمانہ ناول نگاری سے لوگوں کی توجہ ہٹ گئی ہے۔

باب ۱۷

مابعد دورِ چہارم

حصّہ دوم۔ متفرقات

۱۔ مختصر افسانہ نگاران اُردو

تمہید

مختصر افسانہ مختصر افسانہ انیسویں صدی کی ایجادات میں سے ہے۔ یہ ناول کی طرح حیات انسانی کا مکمل چربہ نہیں ہوتا بلکہ حیات انسانی کے کسی خاص رُخ یا کسی خاص واقعہ کا مؤثر اور دلچسپ بیان ہوتا ہے۔

قدیم مختصر افسانہ مختصر افسانہ یوں تو اردو میں بہت قدیم ہے۔

منشی پریم چند
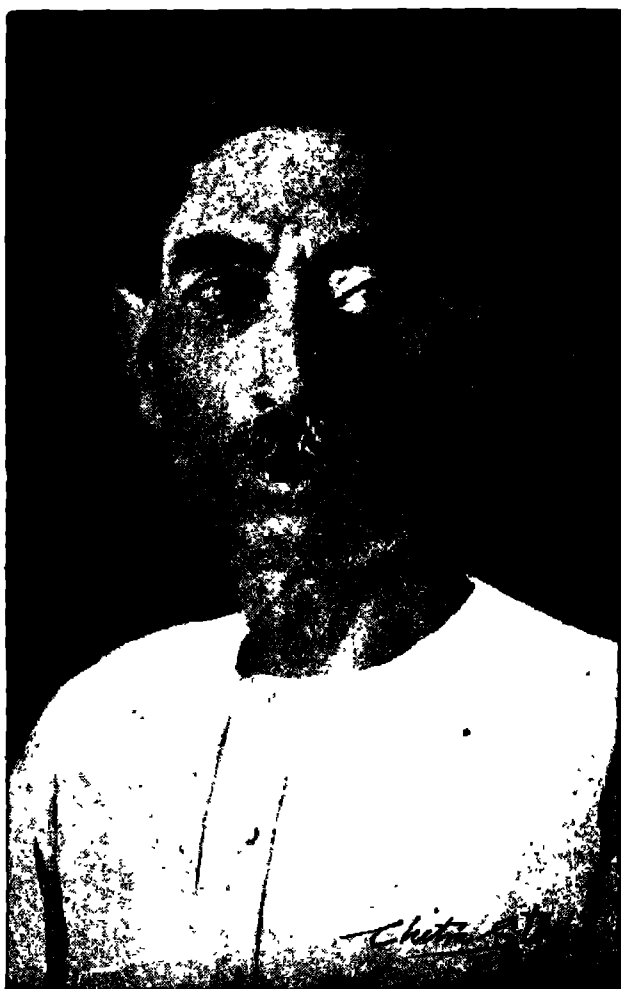
فورٹ ولیم کالج کے عہد میں مختصر افسانے بہت لکھے گئے لیکن اُن مختصر افسانوں اور موجودہ مختصر افسانوں میں وہی فرق ہے جو افسانہ اور ناول میں (ملاحظہ ہو باب ۱۶) اُردو میں مختصر فنی افسانوں کی پیدائش براہ راست مغربی قصوں کے اثر کے ماتحت ہوئی۔ اور منشی پریم چند سب سے پہلے قصہ نگار ہوئے۔

منشی پریم چند

آپ کے مختصر افسانوں کے دو مجموعے "پریم پچیسی" اور "پریم بتیسی" شائع ہو چکے ہیں۔ آپ کے قصوں کی خصوصیات یہ ہیں۔

عمیق مطالعہ فطرت، واقعات روزمرہ کا بیان، جذبات انسانی کی صحیح مصوری، دیہاتی زندگی کے مرقعے، کردار اور منظر نگاری آپ کے قصوں میں حزنیہ اور طربیہ دونوں طرح کے قصے موجود ہیں لیکن آپ کے حزنیہ قصے طربیہ قصوں سے زیادہ مؤثر ہوتے ہیں۔

زبان اور طرز بیان بھی قابل ستائش ہے۔ شستہ اور سلیس زبان اور اُس پر بے تکلف انداز بیان سے آپ کی عبارت عام طور پر شگفتہ اور پُر لطف ہوتی ہے۔

آخر میں یہ بات عرض کر دینی نامناسب نہ ہوگی کہ اگرچہ منشی صاحب مختصر افسانوں کے بانی ہیں لیکن ابتدا ہی سے آپ نے اس فن میں وہ کمال حاصل کر لیا کہ اب تک کوئی اور افسانہ نگار آپ کے مقابلے پر پیش نہیں کیا جا سکتا۔ آپ کا مرتبہ بہ حیثیت افسانہ نگار بہت بلند ہے۔

سُدرشن پنڈت بدری ناتھ سُدرشن نے بھی مختصر افسانہ نگاری میں خاص شہرت اور ہر دل عزیزی حاصل کی ہے۔ آپ کے افسانے جذبات کو اُبھارتے ہیں۔ ہر ایک قصے میں کوئی نہ کوئی حقیقت ضرور ہوتی ہے۔ جذبات انسانی کے کسی نہ کسی پہلو پر ضرور روشنی پڑتی ہے۔ قصّہ کا پلاٹ ڈرامیٹک ہوتا ہے۔ خوبیٔ زبان اور لطافت بیان کا بھی خاص خیال رکھا گیا ہے۔ منشی پریم چند کی طرح آپ کے افسانوں میں بھی مقامی رنگ بڑی حد تک جلوہ فرما ہوتا ہے۔ کردار نویسی آپ کا خاص جوہر ہے۔ ہر درجہ اور ہر سوسائٹی کے لوگوں کے کردار کو فطری انداز میں پیش کرتے ہیں۔

نیاز فتحپوری نیاز فتحپوری، مشہور و معروف رسالہ "نگار" کے ایڈیٹر و مالک۔ نثر میں ایک خاص طرز اور اسلوب کے موجد اور مالک ہیں۔ آپ الفاظ اور تراکیب کے حُسن اور زور بیان سے اپنی عبارت میں ایک مخصوص رنگ آمیزی کرتے ہیں۔ بندش الفاظ نہایت چست ہوتی ہے۔ جس سے خود بخود ایک موسیقیت پیدا ہو جاتی ہے اور عبارت کی دلکشی بہت بڑھ جاتی ہے۔

یوں تو حضرت نیاز نے مختلف موضوعات پر طبع آزمائی کی ہے اور ہر جگہ اپنی ادبی شان کو برقرار رکھا ہے۔ لیکن مختصر افسانہ نویسی میں آپ کو خاص مقبولیت حاصل ہے۔ آپ کے افسانوں کے دو مجموعے "نگارستان" اور "جمالستان" شائع ہو کر شہرت عام حاصل کر چکے ہیں۔ ان افسانوں میں بعض ترجمے ہیں اور باقی اُن ہی کی دماغی

تخلیق ہیں۔

حضرت نیاز نے قصوں میں تخیل کی بلندی سے زیادہ کام لیا گیا ہے۔ اگرچہ ان میں صداقت کی کمی ہے لیکن یہ کمی آپ کے اسلوب بیان کے جادو اور تخیل کی سحر طرازی کی وجہ سے محسوس نہیں ہوتی۔ اشخاص قصہ جیتے جاگتے انسان نہیں ہوتے بلکہ وہ چند کیفیات اور جذبات کا مجموعہ ہوتے ہیں جن کو مصنف کا دماغ محض تخیل کے زور سے پیدا کر لیتا ہے۔ آپ کے افسانوں کا موضوع حسن وعشق ہے۔ نہ اُن سے کسی قسم کی اصلاح مدِ نظر ہوتی ہے۔ اور نہ وہ کوئی اخلاقی درس دیتے ہیں، وہ محض حسین خیالات ہیں جن کو نیاز صاحب اپنی رنگینی ادا سے حسین تر بنا دیتے ہیں۔

سجاد حیدر یلدرم آپ کے افسانوں کا مجموعہ "خیالستان" کے نام سے دنیائے ادب میں کافی شہرت حاصل کر چکا ہے۔ اس میں کچھ افسانے تو ترکی افسانوں کے ترجمے ہیں، کچھ انگریزی کے اور کچھ طبع زاد ہیں۔

حضرت نیاز کی طرح سجاد صاحب بھی خیالی پیکر بنانے میں خاص کمال رکھتے ہیں۔ جذبات نگاری میں بھی آپ کا مرتبہ کافی بلند ہے۔ وہ افسانے جو غیر زبانوں سے ترجمہ ہوئے ہیں، وہ اپنی بلندیٔ تخیل اور زورِ بیان کے لحاظ سے اکثر اصل افسانوں سے بھی بڑھ گئے ہیں اور لطف یہ کہ ترجمہ اس سلیقے سے ہوا ہے کہ کہیں ترجمہ کا گمان نہیں ہوتا۔

آپ کی عبارت میں ایک خاص انداز کا بانکپن اور بندشوں میں جدت اور شگفتگی ہر جگہ موجود ہوتی ہے۔ طرزِ بیان میں برجستگی اور ندرت عجیب شعریت پیدا کر دیتی ہے۔ فارسی تراکیب سے بہت کام لیتے ہیں، لیکن کہیں کہیں یہ تراکیب غیر مانوس بھی ہو جاتی ہیں۔

خواجہ حسن نظامی خواجہ صاحب موجودہ عہد کے اہل قلم حضرات میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں، ہندوستان کے گوشے گوشے میں آپ کی زبان اور طرزِ بیان کی دھوم ہے۔ آپ کی زبان دہلی کی ٹکسالی زبان ہے سادگی، برجستگی، روانی، شیرینی اور عام فہمی آپ کی زبان کی خصوصیات ہیں زبان میں نزاکت اور رنگینی بھی بلا کی ہے۔ چھوٹے چھوٹے جملے اور ان میں صفائی اور چستی سے آپ کی تحریر میں شگفتگی اور تاثیر پیدا ہو جاتی ہے۔ اسلوب بیان میں متانت و سنجیدگی پائی جاتی ہے مگر کہیں خشکی اور روکھا پن نہیں آنے پاتا۔

خواجہ صاحب کی پچاس ساٹھ تصنیفات شائع ہو کر شہرت عام اور بقائے دوام حاصل کر چکی ہیں۔ ع اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔

آپ کی اکثر تصنیفات مسلمانوں کی اندوہناک حالت سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہیں۔ غدر کے بعد خاندانِ مغلیہ کی بیگمات پر جو کچھ گذری اس کا بیان نہایت سوز و گداز اور پُر تاثیر انداز میں کرتے ہیں۔ غمناک مناظر کے بیان میں آپ کو یدِ طولیٰ حاصل ہے۔

آپ کے مختصر افسانے فطرت کی مصوری کے لحاظ سے خاص طور پر ممتاز ہیں۔ سوز و گداز کا عنصر بھی اُن میں ایک مخصوص انداز رکھتا ہے۔ آپ نے حسین مضامین اور تخیلی افسانے لکھ کر موجودہ انشا پردازوں میں ایک امتیازی شان پیدا کر لی ہے۔ آپ کے مضامین میں روحانیت ہر جگہ جلوہ فرما ہے۔ آپ نے لالٹین، دیا سلائی، برف وغیرہ مضامین لکھے ہیں۔ لیکن ان معمولی اور حقیر چیزوں کی آڑ میں آپ صوفیانہ اور اخلاقی نکات حل کرتے ہیں۔ آپ کو کائنات کے ذرّے ذرّے میں روحانیت نظر آتی ہے اور جو اثر آپ کے دل پر مترتب ہوتا ہے اُس کو عام فہم اور پرتاثیر انداز میں پیش کر دیتے ہیں۔ اور پھر اُس کا لفظ لفظ عام پڑھنے والوں کے لئے درسِ معرفت بن جاتا ہے۔

۲۔ صحیفہ نگارانِ اُردو

تمہید "آبِ حیات" میں لکھا ہے کہ ۱۸۳۵ء میں اخباروں کو آزادی حاصل ہوئی ہے۔ چنانچہ ۱۸۳۶ء میں اُردو کا اخبار دہلی سے جاری ہوا۔ یہ اس زبان کا پہلا اخبار تھا کہ آزاد کے والد مرحوم کے قلم سے نکلا۔ ۱۸۳۶ء کے بعد متعدد اخبار ملک کے متعدد گوشوں سے جاری ہوئے اور بند ہو گئے۔ لیکن ان اخباروں میں سے کسی نے بھی کوئی خاص امتیازی حیثیت حاصل نہیں کی۔ البتہ ۱۸۷۷ء میں منشی سجاد حسین نے لکھنؤ سے اودھ پنچ نکالا اور اپنی ذاتی قابلیت اور مخصوص رنگ کی بدولت اُسے زندۂ جاوید کر دیا۔ منشی صاحب صحیفہ نگارانِ اُردو میں بڑا مرتبہ رکھتے ہیں۔

چونکہ آپ کا ذکر باب ۱۶ (حصۂ اوّل) میں گزر چکا ہے۔ لہذا اب اعادہ کی چنداں ضرورت نہیں۔

اس وقت تک اُردو میں سیکڑوں اخبار اور رسائل نکلے۔ کچھ بند ہو گئے، کچھ جاری ہیں۔ آئے دن نئے اخبار اور رسائل نکلتے رہتے ہیں۔ اس وقت موجودہ اخبارات اور رسائل کی تعداد دو سو سے زیادہ ہے۔ لیکن ان اخبار اور رسائل میں بہت کم ایسے ہیں جن کے ایڈیٹروں نے ملک میں صحیفہ نگار کی حیثیت سے خاص شہرت حاصل کی ہو۔ خاکسار بعض مالکان اخبار و رسائل کی قابلیت و انشاء پردازی کا قائل ہے لیکن اس حقیقت سے ناچیز انکار نہیں کر سکتا کہ ان میں بجز منشی سجاد حسین مرحوم، حضرت نیاز فتحپوری، مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا ظفر علی خاں کے کسی اور بزرگ نے صحافت میں کوئی کمال حاصل نہیں کیا۔

اس باب کا یہ حصہ صحیفہ نگاران اردو کے لئے وقف کیا گیا ہے۔ منشی سجاد حسین مرحوم کا ذکر ہو چکا۔ حضرت نیاز فتحپوری کا ذکر اسی باب کے حصۂ اوّل میں گزر چکا۔ یہاں مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا ظفر علی خاں کا تذکرہ کرتا ہے۔

ابوالکلام آزاد مولانا ابوالکلام آزاد کا شمار عہد حاضرہ کے بہترین انشاء پردازوں میں ہوتا ہے "الہلال" نے آپ کے مخصوص انداز بیان کو اور آپ کے مخصوص انداز بیان نے "الہلال" کو

شہرت عام اور بقائے دوام بخشی۔ اخباروں میں "الہلال" نے جو شہرت اور مقبولیت حاصل کی تھی آج تک کسی اور اخبار کو حاصل نہیں ہوئی۔

بجز تفسیر القرآن مولانا آزاد کی اور کوئی مستقل تصنیف نہیں ہے۔ وہ مضامین جو "الہلال" میں نکلتے رہے، وہی آپ کی انشاء پردازی کو مسلّم کرتے ہیں۔ آپ کی زبان نہایت شیریں، صاف اور رواں ہوتی ہے۔ آپ کے طولانی جملوں میں توازن اور تسلسل لطف پیدا کر دیتا ہے۔ خیالات چونکہ سلجھے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس لئے عبارت بھی سلجھی ہوئی اور مربوط ہوتی ہے۔ اور عام طور پر حشو و زوائد سے پاک۔

مولانا کو عربی الفاظ اور فارسی تراکیب کا خاص شوق ہے لیکن نرا شوق ہی نہیں بلکہ آپ اُن کو نہایت سلیقہ اور اُستادی کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔ آپ کی عبارت میں علمی اور فلسفیانہ عمق ہوتا ہے۔ بڑے بڑے مفہوم کو نہایت سہولت کے ساتھ ادا کرتے ہیں۔ اور پھر اس طرح کہ نہایت آسانی سے ذہن نشین ہو جاتے ہیں۔

مولانا کی قوت گویائی آج کل ضرب المثل بنی ہوئی ہے۔ آپ کی تقریر عالمانہ اور ادیبانہ ہوتی ہے۔ فصیح و بلیغ زبان کے علاوہ بیان اس قدر سلجھا ہوا ہوتا ہے کہ لفظ لفظ میں تاثیر ہوتی ہے اور مطلب و مدعا اس طرح واضح ہوتا چلا جاتا ہے کہ "گویا یہ بھی میرے دل میں تھا"۔ یہی خطیبانہ انداز آپ کی تحریر میں بھی نمایاں ہے جوش عمل آپ کے جملے سے ٹپکتا ہے۔ آپ کے مضامین زیادہ تر سیاسی رنگ میں رنگے ہوتے ہیں جن کے لئے

صداقت اور جوش نہایت ضروری ہے اور یہ صفات اُن کی تحریر میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔

مولانا آزاد کا مطالعہ قرآن بہت وسیع ہے۔ قرآن کی آیتیں نہایت بے تکلفی اور برجستگی کے ساتھ آپ تحریر و تقریر میں استعمال کرتے ہیں۔ تفسیر القرآن آپ کا مایۂ ناز کارنامہ ہے۔ یہاں ہمیں اُس کی زبان اور طرز بیان سے تعلق ہے۔ تفسیر کے متعلق بحث کرنے کا یہ موقع نہیں ورنہ اس میں بھی بہت خوبیاں ہیں۔ زبان اور طرز بیان میں جو مولانا نے کمال دکھایا ہے وہ قابل صد ہزار ستائش ہے۔ تفسیر کی زبان نسبتاً آسان اور عام فہم ہے۔ ربوبیت جیسے وسیع اور پیچیدہ مسئلہ کو آپ نے اس اُستادی سے بیان کیا ہے کہ معمولی پڑھا لکھا آدمی بھی نہایت آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔ باوجود اس کے ادبیت میں فرق نہیں آنے پاتا ہے۔

اگرچہ الہلال نے اُردو ادب کو بالواسطہ اور بلاواسطہ بیحد فائدہ پہنچایا ہے۔ تاہم خاکسار کی آرزو ہے کہ کاش مولانا آزاد کوئی مستقل ادبی کارنامہ تصنیف فرمائیں اور دنیائے اُردو کو زیر بار احسان کریں۔

ظفر علی خاں

مولانا ظفر علی خاں مشہور و معروف اخبار "زمیندار" کے ایڈیٹر، مصنف، انشاء پرداز اور شاعر کی حیثیت سے کافی شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ آپ کے ترجمے "معرکہ مذہب و سائنس"

کو قبولیت عام حاصل ہو چکی ہے اور آپ کی زبان دانی اور انشا پردازی کے روبرو صاحب الرائے اصحاب سر تسلیم خم کر چکے ہیں۔

مولانا موصوف کا قلم سیاسی، تمدنی، آئینی امور کے علاوہ سائنس و مذہب اور شعر و شاعری میں کبھی اسی بے باکی اور روانی سے تگ و دو کرتا ہے۔ معاشرتی اصلاح کے لئے آپ نے خود بھی مضامین لکھے ہیں اور مغربی مصنفین کے خیالات کو بھی اردو میں منتقل کیا ہے۔ آپ کی تصانیف "معاشرت" قابل قدر کارنامہ ہے۔ آپ کے ناول بھی بلند پایہ ہیں۔ جن سے آپ کی نظر کی وسعت اور مطالعہ کی ہمہ گیری کا ثبوت ملتا ہے۔ یہ ناول خانگی زندگی کا نہایت سچا مرقع پیش کرتے ہیں۔

مولانا کی زبان مستند ہے۔ روزمرہ و محاورات پر آپ کو قدرت کامل حاصل ہے۔ عربی الفاظ اور فارسی تراکیب کو چابک دست صناع کی طرح برتتے ہیں۔ انداز بیان میں برجستگی اور روانی خاص طور پر نمایاں ہے۔ عبارت پختہ اور موثر ہوتی ہے۔

آپ کی متفرق نظموں کا مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔ جو بہت مختصر ہے۔ اس میں زیادہ تر سیاسی نظمیں ہیں جو ہر حیثیت سے قابل قدر ہیں۔

۳۔ مزاح نگاران اُردو

تمہید انسان محض حیوان ناطق ہی نہیں ہے بلکہ ہنسنے ہنسانے والا جانور بھی ہے۔ جہاں متانت و سنجیدگی لوازم انسانیت ہیں وہاں "خندۂ دنداں نما"

اور "تبسم زیرلب" بھی نہایت ضروری ہیں۔ ان کے بغیر شاید کامیاب زندگی بسر ہی نہیں کی جا سکتی۔

ادب مرقع حیات ہوتا ہے۔ اس لئے اس میں بھی متانت و سنجیدگی کے دوش بدوش شوخی، ظرافت، طنز، مزاح کا عنصر موجود رہا ہے۔ بعض لوگوں نے دل کا بخار نکالنے کے لئے طنز کا پہلو اختیار کیا بعض نے محض ہنسنے ہنسانے کے لئے زعفران زار تیار کیا۔ لیکن بعض نے شوخی اور مزاح نگاری کو اصلاح کا آلۂ کار بنایا اور زندگی کے ہر شعبہ میں اس سے کام لیا۔

شاعری میں مرزا رفیع سودا کی ہجوؤں کا ذکر ہو چکا ہے آپ دل کا بخار نکالنے والوں میں سے ہیں۔ انشاء، رنگین، رجان صاحب محض ہنسنے ہنسانے والوں میں اور حضرت اکبر الہ آبادی اور ظریف لکھنوی وہ ہیں جو شوخی، طنز اور مزاح سے اصلاحی کام لیتے ہیں۔

نثر میں مزاح نگاری کی ابتدا "اودھ پنچ" کے اجراء سے ہوئی منشی سجاد حسین اور ان کے ناولوں کا ذکر باب ۱۶ میں گذر چکا ہے منشی صاحب اس انجمن میں بھی صدر نشین ہیں اور ان کے حاشیہ نشینوں میں نیتی "اودھ پنچ" کے نامہ نگاروں میں مرزا مچھو بیگ ستم ظریف منشی احمد علی شوق، منشی جوالا پرشاد برق، پنڈت تربھون ناتھ ہجر خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اب ہی کی شوخیوں نے "اودھ پنچ" کو زعفران زار بنا رکھا تھا۔ لیکن یہ رنگ قدیم تھا اب زمانہ نیا ہے۔ ہر چیز نئی ہے۔ یہاں تک کہ مزاح نگاری بھی نئے نئے اسلوب سے جلوہ گر ہے۔ مغربی علوم نے علم و ادب کا رنگ بدل دیا۔ ادب کے ہر شعبے میں ایک نئے

دور کا آغاز ہوا۔ مزاح نگاری نے بھی اپنی چولی بدلی۔ یہ رنگ علی گڑھ سے شروع ہوا۔ اور شدہ شدہ ملک کے گوشے گوشے میں پھیل گیا۔ چونکہ ہر کس و ناکس نے اس رنگ کو اختیار کرنے کی کوشش کی۔ اس لئے اس میں ادبی شان پیدا نہ ہو سکی۔ اِنے گنے چند اصحاب ایسے نظر آتے ہیں جنھوں نے زبان اور ادب کو مزاح پر مقدم سمجھا اور ظرافت کی بے ماکیوں کو مقتضیات انشاپردازی سے دبایا۔

رشید احمد صدیقی آپ علی گڑھ یونیورسٹی میں اردو ادب کے پروفیسر ہیں۔ آپ نے مزاح نگاری کی تاریخ تصنیف فرمائی ہے جو ہندوستانی اکیڈیمی الٰہ آباد کی طرف سے شائع ہو چکی ہے۔

آپ کے مضامین میں شستہ ظرافت ہوتی ہے جو زیادہ تر رمز و کنایہ سے پیدا کی جاتی ہے۔ ”چشم ساقی“ کی طرح آپ کے ”اشارے بہت لطیف“ ہوتے ہیں جن سے پڑھنے والا نہ کبھی ”ہوشیار“ ہوتا ہے نہ ”بے خود“ خیر یہ تو محض اصغر صاحب کے ایک شعر کا تلازمہ تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ آپ کے مضامین عام فہم نہیں ہوتے۔ جس شخص کی تاریخی، سیاسی، اور اخباری معلومات وسیع نہیں ہوتی وہ آپ کے مضامین کا منہ دیکھتا رہ جاتا ہے۔

آپ کے مضامین کی طرح آپ کی زبان بھی مشکل اور خاص فہم ہے۔ عربی فارسی الفاظ و تراکیب بکثرت استعمال کرتے ہیں۔ لیکن اکثر ان ہی الفاظ و تراکیب میں ”موج تبسم“ پنہاں ہوتی ہے۔ ادبیت و صحت آپ کی عبارت کا جوہر ہے۔

مرزا فرحت اللہ بیگ آپ کی مزاح نگاری لطیف تبسم پیدا کر سکتی ہے۔ آپ کے مضامین میں ادبیت جھلکتی ہے۔ زبان کی صحت کا پورا پورا خیال رکھتے ہیں اور پستی اور عامیانہ پن سے گریز کرتے ہیں۔ آپ نے مزاح نگاری کے علاوہ ادبی مباحث پر بھی طبع آزمائی کی ہے۔ مگر آپ اپنی شوخی طبیعت سے مجبور ہیں کہ وہاں بھی گل کھلائے بغیر نہ رہ سکی۔ آپ کو دہلی کی عامیانہ زبان اور روزمرہ پر کامل عبور حاصل ہے اور انھیں مضامین میں موقع موقع سے سجاتے جاتے ہیں جس سے عجب لطف پیدا ہو جاتا ہے۔

عظیم بیگ چغتائی مزاحیہ افسانہ نگاری کے علاوہ آپ مصوری میں بھی کامل ہیں۔ آپ کے افسانوں میں پلاٹ کی دلکشی خاص چیز ہے۔ آپ کے اکثر افسانوں کا مقصد اصلاح رسوم ہوتا ہے۔ آپ شادی بیاہ، نکاح، طلاق اور پردہ کی رسوم میں اصلاحیں کرنا چاہتے ہیں اور یہی خواہش آپ کے افسانوں کی محرک ہوتی ہے۔ آپ کی مزاح نگاری کا دارومدار پلاٹ پر ہوتا ہے۔ زبان کے بارے میں آپ ذرا بے پرواہ واقع ہوئے ہیں۔ آپ کی متعدد تصنیفات شائع ہو کر مقبول ہو چکی ہیں۔

مُلّا رموزی آپ کی گلابی اُردو دلچسپی سے پڑھی جاتی ہے۔ (گلابی اُردو "بے ترتیب اُردو" کا نام رکھ لیا گیا ہے جیسے پرانے زمانے میں قرآن شریف کا لفظی ترجمہ ہوتا تھا۔ ملاحظہ ہو باب ۱۲۔ ترجمہ:

از شاہ عبدالقادر صاحب)

ملا رموزی صاحب کے دل میں مذہب و قوم کا درد ہے۔ آپ مذہب کو سربسبز اور قوم کو معراج ترقی پر دیکھنا چاہتے ہیں۔ آپ کے مضامین میں سیاسی واقعات کی طرف اشارے ہوتے ہیں اور آپ کی مزاح نگاری کا دار و مدار معاشرتی اور اخلاقی معاملات کی نکتہ چینی پر ہوتا ہے۔

محسنین ادب اُردو

تمہید اُردو ادب کے موجودہ دور کو اگر ادب لطیف کا دور کہا جائے تو کچھ زیادہ نامناسب نہ ہوگا دنیائے اُردو کا رجحان زیادہ تر مختصر و مزاحیہ افسانہ کی طرف ہے خصوصاً نوجوان اہل قلم تو اسی ادب لطیف کو میدان عمل بنائے ہوئے ہیں اور بجز دو چار ادبی رسائل کے اور کوئی رسالہ ایسا نہیں جو ادب لطیف سے گراں بار نہ ہو۔ لیکن اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ دورِ حاضرہ مسلّم الثبوت انشار پرداز حضرات سے قطعی خالی ہے۔ اس دور میں ناقدین کی بھی کثرت ہے لیکن افسوس کہ ان میں معدودے چند اہل قلم حضرات تاریخ ادب میں کسی نمایاں حیثیت کے مالک ہیں۔ خاکسار یہاں ان حضرات کا ذکر کرے گا۔ جنھوں نے اپنی بے دریغ کوششوں سے اُردو ادب کو مالا مال ہی نہیں بلکہ اُردو زبان و ادب کی روایات کے دوش بدوش اسلاف کے نام کو بھی روشن کیا ہے۔

۱۔ مولانا سید سلیمان ندوی آپ مولانا شبلی مرحوم کے شاگرد رشید اور جانشین ہیں۔ آپ نے مولانا موصوف کی وفات پر اُن کی وصیت کے مطابق دارالمصنفین کو قائم و جاری رکھا اور "سیرت النبیؐ" کی تکمیل کی۔ فارسی و عربی کے عالم جید اور فاضل اجل ہیں اور اردو کے مسلّم الثبوت انشا پرداز۔

آپ نے سیکڑوں مضامین ادبی فلسفیانہ، مذہبی، تاریخی اور تنقیدی لکھے جو ملک کے مختلف رسائل خصوصاً معارف میں شائع ہوئے۔ علاوہ ازیں آپ کی مستقل تصانیف میں "سیرت عائشہ"، "حیات مالک" اور "خیام" خاص طور پر قابل قدر و ستائش ہیں۔ "سیرت النبیؐ" کی تیسری جلد چھ موضوع میں مستقل لکھی ہے۔ جس نے آپ کے نام نامی کو شہرت کے بلند ترین مدارج پر پہنچا دیا ہے۔

آپ انشا پرداز [illegible] اپنے اُستاد مولانا شبلی کے نقشِ قدم پر چلتے ہیں۔ جو لوگ مولانا شبلی کی طرز تحریر کے گرویدہ ہیں۔ انھیں آپ کی تحریر میں خاص لطف آتا ہے۔ آپ کی تحریر میں خاص پختگی اور ادبیت ہوتی ہے۔ جس میں رنگینی کی بجائے خیالات کی ترتیب، زور بیان کا زور اور عالمانہ متانت شگفتگی اور لطف پیدا کر دیتی ہے۔ آپ کی عبارت فارسی و عربی ادق الفاظ اور نامانوس تراکیب سے پاک ہوتی ہے۔ کہیں کہیں شوخی بھی جھلک دکھاتی ہے۔ مگر نہایت لطیف، آپ مقرر بھی ہیں اور اچھے مقرر ہیں اسی لئے آپ کی تحریر میں کہیں کہیں تقریر کا لطف آتا ہے اور خطابت کا زور بڑھ جاتا ہے۔

جن کو آپ کی ہمہ گیر طبیعت کے گونا گوں جلوے دیکھنے ہوں وہ آپ کے رسالہ "معارف" کے شذرات ملاحظہ کریں۔ جن میں ادبی، تنقیدی، تاریخی، مذہبی وغیرہ سب قسم کے مضامین بہترین ادبی شان کے ساتھ پائے جاتے ہیں۔

۲۔ مولانا عبدالماجد دریاآبادی

یوں تو آپ کے مضامین مختلف موضوعوں مثلاً سوانح عمری تنقید وغیرہ پر اکثر نکلتے رہتے ہیں لیکن آپ کا خاص میدان فلسفہ ہے اور حقیقت یہ ہے کہ فلسفہ میں آپ کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ اردو ادب میں اب تک فلسفہ پر بہت کم لکھا گیا تھا لیکن مولانا نے موصوف نے اس کمی کو بڑی حد تک پورا کر دیا ہے۔

آپ کی مستقل تصانیف میں "فلسفہ جذبات" اور "فلسفہ اجتماع" اور ترجموں میں "مقالات برکلے" نہایت مفید اور قابل قدر تصانیف ہیں۔

آپ کی زبان اور طرز بیان، فلسفیانہ خیالات کے اظہار کے لئے خاص طور پر موزوں ہے۔ لیکن آپ کا انداز مختلف موضوعات کے لئے مختلف ہوتا ہے۔ مثلاً فلسفہ میں آپ کا انداز عالمانہ ہوگا۔ فارسی و عربی کے ادق الفاظ و اصطلاحات استعمال ہوں گے مگر عبارت میں سلاست و روانی قائم رہے گی۔ سوانح عمری اور ادبی تنقید میں آپ کا انداز بالکل بدل

جائے گا۔ صفائی، سلاست اور شگفتگی بہت بڑھ جائے گی عربی و فارسی الفاظ و تراکیب کی کثرت بھی نہیں رہے گی۔ اسی طرح موضوع کے مطابق انداز بیان اختیار کرنے میں آپ کو کمال حاصل ہے۔ ہر رنگ میں زور ہوتا ہے اور ہر مقام پر آپ کی قدرت بیان کا ثبوت ملتا ہے۔
ترجمے میں آپ نے کمال دکھایا ہے۔ ترجمے پر تصنیف کا دھوکا ہوتا ہے۔ آپ کے ترجمے کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اردو اسلوب کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے اردو روزمرہ محاورہ کا پورا خیال رکھتے ہیں، اور کہیں انگریزی جھلک آنے نہیں دیتے، یہ صفت جس قدر قابل ستائش ہے۔ اسی قدر دشوار بھی ہے لیکن مولانائے موصوف نے اسے اس خوبی سے نباہا ہے کہ خاص و عام کو اپنی زباندانی اور انشاپردازی کا قائل کرلیا ہے۔

۳۔ مولوی عبدالحق

انجمن ترقی اردو کے سکریٹری مولوی عبدالحق صاحب اردو زبان و ادب کی جو خدمات انجام دے رہے ہیں وہ تاریخ ادب کے صفحات پر زرّین حروف میں لکھنے کے لائق ہیں۔ آپ کو قدیم اردو ادبیات سے جو دلچسپی ہے۔ اس کا اظہار اس طرح ہوتا ہے کہ آپ آئے دن قدیم تصانیف مع مقدمات و حواشی شائع کرتے رہتے ہیں۔ آپ کی کوئی مستقل تصنیف نہیں لیکن متفرق مقدمے دو جلدوں میں شائع ہوئے ہیں جو نہایت مفید اور قابل قدر ہیں۔ آپ نے ایک

قواعد اُردو بھی لکھی ہے جو اپنی جدّت اور صحت کے لحاظ سے نہایت کارآمد کوشش ہے۔

آپ کو ادب کے ہر شعبہ سے شغف ہے اور آپ کی ہمہ گیر طبیعت کسی ادبی مسئلے پر بند نہیں۔ آپ رسالہ "اُردو" کے مدیر ہیں جو دنیائے ادب میں علمی و ادبی اضافہ کر رہا ہے۔

آپ کی زبان مستند اور انداز بیان صاف اور سادہ پُر زور اور پختہ ہے۔ تحریر میں شگفتگی بہت ہے۔ اور مطلب کو اختصار کے ساتھ واضح کردینے کی خاص صلاحیت ہے۔ روزمرّہ و محاورہ کی چاشنی سے عبارت کو پُر لطف بنا دیتے ہیں۔ ہندی الفاظ کا استعمال نہایت برجستہ ہوتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے جملوں میں فصاحت کا حق ادا ہو جاتا ہے۔ غرض آپ موجودہ عہد میں صاحب طرز انشاپرداز ہیں۔

۴۔ سید غلام محی الدین قادری زورؔ

آپ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد میں اُردو زبان و ادب کے پروفیسر ہیں جس قدر آپ نوعمر و نوجوان ہیں۔ اُسی قدر آپ نے اُردو زبان و ادب کی ٹھوس خدمات انجام دی ہیں۔

ذیل کی تصانیف آپ کی خدمات کو مسلّم کرتی ہیں۔ "روح تنقید" "تنقیدی مقالات" "شہ پارے" "اُردو کے اسالیب بیان"

اور "ہندوستانی لسانیات"

آپ انگریزی تنقید و ادب کو اپنا نصب عین سمجھتے ہیں۔ اور انھیں سرچشموں سے اُردو کی آبیاری کرنا چاہتے تھے۔ اصول تنقید پر اُردو میں کوئی کتاب موجود نہیں تھی۔ چنانچہ آپ نے مغربی ماہرین فن کے نقش قدم پر چل کر "روح تنقید" تصنیف فرمائی۔ اور پھر ان اصول کو عملی طور پر برت کر دکھایا۔ "تنقیدی مقالات" اسی عملی کوشش کا نتیجہ ہے۔

اُردو زبان اور ادب کی خدمات کے لحاظ سے زور صاحب کا جو مرتبہ ہے اس میں خاکسار کو کچھ کلام نہیں، لیکن اُن کی زبان اور طرز بیان میں ابھی پختگی نہیں پائی جاتی۔ حیدرآبادی زبان کا اثر آپ کی اُردو پر کافی ہے اور آپ کے طرز بیان سے انگریزیت بھی ٹپکتی ہے سلاست اور ہمواری سے بھی آپ کی تحریر عاری ہو جاتی ہے۔ لیکن آپ کے ذوق تصنیف و تالیف سے توقع ہے کہ بہت جلد یہ خامیاں رفع ہو جائیں گی۔

تبصرہ

اُردو [illegible] کا آخری دور گلہائے رنگا رنگ کا گلدستہ ہے۔ اس انجمن نے ہمہ گیر طبیعت پائی ہے۔ جہاں افسانہ نگار رونق افروز ہیں، وہیں شوخ طبع بھی موجود ہیں۔ بڑے بڑے محسنین زبان ایک طرف بیٹھے ہیں دوسری طرف ان کے کارناموں پر تنقید کرنے والے بھی مستعد [illegible]۔

تحقیق و تجسس کرنے والوں کی بھی ایک جماعت حاضر ہے۔ غرض مغربی علوم و فنون کا پورا پورا اثر اس دور کے مصنفین نے قبول کر لیا ہے۔

اگرچہ خاکسار نے ڈرامے کا ذکر نہیں کیا۔ لیکن اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ اردو ڈرامے سے محروم ہے۔ آغا حشر، منشی رحمت علی، منشی ابراہیم، محشر وغیرہم نے بہت سے ڈرامے لکھے۔ کچھ خود تصنیف کئے کچھ (انگریزی سے ترجمہ کئے۔ لیکن افسوس کہ ان ڈراموں کو اردو ادب میں کوئی امتیازی حیثیت حاصل نہ ہو سکی۔ اور اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ اب تک جتنے ڈرامے لکھے گئے وہ محض تجارتی اصول پر لکھے گئے۔ ان میں ادبیت پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ بعض ڈرامے ادبی نقطۂ نظر سے بھی لکھے گئے لیکن وہ اسٹیج کے کام کے نہیں تھے۔ اس لئے شہرت و مقبولیت حاصل نہ ہوئی۔ غرض ناچیز کی رائے میں اردو نے ڈرامہ میں کوئی خاص کارنامہ پیدا نہیں کیا اور اسی لئے خاکسار نے تاریخ ادب میں اس کے لئے کوئی گنجائش نہیں نکالی۔ فی زمانہ سینما نے تھیٹر کے زور کو توڑ دیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ڈرامہ نویسی کی طرف سے توجہ ہٹتی جاتی ہے۔

اس دور میں سب سے زیادہ کامیابی مختصر افسانہ کو حاصل ہوئی۔ اور ابتدا ہی سے اس نے کمال حاصل کر لیا۔ لیکن ہمیں محسنین ادب کو فراموش نہیں کر دینا چاہئے۔ جن کی بے دریغ کوششوں سے ادب اردو ترقی کر رہا ہے۔ یہ ان ہی حضرات کی برکت ہے کہ اردو کسی قدر اپنی اصلی حالت پر نظر آتی ہے۔ ورنہ فی زمانہ انگریزی نما اردو کا اس قدر زور ا

ہوتا جاتا ہے کہ مستقبل کی تاریکی بھیانک نظر آتی ہے۔

چونکہ دورِ حاضرہ ہنوز اپنے وجود کے منازل طے کر رہا ہے۔ لہٰذا اس پر عمیق تبصرہ کرنا قبل از وقت ہوگا۔ اس وقت تک جو کچھ اس دور نے کر دکھایا ہے اس کا جائزہ لیتے ہوئے اتنا کہنے میں باک نہیں کہ گذشتہ ادوار سے ابھی یہ دور بہت پیچھے ہے۔ اگرچہ اس دور میں سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالحق، مولانا عبدالماجد دریا آبادی، خواجہ حسن نظامی، مولانا ابوالکلام آزاد جیسی زبردست ہستیاں موجود ہیں۔ لیکن افسوس کہ اب تک اس دور میں کوئی آزاد، حالی، شبلی، سرسید پیدا نہیں ہوا اور نہ مستقبل قریب میں اُمید ہے۔

خاتمہ

ہماری تاریخ ادب اُردو سنہ ۱۴۰۰ء سے شروع ہوتی ہے اور آج سنہ ۱۹۳۶ء ہے۔ اس پانسو چھتیس برس کی مختصر سی عمر میں اُردو ادب نے جو علمی اور ادبی ترقی کی ہے وہ حیرت انگیز ہے۔ واضح ہو کہ ابتدائی دو ڈھائی سو برس ایسے ہیں جن میں رفتارِ ترقی بہت سست رہی ہے اور اس کی خاص وجہ فارسی کا غلبہ تھا لیکن اُردو اپنی سست رفتاری اور کم مائگی کے باوجود بھی فارسی کے مقابلے پر ڈٹی رہی آخر سنہ ۱۸۳۵ء میں فتحیاب ہو کر ملک کی زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لی یعنی دفاتر سرکار میں یہ زبان رائج

ہوگئی بلکہ ۱۸۲۲ء میں اُردو کا پہلا اخبار نکلا۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو اُردو ادب کی کل ترقی ہی سو سوا سو سال کے اندر اندر ہوئی ہے۔

جون ۱۹۲۰ء کے "معارف" میں سید سلیمان صاحب ندوی کا ایک مضمون بعنوان "انڈیا آفس لائبریری میں اُردو کا خزانہ" شائع ہوا تھا۔ اس میں سید صاحب موصوف فرماتے ہیں "مطبوعہ اُردو کتابوں کی اہمیت بھی یہاں (یعنی انڈیا آفس لائبریری لندن میں) میری نگاہ میں کچھ کم نظر نہ آئی اور تھوڑی دیر کے لئے مجھے مغرور ہونا پڑا کہ الحمد للہ ہماری زبان بھی اس قدر ترقی یافتہ ہے کہ تین سو صفحے میں اس کی فہرست تمام ہوئی ہے۔ یہ فہرست ۱۹۰۰ء میں چھپی ہے۔ اس لئے موجودہ بیسویں صدی کی کتابیں اس فہرست میں شامل نہیں ہیں۔ اس فہرست کو دیکھ کر یہ تعجب ہوا کہ اُردو زبان غدر کے پہلے ہی سے ایک علمی زبان بن رہی تھی ......" اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ۱۹۰۰ء سے پہلے ادب اردو کس قدر ترقی کر چکا تھا۔ یعنی علوم وفنون، مذہب، فقہ، تاریخ، ادبیات، کتب تعلیمی، الہیات اور متفرق موضوعات پر اس قدر کتابیں لکھی جا چکی تھیں کہ ان کی فہرست تین سو صفحات میں تمام ہوئی ہے۔ ۱۹۰۰ء کے بعد میدان ادب میں جس سرگرمی کا اظہار کیا گیا ہے اسے دیکھتے ہوئے اندازہ ہوتا ہے کہ اگر جملہ مطبوعہ کتب کی فہرست تیار کی جائے تو غالباً پانچ سو صفحات میں ختم ہوگی۔

موجودہ عہد میں اردو ادب کا یہ حال ہے کہ صرف برٹش انڈیا میں دو سو سے زیادہ رسالے اور اخبار نکلتے ہیں۔ اور ہر سال کم از کم

چار سو کتابیں مختلف مضامین پر شائع ہوتی ہیں۔

دہلی سوسائٹی (۱۸۴۳ء)، فورٹ ولیم کالج، سائنٹیفک سوسائٹی (۱۸۶۴ء) وغیرہ سے قطع نظر کرکے عہد حاضرہ میں متعدد انجمنیں اور ادارے قائم ہیں جو دن رات ادب اُردو کی ترقی میں سرگرم و کوشاں ہیں۔ ان میں سے چند مشہور و معروف انجمنوں اور اداروں کا ذکر یہاں کیا جاتا ہے۔

۱۔ انجمن ترقی اُردو (اورنگ آباد)۔ اس انجمن نے اب تک علم الحیوانات، علم طبقات الارض، علم النفس، علم نباتات، علم معاشرت تاریخ اور ادب میں متعدد بیش بہا کتابیں شائع کی ہیں۔ یہی انجمن "اردو" نامی سہ ماہی رسالہ نکالتی ہے جو ادبی رسائل میں خاص حیثیت رکھتا ہے۔

۲۔ دارالترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی (حیدرآباد دکن) اس ادارہ میں علم معیشت، تاریخ، منطق، اخلاقیات، نفسیات، مابعدالطبیعیات، طبیعیات، اقتصادیات، ریاضیات، علم الحیات، علم کیمیا وغیرہ علوم کی انگریزی کتابوں سے اردو میں تالیف و ترجمہ کا کام ہوتا ہے۔ اسی ادارہ میں وضع اصطلاحات علمیہ کے لئے بھی ایک شعبہ قائم ہے۔

۳۔ شبلی اکیڈیمی یعنی دارالمصنفین (اعظم گڈھ) سے مذہبی اور دیگر علوم و فنون کی کتابیں شائع کی جاتی ہیں۔

۴۔ ہندوستانی اکیڈیمی (الہ آباد) اس میں علمی و ادبی مفید کتابیں اور ملک کے صاحب کمال حضرات کی تقریریں شائع ہوتی ہیں۔ ایک

تماہی رسالہ "ہندستانی" کے نام سے نکلتا ہے جو ایک خالص اور معیاری رسالہ ہے۔

اُردو میں تخلیقی و طبع زاد کارناموں کو چھوڑ کر غیر زبانوں کے سرچشموں سے جو آبیاری ہوئی ہے اُس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ انگریزی، یونانی، سنسکرت، فارسی وغیرہ زبانوں کی مایۂ ناز نظموں کا ترجمہ ہو گیا ہے۔ نثر میں بھی غیر زبان کے مشہور مصنفین کے کارنامے ترجمہ کرلئے گئے ہیں۔ شیکسپیر کے زندۂ جاوید ڈراموں کو اُردو میں ترجمہ کر لیا گیا ہے۔ سنسکرت اور بنگال کے ڈرامے بھی اُردو میں آگئے ہیں۔ فلسفہ میں افلاطون، ارسطو، جانکیہ، بیکن، کارلائل، اسپنسر، جیمس وغیرہ کی شاہکار تصانیف ترجمہ کرلی گئی ہیں۔ علاوہ ازیں ادبیات، جغرافیہ، حیاتیات، سیاسیات، اقتصادیات، [illegible] دیگر علوم و فنون اور مذہب پر بیشمار کتابیں تالیف و ترجمہ کی گئی ہیں۔

اس ترقی کو دیکھ کر ہندوستان کی یونیورسٹیوں نے بھی اُردو کی طرف نظرِ التفات سے دیکھا چنانچہ بعض یونیورسٹیوں میں ایم۔ اے تک اُردو پڑھائی جاتی ہے اور طلبہ کو ریسرچ کے لئے وظائف بھی دئے جاتے ہیں۔ الہ آباد یونیورسٹی نے سب سے اوّل شعبۂ اُردو قائم کیا۔ اس کے بعد آگرہ، لکھنؤ اور علی گڑھ یونیورسٹیوں نے بھی اُردو شعبے قائم کر کے ایم۔ اے تک اُردو جاری کی۔ باقی یونیورسٹیاں بھی رفتہ رفتہ اُردو زبان و ادب کی اہمیت کو احساس کرتی جاتی ہیں۔

۲۔ تحریر

ضمیمہ متعلّق باب ۱۱

عہد حاضرہ کے نظم نگار شعراء

تمہید عہد حاضرہ کی نظموں کے بے پایاں دفتر پر اگر غور سے نظر کی جائے۔ تو اس کو صوری اور معنوی حیثیت سے چھ جلدوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

(۱) تخیلی نظمیں۔ (۲) سادہ نظمیں۔ موضوع خیال اور طرز ادا تینوں سادہ (۳) حسین جذباتی نظمیں (۴) عاشقانہ نظمیں (۵) تحریکی نظمیں۔ اور (۶) آزاد نظمیں۔

یہ تقسیم میرے ذاتی غور و مطالعہ کا نتیجہ ہے۔ میں اس امر کا دعویدار نہیں ہوں کہ اس تقسیم میں ترمیم و اضافے کی گنجائش نہیں۔ میری رائے ہے کہ تخیلی نظم نگاروں کے نمائندے حضرت سیماب اکبر آبادی ہیں اور باقی چار گروہوں کے نمائندے علی الترتیب افسر میرٹھی، حفیظ جالندھری۔ اختر شیرانی، اور احسان دانش ہیں۔ آخری گروہ یعنی آزاد نظم نگاروں کے نمائندے دو شاعر ہیں۔ ایک فیض احمد فیض جو غزلیں بھی لکھتے ہیں اور نیم آزاد نظمیں بھی اور دوسرے مسٹر نظر محمد راشد جو قطعی آزاد ہیں۔

اس ضمیمہ میں ان ہی شعراء کا نہایت مختصر ذکر کیا جائے گا۔

۱۔ سیماب اکبر آبادی

حضرت سیماب کے مندرجہ ذیل مختصر سوانح حیات "نگار" بابت ماہ جنوری و ماہ فروری ۱۹۴۱ء سے اخذ کیے گئے ہیں۔

شیخ عاشق حسین صاحب سیماب اکبر آبادی جمادی الثانی ۱۲۹۹ھ مطابق ۱۸۸۲ء بروز دوشنبہ بمقام اکبر آباد (آگرہ) پیدا ہوئے۔ آپ کے والد محمد حسین اجمیر شریف میں ٹائمس آف انڈیا پریس کی شاخ کے افسر اعلیٰ تھے۔
شاعری مولانا سیماب کا فطری ذوق اور پدری میراث ہے۔

آپ کی عمر ۱۷ سال کی تھی کہ آپ کے والد کا انتقال ہوگیا۔ چنانچہ آپ کو مجبوراً تعلیم کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے سے قبل ہی کالج چھوڑ دینا پڑا۔ ۲۰ سال کی عمر میں آپ کی شادی ہوئی اور بہ سلسلۂ معاش آپ کو کانپور جانا پڑا۔ وہاں لکھنؤ اسکول کے شعرا خصوصاً جلال لکھنوی کا طوطی بول رہا تھا۔ مگر چونکہ مولانا کا رجحان طبع شعرا دہلی کی طرف تھا۔ لہٰذا آپ نے ۱۸۹۸ء میں داغ دہلوی سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ جن کی مشفقانہ نصیحت اور شاعرانہ مشورہ سے آپ نے مشق سخن جاری رکھ کر جلد ہی پختگی کلام کے مدارج طے کر لیے۔

مولانا کو تصوف سے بھی ذوق ہے۔ چنانچہ آپ حضرت حاجی حافظ سید شاہ وارث علی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت ہیں۔

قیام کانپور کے بعد آپ بہ سلسلۂ ملازمت اجمیر شریف تشریف لے گئے اور وہاں ۱۹۰۱ء تک مقیم رہے۔ بعد ازاں اپنے وطن پہنچ کر "رسالہ مرصع"

کی ادارت کی، وہاں سے ٹونڈلہ (ضلع آگرہ) پہنچے۔ جہاں ملازمت کے ساتھ ساتھ آگرہ اخبار کی ادارت کرتے رہے۔

۱۹۲۹ء میں آپ نے سلسلۂ ملازمت کو قطع کر دیا۔ اور ادبی خدمت کے لئے خود کو وقف کر کے اپنے وطن آگرہ میں مستقل اقامت اختیار کی۔ جہاں آپ بفضلہٖ شعر و ادب کی خدمت میں ہمہ تن مصروف ہیں۔

آپ کے مندرجہ ذیل مجموعے شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں۔

"کار امروز" "کلیم عجم" "نیستاں" ان کے علاوہ "الہام منظوم" کے نام سے مثنوی مولانا جلال الدین رومی کا اُردو ترجمہ بھی آپ نے شائع کیا ہے۔

حضرت سیماب کا شمار اُردو شاعری کے مشہور اساتذہ میں ہوتا ہے۔ آپ نہایت پُرگو اور مشاق شاعر ہیں۔ اگرچہ آپ نے شاعری کا آغاز غزل ہی سے کیا۔ مگر آپ کا کلام تقلید اور فرسودگی کے عام عیب سے ہمیشہ پاک رہا۔ آپ کی غزلیات میں جدت خیال اور طرز ادا میں شاعرانہ متانت ہوتی ہے زور اور اثر سے معمولی مضمون باتوں میں لطف پیدا کر دیتے ہیں۔ جدید رنگ کی نظموں میں آپ دورِ حاضرہ کے شعراء میں معماً استادانہ حیثیت کے مالک ہیں۔ آپ نے عصرِ جدید کے تمام تحریکی مسائل پر اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے۔ آپ کی نظموں کے متعلق صرف اس قدر عرض کر دینا کافی ہے کہ ان میں پختگی اور متانت، صفائی اور سادگی بدرجہ احسن موجود ہے۔ لیکن اثر کی نمایاں کمی محسوس ہوتی ہے۔ اس لئے کہ آپ بجائے پُرسوز خدمات کے پاکیزہ تخیل سے زیادہ کام لیتے ہیں۔

بطور نمونہ ایک نظم ملاحظہ ہو۔

آزادی

وہ اک خوش تبسم صد بہار و صد چمن پرور
نشاطِ دو جہاں در دل، حیات انجمن در بر

سیاہ و مست بلیے بال پیچ و خم سے بیگانہ
نشیلی انکھڑیاں لیکن مذاقِ رم سے بیگانہ

نگاہیں آسماں کی رفعتوں پر جھومنے والی
جبینِ صاف معراجِ افق کو چومنے والی

خلش گُل کی جگر میں اور دل میں درد لالے کا
ادھر اک ہاتھ میں مسجد ادھر گنبد شوالے کا

زباں پر نغمۂ ناقوس سے نوید کی موجیں
لبِ خود رنگ پر تحلیل ہوتی تکبیر کی موجیں

جمالِ کافری اور نور کا اک جلوۂ رعنا
جو اس کی اک نظر زمزم تو اس کی اک نظر گنگا

غریبوں اور مزدوروں سے منت لینے والی
یتیموں اور بیواؤں کے عقدے کو سینے والی

مساوات و رواداری کے جذبے پاک سینوں میں
وفاداری و دلداری کے نقشے کھنچتے ہیں

فضا کی وسعتوں میں اڑنے والی اک ردائے پر
ادائیں تیرنے والی ہواؤں کے سمندر پر

تعصب اور نفرت کے لہو سے دست و پا رنگیں
وفا کے رنگ سے ہر عشوہ رنگیں ہر ادا رنگیں

تنفس میں نجات اس کے ترنم میں حیات اس کے
تکلم گلستاں اس کا جلو میں کائنات اس کے

سکوں برسا ہوا اس کے تبسم سے محبت کا
شگفتہ تیوروں میں موجزن دریا صداقت کا

شعاعِ حسن لرزاں اس کے فردوسی اشاروں میں
بہار افروز پھولوں میں صباحت ریگزاروں میں

زمین و آسماں اس کے حریمِ ناز کے آنگن
مہ و خورشید ہیں اس کی بساطِ انجمن روشن

چمن اس کے بیاباں اس کے کوہ و آبشار اس کے
سمندر اس کے میداں اس کے امصار و دیار اس کے

وہ فطرت سے رہِ راست رشتہ جوڑنے والی
غلامی اس کے پائے ناز پر دم توڑنے والی

وہ شہزادی ہے میں اس کی محبت کا بھکاری ہوں   وہ آزادی کی دیوی اور میں اس کا پجاری ہوں

۲۔ حامد اللہ افسر میرٹھی

حامد اللہ نام افسر تخلص۔ میرٹھ وطن مالوف۔ معزز اور ممتاز مفتی خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ سنہ پیدائش ۱۸۹۵ء ہے۔ عربی و فارسی کی تعلیم مدرسہ عالیہ عربیہ میں حاصل کی اور انگریزی کی تکمیل میرٹھ کالج اور مسلم یونیورسٹی علی گڈھ میں ہوئی۔ آپ کو فارسی زبان سے بچپن ہی سے خاص مناسبت ہے۔ اور اب تک اسی زبان کی کتابیں اکثر مطالعہ میں رہتی ہیں۔

حضرت افسر کو لڑکپن ہی سے شعر و شاعری کا ذوق تھا۔ چنانچہ زمانۂ طالب علمی کی ایک نظم بعنوان "گرمی کی چھٹیاں" ملاحظہ ہو۔

مشکل سے پھر اسکول نہ جانے کے دن آئے   بے فکری سے پھر وقت گنوانے کے دن آئے

پھر رات کو چھپ چھپ کے ڈرانے کے دن آئے   سہمے ہوئے لوگوں کو ستانے کے دن آئے

پھر بیٹھ کے طبلہ سا بجانے کے دن آئے   پھر لیٹ کے تنہائی میں گانے کے دن آئے

کردی تھی کتابوں نے ہماری تو زباں بند   گھر بھر میں اب اک شور مچانے کے دن آئے

اب وقت کا رونا نہیں اب وقت بہت ہے   ہر کام میں پھر دیر لگانے کے دن آئے

گھر پر کبھی تھے گھیرے ہوئے اسکول کے دھندے   آزادی سے اب موج اڑانے کے دن آئے

تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد ابتداءً آپ کچھ مدت تک اخبار نویسی کرتے رہے۔ آخر گورنمنٹ کالج لکھنؤ میں لکچرار مقرر ہو گئے۔ جہاں آپ اپنے فطری ذوق و مناسبت کے ساتھ درس و تدریس اور ادبی خدمات میں مصروف ہیں۔

آپ کی تصانیف میں سے چند یہ ہیں۔

"پیام روح" نظموں اور غزلوں کا مجموعہ جوئے رواں، نظموں اور غزلوں کا دوسرا مجموعہ ڈالی کا جوگ اور پرچھائیاں" یہ دونوں مختصر افسانوں کے مجموعے ہیں۔ نورس، ادبی اور تنقیدی مقالات اور نقد الادب، فن تنقید پر ایک مبسوط کتاب ہے۔ ان کے علاوہ آپ ایک طویل نظم لکھ رہے ہیں۔ آپ نے اس نظم کا نام "آدم نامہ" رکھا ہے۔ اس نظم کا موضوع یہ ہے کہ حضرت آدمؑ کے وقت سے اس وقت تک انسان کی اصلاح و درستی کے لئے کیا کیا کوششیں ہوئیں اور ان کوششوں سے اس نے کیا کیا فائدہ اٹھایا۔ اس نظم کے ایک ہزار سے زیادہ اشعار لکھے جا چکے ہیں۔

سادگی، لطیف موسیقیت، نرم اور مترنم طرز ادا، جذبات نگاری اور مناظر قدرت کی عکاسی آپ کے کلام کی خصوصیات ہیں اور ان ہی خصوصیات کی وجہ سے آپ کو ہمعصر شعراء میں خاص امتیاز حاصل ہے۔ آپ کا دل وطن کی محبت سے لبریز ہے۔ آپ کے وطنی نغمے اپنی موسیقیت اور والہانہ شیفتگی کی وجہ سے اپنے اندر ایک عجیب کیفیت رکھتے ہیں۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو۔

جن کو ہر حالت میں خوش اور شادماں پاتا ہوں میں
اُن کے گلشن میں بہارِ بے خزاں پاتا ہوں میں

اللہ اللہ موجزن ہے کس قدر بحرِ حیات
دل میں ہر ذرہ کے رقصاں اک جہاں پاتا ہوں میں

کچھ تو بتلا کیا مآلِ علم و حکمت ہے یہی تو
رنگ آلودہ تری دانائیاں پاتا ہوں میں

کیسی حیرت ہے کہ خود اُن کو ہے مزدوری سے عار
جن کو مزدوروں کے حق میں تر زباں پاتا ہوں میں
بھیجتے ہیں لعنتیں جو اہلِ زر پر خود انھیں
اہلِ زر کے در پہ خم مثلِ کماں پاتا ہوں میں
وعظ کہتے ہیں محبت کے مؤدب کے جو روز
گھر میں خود اپنے انھیں چنگیز خاں پاتا ہوں میں
دیکھتا ہوں کہ چھپا سے معصیت میں گھومتے
بر سرِ منبر جنھیں رطب اللساں پاتا ہوں میں
صبح کی منزل کا تارہ ہے پتہ کیسا پوچھنا
ظلمتِ شب کا رواں در کارواں پاتا ہوں میں
چاند کے اس پار سورج سے ادھر تاروں سے دور
رقص کرتے روز و شب لاکھوں جہاں پاتا ہوں میں

یہ دل نواز نغمے جنگل کی خامشی میں
لرزہ سا آرہا ہے تاروں کی روشنی میں
للہ یہ بتادے اے جذبۂ محبت
کیا حُسن ہے خدا میں کیا عیب آدمی میں

بزم میں تیرے کوئی بےخود کوئی مدہوش ہے
اُف نشیلی آنکھ والے کچھ تجھے بھی ہوش ہے
سامنے بُت ہیں تو رسوائی کا کس کو ہوش ہے
یا الٰہی تو گنہگاروں کا پردہ پوش ہے
بزم میں ان مدبھری آنکھوں کو گردش دے مگر
اس کا اندازہ تو کرلے کس کو کتنا ہوش ہے

دشوار گذار گھاٹی بن کر نہ رہ جائے۔ اگر آپ نے اس گھاٹی کو بخیر و عافیت
عبور کر لیا تو گویا آپ کی شاعری اللہ کے گھر سے پھری۔

آپ کی نظموں کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں ایک "نغمہ زار" اور دوسرا
"سوز و ساز" اس کے علاوہ آپ ایک عظیم الشان کام بھی کر رہے ہیں یعنی۔
"شاہنامہ فردوسی کے مقابلے میں" شاہنامہ اسلام" تصنیف فرما رہے ہیں۔
اس کی تین جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔

اپنی شاعرانہ جد و جہد کے متعلق آپ خود رقمطراز ہیں کہ "اردو نظم میں
نئی نئی اختراعیں کی ہیں۔ گیت لکھے ہیں۔ مناظر قدرت کی مصوری کی ہے۔
بحور و اوزان میں تصرفات کئے ہیں۔ بچوں کے لئے شاعری کی ہے"۔

آپ کی شاعری کا جوہر خصوصی رنگینی اور ترنم ہے۔ آپ کے کلام میں جذبات
کی فراوانی ہے لیکن ان میں اقبال کی سی گہرائی نہیں۔ وہ حسین ہیں۔ حسرت آگیں
بھی ہیں یا غم انگیز بھی لیکن ان کا اثر دیرپا نہیں ہوتا۔ "شاہنامہ اسلام" آپ کی
معرکۃ الآرا تصنیف ہے۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے۔ یہ گویا ایک اسلامی تاریخ ہے
لیکن نہایت مختصر "شاہنامہ فردوسی" کی طرح یہ رزمیہ نظم نہیں ہے۔ بلکہ اس کا
شمار بیانیہ شاعری کے ذیل میں ہوتا ہے۔ "شاہنامہ اسلام" میں بلند اور پست
قسم کی شاعری میں توازن قائم نہیں رہ سکا ہے۔ کہیں کہیں اصلی شاعری کے نمونے
ملتے ہیں۔ لیکن عام طور پر شاعری کی سطح کچھ بلند نہیں ہو سکی ہے۔ بحر ہزج مثمن سالم
جو اس مثنوی کے لئے انتخاب کی گئی ہے۔ گو بہت رواں اور مترنم ہے لیکن مسلسل
بیانیہ شاعری کے لئے وہ اپنی طوالت کی وجہ سے زیادہ موزوں نہیں معلوم ہوتی۔

آپ سے پہلے کسی نے اس بحر میں مثنوی نہیں لکھی۔ بحر کا پیٹ بھرنے کے لئے جا بجا حشو و زوائد سے کام لینا پڑتا ہے۔ جس کی وجہ سے اعجازِ بیان کی راہ میں رکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے۔ حفیظ بڑے ہوشیار مرصّع کار ہیں۔ انھوں نے ان مشکلات کو بڑی حد تک رفع کیا ہے۔ تاہم حشو و زوائد سے ہر جگہ دامن نہیں بچا سکتے ہیں۔ بطور نمونہ "شاہنامہ اسلام" کا کچھ حصہ پیش کیا جاتا ہے۔

معرکۂ بدر

فضائے بدر کو اک آپ بیتی یاد ہے اب تک
یہ وادی نعرۂ توحید سے آباد ہے اب تک

مہ و انجم اِس مٹی کے ذرّے مسکراتے ہیں
زبانِ حال سے ماضی کے افسانے سناتے ہیں

پلٹ کر اس جگہ شیطان آیا ہی نہیں اب تک
فرشتوں کی زیارت گاہ ہے یہ سرزمیں اب تک

یہاں ہر صبح روشن پرتوِ خورشیدِ ایماں سے
یہاں ہر شام رنگیں غازۂ خونِ شہیداں سے

جو دیکھا اس کی آنکھوں نے وہ کب افلاک نے دیکھا
حق و باطل کا پہلا معرکہ اس خاک نے دیکھا

مرے پیشِ نظر کوئی کہانی ہے نہ قصہ ہے
یہ قرآنی بیاں تاریخ کا زرّیں حصہ ہے

خدا کے بالمقابل جمع کر کے اک خدائی کو
اُٹھے تھے پہلوانانِ عرب زور آزمائی کو

قریشی فوج کو لے کر چلا شیطان مکّے سے
مدینے کی تباہی کو اُٹھا طوفان مکّے سے

یہ مشرک جا رہے تھے حق پرستی کے مٹانے کو
یہ آندھی چل رہی تھی شمعِ ہستی کے بجھانے کو

یہ شمشیریں یہ خنجر یہ تبر یہ تیر یہ بھالے
یہ سب مردانِ جنگی اونچی اونچی کلغیوں والے

یہ آہن پوش اسوار اور زرہ پہنے ہوئے گھوڑے
یہ ریشم کی کمندیں لوہے میں گوندھے ہوئے کوڑے

یہ اونٹوں کی قطاریں یہ سدِ یہ خیمہ خرگاہیں ہزاروں انسان جن کے خوف سے مسدود تھیں راہیں
یہ مکہ سے چلے تھے اور مدینہ پر چڑھائی تھی ادھر نام خدا تھا اُس طرف ساری خدائی تھی

لشکرِ اسلام کا ورود

زمینِ بدر تک جب آ گیا سنبل سیہ کاری
مدینے سے اُٹھا نورِ خدا بھر ضیا باری
مبارک جمعہ کا دن سترہویں تھی ماہِ رمضاں کی
شہادت گاہ میں فوج آن پہنچی اہلِ ایماں کی

عجب انداز سے آئے خدا کے چاہنے والے
زبانیں خشک پوشاکیں دریدہ پاؤں میں چھالے
یہ اس قربان گہہ میں آج پیدل چل کے آئے تھے
نہا کر اوس میں اور دھوپ میں جل جل کے آئے تھے

نہ ان کے پاس تلواریں نہ اُن کے پاس ڈھالیں تھیں
نہ غلہ اُن کے اونٹوں پر نہ پانی کی پکھالیں تھیں
علم خورشید کا اُن کے سروں پر سایہ افگن تھا
کہ یہ ایک ایک چہرہ نورِ عرفاں کا مخزن تھا

مئے وحدت سے قلبِ مطمئن سرشار تھا اُن کا
کہ سردارِ دو عالم قافلہ سالار تھا اُن کا

ان ہی کا فرض تصویرِ وفا میں رنگ بھرنا تھا
رگِ ہستی کو اپنے خون سے سیراب کرنا تھا

نہیں تھا تین سو تیرہ سے آگے تک شمار ان کا
سنا یہ ہے کہ اُن کے ساتھ تھا پروردگار ان کا

۴۔ اختر شیرانی محمد داؤد خاں نام اور اختر تخلص ہے ۱۹۰۴ء میں بمقام ٹونک پیدا ہوئے۔ آپ کے والد پروفیسر حافظ محمود خاں شیرانی اسلامیہ کالج اور اورنٹیل کالج لاہور کے پروفیسر اردو کی حیثیت سے خصوصاً پنجاب میں اردو کے مصنف کی حیثیت سے اچھی خاصی شہرت کے مالک ہیں۔ اختر پنجاب کے ان نوجوان شعراء میں ہیں جن کی شاعری کی بنیاد افسانہ ہائے عشق و محبت پر قائم ہے۔ آپ کی نظموں میں تخیل کی رنگینی اور نزاکت اور اس کے ساتھ لطیف موسیقیت کی آمیزش نہایت خوشگوار ہوتی ہے حسن پرستی اور نفاست طبع آپ کے کلام کی روح رواں ہے۔ نمونہ کلام یہ ہے:۔

اے عشق کہیں لے چل

اے عشق کہیں لے چل اس پاپ کی بستی سے
نفرت گہِ عالم سے لعنت گہِ ہستی سے
ان نفس پرستوں سے اس نفس پرستی سے
دور اور کہیں لے چل
اے عشق کہیں لے چل

ہم پریم پجاری ہیں تو پریم کنہیا ہے
تو پریم کنہیا ہے یہ پریم کی نیتا ہے
یہ پریم کی نیا ہے تو اس کا کھویا ہے
کچھ فکر نہیں لے چل
اے عشق کہیں لے چل

بے رحم زمانے کو اب چھوڑ رہے ہیں ہم
بے درد عزیزوں سے منہ موڑ رہے ہیں ہم
جس آس پہ جیتے تھے اب توڑ رہے ہیں ہم
اب تاب نہیں لے چل
اے عشق کہیں لے چل

یہ جبر کدۂ آزاد افکار کا دشمن ہے
احرار کا مدفن ہے ابرار کا دشمن ہے
اشرار کا مسکن ہے اخیار کا دشمن ہے
چل یاں سے کہیں لے چل
اے عشق کہیں لے چل

آنکھوں تلے پھرتی ہے اک خواب نما دنیا
تاروں کی طرح روشن مہتاب نما دنیا
للہ وہیں لے چل
اے عشق کہیں لے چل

کہسار کے اس پار ایک اس طرح کی بستی ہو
جو فتنوں سے انسان کی صورت کو ترستی ہو
اور جس کے مناظر پہ تنہائی برستی ہو
یوں ہو تو وہیں لے چل
اے عشق کہیں لے چل
ان چاند ستاروں کے بکھرے ہوئے شہروں میں
ان نور کی کرنوں کی ٹھہری ہوئی لہروں میں
ٹھہری ہوئی لہروں میں سوئی ہوئی لہروں میں
اے خضر حسیں لے چل
اے عشق کہیں لے چل
ایسی ہی بہشت آئیں وادی میں پہنچ جائیں
جس میں کبھی دنیا کے غم دل کو نہ تڑپائیں
اور جس کی بہاروں میں جینے کے مزے پائیں
لے چل تو وہیں لے چل
اے عشق کہیں لے چل

۵۔ احسان دانش احسان الحق نام۔ احسان تخلص۔ قاضی دانش علی کے فرزند رشید۔ کاندھلہ ضلع مظفرنگر کے رہنے والے ہیں۔ سنہ پیدائش ۱۹۱۱ء ہے۔ احسان صاحب

کو اکثر مالی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ کبھی مزدوری کی ہے اور کبھی معماری اور باغبانی، چوکیداری بھی کی ہے اور دربانی بھی اور یہی وجہ ہے کہ آپ کو اس قسم کے طبقے سے پوری پوری واقفیت ہے۔ آپ کی تعلیم ناکمل رہی حافظ محمد مصطفےٰ سے چند فارسی و عربی کی کتابیں پڑھیں اور قاضی محمد ذکی کی صحبت میں شاعری کا شوق ہوا۔ ذہانت اور جودت طبع سے بہت جلد نظم نگاری میں ایک ملکہ خاص حاصل کر لیا۔ آج کل لاہور میں مستقل قیام ہے اور "تعمیر ادب" لاہور کے ناظم ہیں۔

آپ کے مندرجہ ذیل مجموعے شائع ہو چکے ہیں:۔ حدیث ادب، دردِ زندگی، تفسیر فطرت، چراغاں، نوائے کارگر، آتش خاموش وغیرہ۔

احسان صاحب مزدوروں کے شاعر ہیں اور سرمایہ داری اور اس کی تمام قسموں کے سخت ترین دشمن۔ آپ کی ایک طرف یہ محبت اور دوسری طرف نفرت، محض رسمی اور شاعرانہ نہیں ہے بلکہ آپ کو محنت اور [illegible] کی الجھنوں کا ذاتی تجربہ ہے اور یہی وجہ ہے کہ آپ کے کلام میں خلوص [illegible] موجود ہے۔ بعض اوقات آپ کے کلام میں سخت ترین تلخی پیدا [illegible] ہے جو اگرچہ آپ کے دل کی آواز ہوتی ہے [illegible] شاعرانہ [illegible] متحمل نہیں ہو سکتی۔ آپ کی قوت مشاہدہ بھی بہت تیز ہے [illegible] نظموں میں واقعہ نگاری اور محاکات کی اچھی اچھی مثالیں [illegible] ہیں۔ [illegible] صاف ہے اور [illegible] تراکیب کا بھی معتدل [illegible] نمونۂ کلام یہ ہے:۔

مزدور عورت

ڈھل گیا دن ہلکا ہلکا ابر ہے چھایا ہوا
منظرِ عالم نظر آتا ہے مُرجھایا ہوا

دھو دیا ہے گرچہ بوندوں نے فضاؤں کا غبار
پھر بھی ہے اس ملگجے بادل سے عالم سوگوار

اُٹھ نہیں سکتی نقاہت سے کسی کوچے میں گرد
آدمی تو آدمی سورج کا چہرہ بھی ہے زرد

ہر طرف ہے اک سکوتِ آمیزِ غم چھایا ہوا
مل رہی ہے روح کو اپنے گناہوں کی سزا

شہروں میں موسم کی ٹھنڈا ہو گیا خونِ طرب
کھردرے ہیں کائی کی پپڑی سے برناؤں کے لب

جم رہی ہے پختہ دیواروں کی ریخوں میں جو گھاس
اور بھی ہے اس کے مرجھانے سے آبادی اُداس

یہ سماں اور اس میں اک دوشیزۂ گھبرائی ہوئی
فکر کی کھوئی ہوئی افلاس کی کھائی ہوئی

غم کے گہوارے میں دل کی حسرتیں پالے ہوئے
لے رہی ہے دم زمیں پر ٹوکری ڈالے ہوئے

دہر کی بزم سے رعنائیوں کا چل چلاؤ
لوحِ پیشانی سے ظاہر خاندانی رکھ رکھاؤ

محنتِ پیہم سے گرد آلود روئے تابدار
مفلسی کی راکھ میں پنہاں جوانی کے شرار

مضمحل اعضا سے کم یابیِ غذا کی آشکار
تیل سے چکٹے ہوئے سر پر دوپٹہ تار تار

پونچھ لیتی ہے جو انگلی سے عرق رخسار کا
جاگ اُٹھتا ہے شبابِ سرد اس نادار کا

شیدایانِ تمدن کیوں نہیں دیتے جواب
کس لئے پامال ہے اس رشکِ مریم کا شباب

کیوں اسے فطرت نے اس ماحول میں رسوا کیا
عالمِ ارواح میں تھی کون سی ان کی خطا

ایک وہ عورت ہے شوہر جس کا ہے سرمایہ دار
ہاتھ میں کنگن لبوں پر سرخیاں گردن میں ہار

ایک وہ ہے جو بہت مسرور ہے دل شاد ہے　　ایک یہ ہے جو سراپا درد ہے فریاد ہے
ایک وہ عورت جسے سیجوں پہ سونا ہے نصیب　　ایک یہ عورت جسے راتوں کو رونا ہے نصیب

ہیں مگر اس راز سے تناقض فطرت آشنا
دل دیا ہے جن کو خالق نے مشیت آشنا

جن کی آنکھوں سے ٹپکتا ہے گدازِ احساس کا　　جانتے ہیں فلسفہ جو دولت و افلاس کا
شورشِ طوفاں میں جو رہتے ہیں غم سے دوبدو　　خشک کر دیتے ہیں جو اوہام باطل کا لہو

شعبدہ بازِ تفکر کو اُٹھا سکتا نہیں
جہل ادراک و نظر کی تاب لا سکتا نہیں

۲۔ پروفیسر فیض احمد فیض اور نذر محمد راشد

پروفیسر فیض احمد فیض اور مسٹر ن م راشد ان نوجوان شعراء میں سے ہیں جو اپنے آپ کو "باغی" کہہ کر بہت خوش ہوتے ہیں اور یہ واقعہ بھی ہے کہ یہ دونوں حضرات ہمارے ملک شعر و سخن کے نہایت سرکش باغی شاعر ہیں یعنی آزاد نظمیں لکھتے ہیں۔ قبل اس کے کہ فیض اور راشد کے کلام کا نمونہ پیش کیا جائے یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ "آزاد نظم" ہے کیا چیز۔

"آزاد نظم" اس نظم کو (اگر اُسے نظم کہا جائے) کہتے ہیں جس میں نہ ردیف ہو نہ قافیہ، اور اگر کہیں کہیں ہو بھی تو کسی مسلمہ تعداد کے ماتحت نہیں۔ کوئی مسلّم وزن بھی نہ ہو۔ مصرعے کسی بحر میں موزوں کئے جائیں مگر تعداد ارکان کا خیال نہ رکھا جائے۔ کسی مصرعے میں پورے ارکان ہوں، کسی میں زیادہ، کسی میں کم۔

یہاں تک کہ محض ایک رکن کا بھی مصرع ہو سکتا ہے۔ علاوہ ازیں زبان کی بھی پرواہ کی جائے۔ جس لفظ کو جو جی میں آئے معنی پہنا دیے جائیں۔ فارسی تراکیب وغیرہ کی کسی قدیم یا موجودہ استادِ فن سے سند حاصل نہ کی جائے۔

بے قافیہ نظمیں عبدالحلیم شرر اور اسمٰعیل میرٹھی نے بھی لکھی ہیں۔ مگر "آزاد نظم" ان کی نظموں سے قطعی مختلف ہے۔ اس لیے کہ "آزاد نظم" جملہ قیود سے آزاد ہوتی ہے۔

فیض صاحب اپنی شاعری کے متعلق اپنی تصنیف "نقشِ فریادی" کے دیباچہ میں فرماتے ہیں۔ ان نظموں نے روایتی اسالیب سے غیر ضروری انحراف مناسب نہیں سمجھا۔ بحور میں کہیں کہیں بہت ہلکا سا تصرف ہے اور قوافی میں دو ایک جگہ صوتی مناسبت کو لفظی صحت پر ترجیح دی گئی ہے اور بس" لیکن راشد کی "آزاد نظموں" میں یہ انحراف داخلی اور خارجی فنی اور فکری لحاظ سے مکمل ہے"!

سطورِ بالا سے واضح ہوتا ہے کہ فیض کی شاعری راشد کی شاعری سے کسی قدر کم آزاد ہے۔ یہاں اشارۃً یہ بھی عرض کر دینا مناسب ہوگا کہ فیض تخیل، اور زبان کے معاملے میں کسی قدر احتیاط برتتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی نظمیں نسبتاً قریب الفہم ہوتی ہیں۔ بطور نمونہ دو نظمیں ملاحظہ ہوں۔

مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ

مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ

میں نے سمجھا تھا کہ تو ہے تو درخشاں ہے حیات

تیرا غم ہے تو غمِ دہر کا جھگڑا کیا ہے؟

تیری صورت سے ہے عالم میں بہاروں کو ثبات
تیری آنکھوں کے سوا دُنیا میں رکھا کیا ہے؟
تو جو مل جائے تو تقدیر نگوں ہو جائے
یوں نہ تھا میں نے فقط چاہا تھا یوں ہو جائے
اور بھی دُکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا
اَن گنت صدیوں کے تاریک بہیمانہ طلسم
ریشم و اطلس و کمخواب میں بنوائے ہوئے
جا بجا بکتے ہوئے کوچہ و بازار میں جسم
خاک میں لتھڑے ہوئے خون میں نہلائے ہوئے
جسم نکلے ہوئے امراض کے تنوروں سے
پیپ بہتی ہوئی گلتے ہوئے ناسوروں سے
لوٹ جاتی ہے اُدھر کو بھی نظر کیا کیجیے؟
اب بھی دل کش ہے ترا حُسن مگر کیا کیجیے
اور بھی دُکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا
مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ

۲۔ تنہائی

پھر کوئی آیا دلِ زار! نہیں۔ کوئی نہیں!
راہرو ہوگا، کہیں اور چلا جائے گا
ڈھل چکی رات، بکھرنے لگا تاروں کا غبار
لڑکھڑانے لگے ایوانوں میں خوابیدہ چراغ
سو گئی راستہ تک تک کے ہر اک راہ گزار
اجنبی خاک نے دھندلا دیے قدموں کے سراغ
گُل کرو شمعیں۔ بڑھا دو مے و مینا و ایاغ
اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفّل کر لو
اب یہاں کوئی نہیں۔ کوئی نہیں آئے گا

ن م۔ راشد کی تصنیف "ماورا" میں تین طرح کی نظمیں ہیں۔
(۱) نیم آزاد۔ (۲) سانیٹ (۳) آزاد۔

"سانیٹ" ایک انگریزی صنفِ نظم کا نام ہے۔ اس میں قوافی کا ایک خاص التزام ہوتا ہے۔ یعنی معانی کی ترتیب یہ ہوتی ہے۔ اب اج دوج دوکا زذز۔ اور مصرعوں کی تعداد ہمیشہ چودہ رہتی ہے۔
راشد صاحب نے اردو فارسی قوافی کے التزام کا جوا تو اتار پھینکا لیکن انگریزی التزام کا جوا اپنے کندھوں پر رکھ لیا۔ اگرچہ اجتہاد

ہے تو بہت اچھی قسم کا اجتہاد نہیں۔ نمونہ ملاحظہ ہو:۔

انسان (سانیٹ)

الٰہی تیری دنیا جس میں ہم انسان رہتے ہیں
غریبوں جاہلوں مردوں کی بیماری کی دنیا ہے
یہ دنیا بیکسوں کی اور لاچاروں کی دنیا ہے
ہم اپنی بے بسی پر رات دن حیران رہتے ہیں

ہماری زندگی اک داستاں ہے ناتوانی کی
بنالی اے خدا اپنے لیے تقدیر بھی تو نے
اور انسانوں سے لے لی جرأت تدبیر بھی تو نے
دوا اچھی ملی ہے ہم کو اپنی بے زبانی کی

اسی غور و تجسس میں کئی راتیں گذاری ہیں
میں اکثر چیخ اٹھتا ہوں بنی آدم کی ذلت پر
جنوں سا ہو گیا ہے مجھ کو احساسِ بضاعت پر
ہماری بھی نہیں افسوس جو چیزیں ہماری ہیں"

کسی سے دور یہ اندوہِ پنہاں ہو نہیں سکتا
خدا سے بھی علاجِ دردِ انساں ہو نہیں سکتا

• ن۔م۔ راشد اپنی تیسری قسم کی یعنی مطلق آزاد نظموں میں ہر قید و بند سے آزاد ہو جاتے ہیں حتیٰ کہ آپ کی یہ نظمیں اکثر پڑھنے والوں کے لئے "مبہم" ہیں۔ بطور نمونہ ایک نظم ملاحظہ کیجئے۔

خودکشی

کر چکا ہوں آج عزم آخری ـــــــ
شام سے پہلے ہی کر دیتا تھا میں۔
چاٹ کر دیوار کو نوکِ زباں سے ناتواں۔
صبح ہونے تک وہ ہو جاتی تھی دوبارہ بلند
رات کو جب گھر کا رُخ کرتا تھا میں
تیرگی کو دیکھتا تھا سرنگوں۔
منہ بسورے رہگذاروں سے لپٹتے سوگوار!
گھر پہنچتا تھا میں انسانوں سے اکتایا ہوا
میرا عزم آخری یہ ہے کہ میں
کود جاؤں ساتویں منزل سے آج!
آج میں نے پا لیا ہے زندگی کو بے نقاب
آتا جاتا ہوں بڑی مدّت سے میں
ایک عشوہ ساز و ہرزہ کار محبوبہ[1] کے پاس

---

[1] مراد زندگی (نوٹ مصنف)

اس کے تختِ خواب کے نیچے مگر
آج میں نے دیکھ پایا ہے لہو
تازہ و درخشاں لہو!
بوئے مے میں بوئے خوں اُلجھی ہوئی
وہ ابھی تک خواب گہ میں لوٹ کر آئی نہیں
اور میں کر بھی چکا ہوں اپنا عزمِ آخری!
جی میں آتی ہے لگا دوں ایک بے باکانہ جست

اس دریچے میں سے جو
جھانکتا ہے ساتویں منزل سے کوئے بام کو!
شام سے پہلے ہی کر دیتا تھا میں
چاٹ کر دیوار کو نوکِ زباں سے ناتواں
صبح ہونے تک یہ ہو جاتی تھی دوبارہ بلند
آج تو آخر ہم آغوشِ زمیں ہو جائے گی۔